ہماری بات

زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو کا بھی نہیں ہے۔ اسے کسی ایک مذہب کے ماننے والوں نے نہیں بلکہ اس ملک کے تہذیبی وثقافتی اختلاط نے پیدا کیا ہے۔ یہ صرف گنگا اور جمنا کے تہذیبی کناروں کی گود میں نہیں بلکہ کرشنا، کاویری، گوداوری اور جہلم سے لے کر بحر عرب، خلیج بنگال اور بحر ہند کے ساحلوں تک اور ہمالیہ سے لے کر وندھیاچل تک پھیلی ہوئی وادیوں، آبادیوں اور میدانوں کی آغوش میں پلی بڑھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو آج بھی ہمارے یہاں رابطے کی سب سے بڑی زبان ہے۔ اس کے پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد بے شک کم ہے، لیکن شاید ہی ملک کی آبادی کا کوئی ایسا حصہ ہوگا جو اردو میں کہی ہوئی بات کو نہ سمجھ سکے۔ اسے آپ ہندی یا ہندوستانی جو بھی نام چاہیں دے لیں، لیکن جس بولی کو آج پورا ہندوستان سمجھتا ہے اس کا سرچشمہ اردو ہی ہے۔ اردو نے ہمیں ایک تہذیبی رشتے میں جوڑا ہے جو مذہبی رشتے سے کہیں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ مذہبی رشتے عقائد اور مسالک کے اختلاف سے بنتے بگڑتے رہتے ہیں جب کہ تہذیبی رشتوں میں فکر وعمل کی نیرنگی سے مزید نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ہماری قومی تہذیب وثقافت میں فکر وفن، ادب وفلسفہ، فنون لطیفہ، آداب واطوار، رہن سہن نیز اخبار، فلم، ریڈیو، ٹی وی جیسے ذرائع ابلاغ کی سطح پر جو بھی پیش رفت ہوئی ہے، جتنا بھی نکھار آیا ہے اس میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طور پر اردو کا رول رہا ہے۔

لیکن اردو زبان کا کوئی مذہب نہ ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کے ہندوستان میں اردو لکھنے پڑھنے والے 90 فیصد سے زائد لوگ مسلمان ہیں، اور یہ بھی سچ ہے کہ مسلمان ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود بعض علاقوں میں سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ کئی سطحوں پر اردو زبان کی ترقی میں حائل رکاوٹیں، مسلمانوں کی مجموعی پس ماندگی سے بھی جڑی ہوئی ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب ملک میں کاریگروں، دست کاروں اور ہنرمندوں کی زبردست مانگ کو پیش نظر رکھ کر حکومت ایک قومی سطح کا پیشہ ورانہ لیاقتی خاکہ اور نقشہ تیار کرنے کی بات سوچ رہی ہے تو مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے، جو کہ اقلیتی ترقی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، یہ بات ذہن میں رکھی ہے کہ کاریگروں، ہنرمندوں اور میکینکوں میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، چنانچہ نیشنل ووکیشنل کوالیفکیشن فریم ورک کی تشکیل کا زیادہ فائدہ بھی ان ہی کو پہنچے گا۔ اسی کے پیش نظر دیگر اقلیتی گروپوں کے ساتھ ساتھ جناب کپل سبل کی وزارت نے مسلم نمائندوں، تعلیم دانوں اور فنکاروں کے علاوہ قومی اردو کونسل کو بھی، اس فریم ورک کی تشکیل کے عمل میں شامل کرلیا ہے، تاکہ وہ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تمام مسلم کاریگروں اور ہنرمندوں کو قومی سطح پر تسلیم شدہ کوالیفکیشن سسٹم اور معیارات کے ساتھ جوڑنے کے لیے ضروری بنیادی معلومات کی فراہمی اور ان کے مسئلوں سے آگاہی کا فریضہ انجام دے سکے۔ کونسل پوری تندہی اور دل جمعی سے اس کام میں جٹ گئی ہے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام، کسی خاص مذہبی اقلیت کی ترقی سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اُس اقلیت کی اقتصادی ترقی کے عمل میں حصہ لے رہی ہے جس کی اکثریت اردو بولتی اور پڑھتی ہے۔

آپ کی بات

کرشن نندہ

A2-302، نرمل چھایا ٹاورز، وی آئی پی روڈ،
زیرک پور پنجاب

مئی 2012 کا شمارہ ہمدست ہوا۔ حسب معمول اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ اردو کے 'چمکتے ستارے' بہت پسند آیا۔ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ بیرون ملکوں میں بھی اردو زبان اتنی ہی مقبول ہے جتنی کہ بھارت میں۔ جرمنی، برطانیہ، سویڈن، ڈنمارک اور امریکہ میں تو ایک بڑی زبان کے طور پر مانی جاتی ہے۔ باقی تمام حضرات تو میرے لیے بنیے ہیں لیکن پاکستان کے مشہور شاعر پروفیسر انور مسعود کو تو میں کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ میں کویت میں تقریباً 35 سال مقیم رہا، وہاں ان کے مزاحیہ پروگرام دیکھنے کو خوب ملتے تھے۔ ہندوستان میں بھی یہ کافی مقبول ہیں ان کی ہر دلعزیز غزل 'بنیان ہندی اے تے لہندی نہیں' بچے بچے کی زبان پر ہے۔

شبیر آصف

سروے نمبر 69، پلاٹ نمبر 4، نشاط نگر، نور باغ،
مالیگاؤں (ناسک)

مئی کے شمارے میں ویسے تو تمام مشمولات 'اردو دنیا' کی روایت کے شایان شان ہیں لیکن میرا جی، منٹو، بانی، حفیظ جونپوری اور مفتی صدرالدین آزردہ پر مضامین خاصے کی چیزیں ہیں۔ تالیف حیدر نے مفتی صدرالدین آزردہ پر جو مضمون لکھا ہے وہ بڑی محنت اور کاوش سے لکھا ہے لیکن اسے پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ 1857 کے ہنگامے کے بعد مفتی صدرالدین آزردہ پر کیا کچھ گزری، تالیف حیدر نے اس تعلق سے کچھ نہیں بتایا۔ مفتی صدرالدین آزردہ (1204 تا 1285) دہلی کے اکابرین میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ 1844 تا 1857 تیرہ برس وہ دہلی میں صدرالصدور کے منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ 1857 کے ہنگامے کے دوران جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتوئ تقسیم ہوا تھا اس پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور دیگر علما و فضلا کے دستخط تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ بھی اس فتوے پر دستخط کرنے والوں میں ماخوذ ہو گئے اور ان کی تمام املاک بحق کمپنی بہادر ضبط ہو گئی۔ مفتی صاحب نے اپنے ایک خط میں اس کا اظہار کیا ہے:

''مولیٰ کریم میری تمام عزیز چیزیں مجھ سے چھن گئیں، ان کی جگہ مجھے اب وہ چیزیں عطا کر جو تجھے عزیز ہیں۔'' رامپور کے نواب یوسف علی خاں نے جو مفتی آزردہ کے شاگرد بھی تھے۔ چاہا کہ مفتی صاحب کا وظیفہ مقرر کرے لیکن مفتی صاحب کی شان بے نیازی نے

اسے گوارا نہ کیا۔ لیکن یوسف علی خان کے انتقال 1865 کے بعد جب نواب کلب علی خاں مسند آرا سلطنت ہوئے تو مفتی صاحب پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بے بس ہو گئے۔ لہٰذا انھوں نے کلب علی خاں کو خط لکھ کر گزارش کی کہ مدرسے کے طلبہ کے مصارف اور ان کی بیگم لاڈو اور بھانجے محمد احسان الرحمٰن کی کفالت کے لیے وظیفہ مقرر کیا جائے۔ مفتی صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ نواب کلب علی خاں نے فوری طور پر دو سو روپے ماہانہ وظیفہ جاری کر دیا۔ اس لیے مفتی صاحب کی مالی مشکلات حل ہو گئیں لیکن اس وظیفے سے مفتی آزردہ زیادہ عرصے تک مستفید نہ ہو سکے۔ 1285ھ میں مفتی آزردہ انتقال کر گئے۔

مفتی صدرالدین آزردہ سے غالب کے بھی دوستانہ مراسم تھے لیکن مفتی صاحب غالب کے طرز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خواجہ حالی نے 'یادگار غالب' میں لکھا ہے کہ جب مفتی صاحب نے غالب کا یہ شعر:

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

سنا تو فرمایا: ''اس میں غالب کا کیا کمال ہے۔ یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے۔'' مفتی صاحب نے اپنا دیوان نہیں چھپوایا اس لیے ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ دست برد زمانہ سے ان کے جو اشعار بچ گئے ان میں سے چند شعر یہ ہیں:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے تو ایسا زیاں نہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھی کی زباں کے ہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

مئی 2012 کا اردو شمارہ بروقت ملا۔ سرورق پر اردو حروف تہجی کے ساتھ گلوب کی تصویر شائع ہوئی یعنی اردو عالم گیر زبان بن گئی ہے اب یہ ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دیگر علاقوں میں بولی لکھی جا رہی ہے۔ ہماری بات اداریہ میں مدیر صاحب کہتے ہیں کہ آج کا دور اطلاعاتی عالم کاری کا دور ہے۔ اردو زبان اب دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح چھاپہ خانوں کی حدوں سے باہر نکل کر ٹی وی اور انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہو چکی ہے۔ آپ کی بات کالم کے رسالے کی قدر و قیمت و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔ مکتوباتی رائے تنقیدی و تبصراتی اہمیت کے حامل رائے ہوتی ہے۔ جیلانی بانو سے انٹرویو غضنفر اقبال نے لیا ہے جو بہت معنی خیز و فکر انگیز ہے۔ ریاض احمد کا مضمون 'کیرالہ میں اردو تعلیم' پڑھنے سے حوصلہ و عزم حاصل ہوتا ہے۔ کیرالہ جیسی سنگلاخ زمینوں میں اردو کے گل بوٹے کھل رہے ہیں۔

محسن باعشن مسرت

4 پرنسپ اسٹریٹ، پہلی منزل، کلکتہ 700072

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ برادرم فراغ روہوی کے توسط سے دیکھنے کا موقع ملا۔ 'اردو دنیا' ماشاء اللہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دیدہ زیب نظر آرہا ہے۔ سرورق سے لے کر آخری صفحے تک کوئی بھی چیز ایسی نظر نہیں آئی جو قابل تعریف نہ ہو۔ مضامین اور خطوط سبھی کالم اپنی اپنی جگہ معلوماتی، پسندیدہ اور دلچسپ ہیں۔ کاغذ عمدہ اور چھپائی دلکش ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ 'اردو دنیا' کا مطالعہ کرتے ہوئے جب آخری صفحے پر پہنچا تو میں چونک پڑا۔ گوشۂ اطفال کو جس طرح خوبصورت اور نمایاں طور پر شائع کیا گیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

عبداللطیف

انگلش ٹیچر، شعبۂ جونیر، مدرسہ اسلامیہ تعلیم القرآن،
پینتے پور، ضلع سیتاپور 261203

'اردو دنیا' کا مئی 2012 کا شمارہ چشم دید ہوا جس کا ہر مضمون قابلِ اعتماد ہے۔ خواجہ اکرام الدین صاحب کے ڈائرکٹر بننے پر پرخلوص مسرت، خاص کر سعادت حسن منٹو کا 'الو کا پٹھا' بڑا دلچسپ جو پسند آیا۔ ساجدہ زیدی کا 'نوکِ ہر خار پر چلنے کی تمنا' کافی اچھا رہا۔ غضنفر اقبال کا جیلانی بانو کا انٹرویو بہت عمدہ ہے۔ میراجی کی آزاد نظمیں اور گیت بڑے نصیحت آمیز ہیں۔ شرجیل احمد خان کا سائنس نالج بڑا زبردست ہے اور اردو کے چمکتے ستاروں کی ضیا جو پورے عالم میں بکھری ہے۔ شیو کمار کی 'کوا اور سانپ' کی کہانی حقیقتاً بچوں کے لیے نصیحت آمیز ہے اور ہاپوڑ میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موبائل وین دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔

ہاجرہ رحمان

'اردو دنیا' مئی 2012 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اردو کے تعلق سے 'ہماری بات' کے تحت آپ کے خیالات موتیوں میں تولنے لائق ہیں۔ اس راہ پرخار میں خدا آپ کو کامیابی عطا کرے کہ 'جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں۔' اندر کے صفحے پر اپنی پسندیدہ رائٹر جیلانی بانو کا انٹرویو جی پڑھ کر جی خوش کرگیا۔ وہ جتنی خوبصورت باہر سے ہیں، باتیں بھی اتنی ہی دلپذیر کرتی ہیں۔ کلاسیکی ادب کے تحت تمام تر مضامین توجہ سے پڑھنے لائق ہیں۔ اردو دنیا کے ذریعے اردو سے متعلق تمام تر علاقائی وقومی خبریں ہماری معلومات میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ خدا آپ کو اسی طرح فعال اور متحرک رکھے۔ آمین!

منظور پروانہ

چکن شاپ، نظیرآباد، لکھنؤ (یوپی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا مئی 2012 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سرورق دیکھ کر ہی دل کھل اٹھا۔ اداریے نے مزید خوشی بڑھائی۔ آپ نے اداریے میں اردو کی ترقی اور بقا کے حوالے سے جن عزائم کا اظہار کیا ہے وہ لائق مبارکباد ہیں۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ ''ان کے علاوہ گیان پیٹھ اور سرسوتی سمان کی طرز پر ان سے بہتر اردو ایوارڈ قائم کرنے، گمنام رہ جانے والے اردو ادیبوں کو منظرِ عام پر لانے اور ادیبوں کے لیے کسی قسم کی بیمہ اسکیم شروع کرنے، بزرگ ادیبوں کے اعزاز میں تقریباب منعقد کرنے، ٹیلی ویژن پر اردو کونسل کی موجودگی کو وسعت دینے، اردو والوں کو اردو سے متعلق

روزگار دلانے میں مدد دینے جیسی افادیت سے بھرپور تجاویز کونسل کے سامنے موجود ہیں جن پر سبھی کے صلاح مشورے سے بہت جلد فیصلے لیے جائیں گے۔'' امید ہے کہ آپ کی سرپرستی میں یہ تجاویز بہت جلد عملی جامہ پہن کر اردو والوں کو اظہارِ خوشی کا موقع فراہم کریں گی۔ دیگر مشمولات میں محترمہ جیلانی بانو سے غضنفر اقبال کا انٹرویو، غیرملکی شعرا کو استقبالیہ پر عبدالحئی کی کوراسٹوری اور خراجِ عقیدت کے تحت ساجدہ زیدی پر زویا زیدی کے علاوہ کیرالہ میں اردو تعلیم، راجندر منچندا بانی، میراجی اور منٹو پر معلوماتی مضامین بہت اچھے ہیں۔ دیگر مشمولات ونگارشات بھی خوب ہیں۔

ڈاکٹر فداء المصطفےٰ فدوی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، اردو فارسی، ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونی ورسٹی، ساگر 470003 (ایم پی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں بحیثیت ڈائرکٹر آپ کی تقرری پر ہدیۂ تہنیت و مبارکباد قبول فرمائیں۔ اپنے ادبی و علمی اور تحقیقی وتنقیدی تنوع کے اعتبار سے 'اردو دنیا' کا کوئی ثانی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اپریل 2012 کے شمارے میں 'گوشہ احتشام حسین' میرے لیے خاص طور سے جاذب توجہ تھا۔ اس میں ڈاکٹر شہزاد انجم کے مقالے 'اردو میں مارکسی وادبی تنقید کا حرف آخر احتشام حسین' میں احتشام حسین کی صحیح تاریخ پیدائش 21 اپریل 1912 کے لیے راقم الحرف کی کتاب 'احتشام حسین حیات وشخصیت اور کارنامے' کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے لیے موصوف کا شکریہ! لیکن جون 2012 کے شمارے میں 'آپ کی بات' (خطوط) میں جناب ایس اے ایچ رضوی کے مکتوب کی اس عبارت پر نظر ٹھہر گئی کہ ''احتشام حسین کی تاریخ پیدائش کے ضمن میں ڈاکٹر شکیل نوازش رضا کا یہ دعویٰ ہے کہ میری تحقیق کے مطابق احتشام حسین کی درست تاریخ پیدائش 21 اپریل 1911 ہے کو صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ راقم الحروف کو 1982 میں احتشام حسین موضوع کے تحت ناگپور یونی ورسٹی ناگپور نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی اور اس مقالے پر مشتمل میری ضخیم کتاب 1985 میں منظر عام پر آکر ارباب زبان و ادب کے حضور شرف باریابی حاصل کرچکی ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں احتشام حسین کی تاریخ ولادت کے متعلق مختلف لوگوں کے بیانات درج کیے ہیں اور ان تمام کا محاسبہ کرکے '21 اپریل 1912' کو صحیح تاریخ پیدائش ثابت کیا ہے۔ کہیں مکتوب نگار موصوف کو 1912 پر 1911 کا دھوکہ تو نہیں ہوا ہے۔ اگر شکیل نوازش رضا 1911 کو درست سنہ پیدائش قرار دیتے ہیں تو آخر کس بنیاد پر؟ اسے جملہ ثبوتوں کے ساتھ ضرور منظر عام پہ آنا چاہیے۔

محمد خرم

اردو ٹیچر، پرائمری اسکول اُنالی، سہارنپور 247001

ماہ اپریل 2012 کا شمارہ ایک مکمل میگزین کے طور پر زیر مطالعہ ہے اس کا ہر مضمون نہایت اعلیٰ، علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ میگزین سے منسوب قلم کاروں کا اسلوب نگارش انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ نہایت عمدہ اور شستہ لب ولہجے کا استعمال کرتے ہیں۔ آخری مضامین کی شکل میں قدیم حکایتوں کا بہترین سلسلہ میری فکر وعقل کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔ ظ انصاری اور ابوالفیض سحر کے تحقیقی شہ پارے 'خسرو شناسی' کے ایک دل چسپ مضمون امیر خسرو- ایک سماجی باغی کے مطالعے سے ان کی اسلامی فکر وتعلیم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ◘

▪ اے رحمان عباس

میرے افسانوں کا مرکزی کردار عام آدمی ہے، کمزور آدمی نہیں

سلام بن رزاق

'سلام بن رزاق' اردو افسانے کا بے حد اہم نام ہے۔ آج جب اردو افسانے یا اردو کہانی میں 'کہانی پن' کے کم یا بالکل ہی غائب ہوجانے کے سلسلے میں جابجا تشویش کا اظہار ہوتا رہتا ہے، سلام بن رزاق کا نام اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سرفہرست مانا جاسکتا ہے، جن کی کوئی بھی تخلیق اپنی پہلی یا دوسری سطر سے ہی خود کو پڑھوا لینے پر مجبور کردیتی ہے۔ اسلوب اور بیانیہ کے لحاظ سے ان کے افسانوں میں غضب کا توازن پایا جاتا ہے اور تقریباً ہر ذہنی سطح کا قاری ان کی تخلیق کا لطف لے سکتا ہے۔ ترسیل میں ہر طرح کے قاری کو ہمراہ کرلینے کا یہ ہنر اور بے حد نازک فنکارانہ توازن ہی کسی ادب کو بڑا ادیب بناتا ہے۔ پیش خدمت ہے اس بڑے ادیب سے کیے گئے رحمن عباس کے ایک انٹرویو کے اقتباس، جو خود بھی اردو فکشن کی ایک اہم شخصیت ہیں اور جن کے دو ناول 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' اور 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' ادبی حلقوں میں موضوعِ گفتگو رہے ہیں۔ انھوں نے انٹرویو میں سلام بن رزاق کے فن اور شخصیت کی فکری و نظریاتی جہتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

رحمن عباس: آپ افسانہ نگاری کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

سلام بن رزاق: بچپن میں میری ماں نور نامہ، عہدنامہ اور دائی حلیمہ کا قصہ جیسی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ اس طرح مجھے بھی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا۔ داستانِ امیر حمزہ، حاتم طائی، باغ و بہار، صادق حسین سردھنوی اور نسیم حجازی کے تاریخی ناول اور ابن صفی کے جاسوسی ناول اور جانے کیا کیا پڑھتا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ پڑھتے پڑھتے کب لکھنا شروع کردیا۔ ابتدا میں طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی لیکن بہت جلد میں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ پہلا افسانہ ماہ نامہ شاعر (ممبئی) میں شائع ہوا تھا۔

ر ع: شاعری سے افسانے کی طرف آپ کیوں مائل ہوئے؟

سلام: شعر کہتے ہوئے مجھے بہت جلد یہ محسوس ہوگیا کہ میں اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار شاعری کے بجائے

3/21/2018 P6.jpg (1627×2247)

نثر میں زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہوں۔ لہٰذا تخلیقی اظہار کے لیے افسانہ مجھے زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوا۔ یوں تو میں ہلکے پھلکے تنقیدی مضامین، تبصرے، ڈرامے، بچوں کے مضامین، ٹیلی فلمیں بقدرِ ظرف ہر صنف میں طبع آزمائی کرتا رہتا ہوں مگر ایک قلم کار کی حیثیت سے افسانہ میری اولین ترجیح ہے۔ افسانہ لکھ کر مجھے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ دراصل افسانہ لکھنا میرے نزدیک اپنے کرچی کرچی وجود کو سمیٹنے کا نام ہے جس کے وسیلے سے میں اپنے آپ کو ماحول کی جبریت سے آزاد کرتا رہتا ہوں۔

د ع: عمدہ افسانے کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے؟

سلام: میرے نزدیک ایک عمدہ افسانے کی تعریف یہی ہے کہ جسے پڑھنے کے بعد قاری وہ نہ رہے جو پڑھنے سے قبل تھا۔ ایک اچھا شعر، عمدہ افسانہ، ایک بلند پایہ ناول ہمیں مسرت و انبساط کے ساتھ ساتھ ہماری پراگندہ سوچ کے دھارے کو زندگی کے بیکراں سمندر سے جوڑ دیتا ہے۔ نیز جس کے مطالعے کے بعد ہمیں زندگی زیادہ بامعنی اور با مقصد لگنے لگتی ہے۔

د ع: آپ کے افسانوں پر 'زندگی سے کومپرومائز' اور 'ہارے ہوئے آدمی کی خود سپردگی' ایسے الزامات لگے ہیں... ان پر آپ کا ردِ عمل کیا ہے؟

سلام: بعض اوقات غلط قسم کے پروپیگنڈے سے یا افسانوں کو ان کے صحیح تناظر میں نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک من گھڑت متھ جنم لیتی ہے اور اس کا منحوس سایا افسانہ نگار کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے چند افسانوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میرے افسانوں کا مرکزی کردار 'ایک عام آدمی' ہے۔ جبکہ اسے غلطی سے بعض لوگوں نے 'کمزور آدمی' سمجھ لیا ہے... عام آدمی اور کمزور آدمی میں فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کمزور آدمی زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے اور آخر میں خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ میرے کسی افسانے میں کسی کردار نے خودکشی نہیں کی ہے۔ میں نے اپنے کرداروں کو "ابھی منیو" سے تشبیہ دی ہے وہ ابھی منیو، کی طرح زندگی کے چکرویو میں داخل ہونے کا منتر تو جانتا ہے مگر اس سے باہر نکلنے کا منتر نہیں جانتا... کیا مہابھارت کا وہ 'مہا یودھا' شکست خوردہ تھا۔ یا اس نے خود سپردگی کی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ اسے بھی چکرویو سے باہر نکلنے کا منتر صرف ارجن بتا سکتا تھا۔ اور یہ میرے عہد کی بدقسمتی ہے کہ میرے عہد میں کوئی ارجن پیدا نہیں ہوا۔ ہمارے رہنماؤں میں کوئی ارجن نہیں... صرف شر کھنڈی ہیں۔ میں جھوٹے ہیروز کی کہانیاں لکھنے سے بہتر سمجھتا ہوں سچے کرداروں کی کہانیاں لکھوں۔ اس کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ میں نے اپنے افسانوں میں جبر و استحصال کی جو تصویریں کھینچی ہیں ان سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کسی بھی نظام کے خلاف نفرت ہی تبدیلی یا انقلاب کی جانب پہلا قدم ہے۔

د ع: اردو کہانی میں 'بیانیہ' کی واپسی میں آپ کا رول اہم ہے۔ اب آپ کو ایسا نہیں لگتا یہی بیانیہ اکہرا پن، یکسانیت اور یک رخی حقیقت نگاری کا شکار ہوا ہے؟

سلام: بیانیہ دراصل کہانی کا ایک اسلوب ہے۔ چند جدید افسانہ نگاروں نے بیانیہ کی جگہ 'تجریدیت' کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا جس سے کہانی کا کہانی پن غائب ہوگیا۔ میں کہانی پن کو افسانے کا بنیادی وصف مانتا ہوں۔ اس اعتبار سے بیانیہ یا کہانی پن کی واپسی افسانے کا پنر جنم ہے میں تو یہ نہیں جانتا کہ میرا اس میں کیا رول رہا ہے مگر یہ سچ ہے کہ میں نے شروع سے معماتی قسم کے افسانوں سے انحراف کیا ہے۔ اگرچہ علامتوں، استعاروں، تمثیلوں اور دیو مالا کو میں نے بھی اپنی کہانیوں میں استعمال کیا ہے۔ مگر میری بیشتر کہانیوں کا اسلوب بیانیہ ہی رہا ہے۔ کہانی میں اکہرا پن بیانیہ سے نہیں ناقص بیانیہ سے پیدا ہوتا ہے صرف اردو ہی کے نہیں دنیا کی کسی بھی زبان کے افسانے اٹھا کر دیکھ لیجیے... بہترین افسانے یا ناول بیانیہ اسلوب میں ہی لکھے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ آسمانی صحائف کا اسلوب بھی بیانیہ ہی ہے۔ اصل میں موضوع اور مواد کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے، اہمیت ہوتی ہے اندازِ بیان یا ٹرٹمنٹ کی۔

اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے ورنہ
دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں ہے

د ع: فکشن کی اقدار کیا ہیں؟

سلام: میرے نزدیک فکشن ایسا خیالی قصہ ہے جس میں اپنے عہد کے کسی انسانی مسئلے کو تخلیقی سطح پر نثر میں بیان کیا گیا ہو... لہٰذا فکشن کی اقدار بھی وہی ہوں گی جو اس عہد کی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی اقدار ہوں گی۔ ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آج کے فکشن میں روحِ عصر کی پکار سنائی دیتی ہے یا نہیں؟

د ع: فسطائی قوتوں کے متعلق ادیب کا رویہ اور رول کیسا ہونا چاہیے؟

سلام: یہ سوال بہت اہم بھی ہے اور تفصیل طلب بھی... اگر ہم انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بادشاہت ہو یا برسرِ اقتدار حکمراں گروہ، جب ایک حد سے زیادہ طاقت حاصل کر لیتا ہے یا ان میں خود غرضی اور مفاد پرستی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ رعایا، یا عوام کے استحصال پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی مخالفت کرنے والی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ اسی صورت میں پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ ادیب بیچارے کی کیا بساط... البتہ ایسے حالات میں بھی سچا قلم کار کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح اپنا احتجاج درج کراتا رہتا ہے... کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں کبھی رمز و کنائے کے سہارے...

د ع: کیا آپ مذہب اور ادب کی اقدار میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

سلام: مذہب کا تعلق عقیدے سے ہے مگر ادب کا سروکار عقیدے سے نہیں، انسانی فکر سے ہے۔ مذہب انسان کو 'یقین' کے حصار میں قید کر دیتا ہے اور ادب اسے ایک ایسی آزاد فضا میں لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے تخئیل، مشاہدے اور تجربے کی مدد سے ایک نئی دنیا خلق کرتا ہے۔ مذہب ایک عام آدمی کو آسودگی عطا ہے کرتا مگر ادب تشکیک کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ البتہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تشکیک تلاش و جستجو کی پہلی منزل ہے۔

د ع: کیا اردو زبان کی ثقافت فکشن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب ہے؟

سلام: یہ سچ ہے کہ اردو زبان پر عرصے تک درباری اثرات حاوی رہے ہیں۔ ہمارے شعری سانچے بھی ایک مخصوص ثقافت کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ غزل کی وجہ سے بھی ہماری زبان پر تکلفات کے پردے پڑے رہے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہماری زبان فکشن کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ آخر بیدی، منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین اور ادھر جدید اور مابعد جدید قلم کاروں نے جو افسانے اور ناول لکھے ہیں ان میں سے کم کم ہی سہی، بعض دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں ویسے اردو فکشن ابھی ارتقائی منزل میں ہے اسے اور بہت آگے جانا ہے۔

د ع: مابعد جدیدیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟

سلام: ترقی پسندی اپنی انتہا کو پہنچنے کے بعد نظریے کے چوکھٹے میں قید ہوگئی۔ تب جدیدیت ایک طاقت ور رجحان کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ مگر اس رجحان کے تحت جو تخلیقات سامنے آئیں ان پر زیادہ تر وجودی طرزِ فکر کا غلبہ رہا... مایوسی، تنہائی، اجنبیت اور گم شدگی جیسے موضوعات ہی جدیدیت کی شناخت بن گئے۔ 1970 کے بعد لکھنے والوں نے ترقی پسندوں کی واشگاف مقصدیت اور جدیدیوں

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P6.jpg 1/1

3/21/2018 P7.jpg (1639×2241)

کے چیستانی تجریدیت دونوں سے بیزاری کا اعلان کیا... آج کا تخلیق کار کھلی فضا میں سانس لینے کا قائل نظر آتا ہے۔ بعض ناقدین اسی عہد کو مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ آج جو افسانے لکھے جارہے ہیں چاہے انھیں آپ مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کریں یا ہم عصر افسانے کے نام سے یاد کریں، ادب کے بنیادی میلانات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ میری دانست میں مابعد جدیدیت نہ کوئی تحریک ہے نہ رجحان بلکہ ایک phenomena ہے جو جدیدیت کے بعد پیدا ہونے والی سماجی، ثقافتی اور ادبی صورت حال کو انگیز کرنے پر زور دیتی ہے۔

دع: کیا آپ خود کو مابعد جدیدیت ادیب سمجھتے ہیں؟

سلام: میں صرف ایک افسانہ نگار ہوں، ناقدین میرے افسانوں کو جس خانے میں چاہیں رکھ لیں۔

دع: ترقی پسند تحریک نے آپ پر کوئی اثر مرتب کیا؟

سلام: یوں تو ترقی پسند تحریک سے براہِ راست میرا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ مگر طالبِ علمی کے زمانے میں سردار جعفری، کرشن چندر، مجروح سلطانپوری اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ کرشن چندر کے افسانے، جوش ملیح آبادی اور سردار جعفری کی نظموں پر سردھننا میرا محبوب مشغلہ تھا۔۔اس طرح میری فکری نشو ونما میں ترقی پسند ادب کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ترقی پسند تحریک روبہ زوال تھی اور چاروں طرف جدیدیت کا غلغلہ تھا۔ مگر جدیدیت اور تجریدیت کے مقابلے میں ترقی پسند ادب کے اثرات یقیناً میرے ذہن پر زیادہ گہرے ہیں۔

دع: پریم چند کے 'آدرش وادی' فریم میں، کیا اب کہانیاں لکھنا ممکن ہے؟

سلام: 'شاید نہیں۔' مگر پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کو محض آدرش وادی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فکشن نگار کو سیکھنے کے لیے پریم چند کے پاس آدرش واد کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

دع: کرشن چندر کی رومانی نثر کے زوال کا سبب کیا ہے؟

سلام: کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے علم برداروں میں سے ایک تھے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی کے ساتھ انسان دوستی اور اشتراکیت کی صفات بھی موجود ہیں۔ مگر اکثر افسانوں میں ان کا نظریہ ان کے فن پر حاوی نظر آتا ہے جس کے سبب ان کے افسانے کہیں کہیں اشتراکیت کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کے رومانی اسلوب کا جادو ایک طرح قارئین کے سر چڑھ کر بولتا رہا مگر نظریاتی بازگشت کے سبب ان کے افسانوں میں یک رخا پن آگیا۔ ان کے زوال کا ایک سبب ان کی کثرت نویسی بھی تھا۔ اس کے باوجود کرشن چندر کا شمار اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہی ہوگا... کیونکہ انھوں نے اردو کو چند ایسی لازوال کہانیاں دی ہیں جن کا مقام اردو فکشن میں ہمیشہ بلند رہے گا۔

دع: کیا قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ایک مخصوص طبقے کی زندگی کا احوال پڑھ کر آپ کبھی اکتاہٹ کا شکار ہوئے ہیں؟

سلام: بالکل نہیں! میں کسی بھی تخلیق پارے کو اس کے عصری تناظر میں رکھ کر پڑھتا ہوں... افسانے یا ناول میں، میں نظریاتی یا طبقاتی عناصر تلاش نہیں کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ ادیب اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات سے کہاں تک عہدہ برآ ہوا ہے۔ اس نے کرداروں کو کتنے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ نیز زندگی کے تئیں اس کا اپروچ کیا ہے۔ وغیرہ... یہ سچ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے زیادہ تر کردار اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔۔اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ خود قرۃ العین حیدر اس طبقے کی ایک فرد تھیں۔ ایک طرح سے انھوں نے اپنی شخصیت کو اپنے کرداروں میں ضم کر دیا ہے۔ ممکن ہے ان کرداروں سے ہماری تمھاری آشنائی نہ ہو۔ مگر ان کی سچائی سے انکار ممکن نہیں۔

دع: کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ انتظار حسین کے ناول 'بستی' پر ماضی پرستی کی چھاپ ہے؟

سلام: انتظار حسین کا محبوب موضوع 'ہجرت' یا ماضی کی صالح اقدار کی بازیافت ہے... میں اسے ماضی پرستی نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ انتظار حسین اساطیر اور تاریخ کے سمندر منتھن سے ایسے موتی تلاش کر کے لاتے ہیں جو انسانی تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ حکایات اور اقوال کے حوالے سے زمانہ حال کی مادہ پرستی، بدکرداری، عیاری، مکاری اور انسان کی مفاد پرستی کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ جسے آپ ماضی پرستی کہہ رہے ہیں۔ اسے وہ اپنا تجربہ کہتے ہیں... انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں صاف کہا ہے کہ 'جو بھی میرا تجربہ ہے۔ میں ابھی اس تجربے کو exhaust نہیں کر سکا۔ جب تک اس پورے تجربے کو میں بیان نہ کر پاؤں میں دوسرے تجربے کی طرف کیسے جا سکتا ہوں۔' لہٰذا بستی کو بھی ان کے طویل تجربے کا ہی ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔

دع: ایسے ہی 'تجربے' یا ماضی پرستی کی مثال شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' ہے۔ اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

سلام: شمس الرحمٰن فاررقی کا ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' ایک نیم تاریخی ناول ہے۔ یہ ناول بے جا تاریخی حوالوں اور اکتا دینے والی تفاصیل کے سبب بوجھل ہوگیا ہے۔ ناول کا بیانیہ جس لطافت کا متقاضی ہوتا ہے وہ اس ناول میں مفقود ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ماضی پرستی کی ایک خراب مثال ہے۔ یہ ناول پڑھتے ہوئے قاری ماضی کے دھندلکے میں کھو جاتا ہے جبکہ انتظار حسین جب بھی ماضی میں غوطہ زن ہوتے ہیں عبرت اور بصریت کے گوہر نایاب تلاش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

دع: آپ کی نظر میں اردو کا سب سے عمدہ ناول کون سا ہے اور کیوں؟

سلام: ابھی تک تو 'آگ کا دریا' ہی ہے۔ کیونکہ اس ناول میں ہماری تین ہزار سالہ تہذیب کے نشیب و فراز کی فنکارانہ عکاسی کی گئی ہے۔ خود عینی آپا کہتی ہیں 'دریا کو زمانے کا سمبل بنا کر میں نے تین ہزار سال پر پھیلی ہوئی اور الجھی ہوئی ہندستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔' اس ناول میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک عام انسان کو حکمراں اور سیاست داں کس طرح جنگ کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں۔ اس طرح ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب انسانوں نے انسانوں کا استحصال نہیں کیا ہو۔ اس اعتبار سے 'آگ کا دریا' انسانی تاریخ کی ایک اہم دستاویز بن جاتا ہے۔

دع: آپ کس طرح کے ادبی رسائل ناپسند کرتے ہیں؟

سلام: ایسے رسالے جو ادب کے نام پر محض اپنی دکانیں چمکانے کے لیے کمزور، بے بضاعت، کم سواد اور کم صلاحیت ادیبوں اور شاعروں کو بانس پر چڑھاتے ہیں اور ان سے اشتہار، چندہ یا اعزازی معاوضے کے نام پر روپیہ بٹورتے ہیں۔ خیر... ایسے رسائل کی عمریں بھی لمبی نہیں ہوتیں۔ یہ کُکرمتوں کی طرح ہوا ہو جاتے ہیں۔

دع: ادبی رسائل کے مدیروں کے رویے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سلام: پہلے جو ادبی رسالے نکلا کرتے تھے ان کے مدیروں کا ایک ادبی پس منظر ہوا کرتا تھا۔ وہ ادب کے شناور اور ادیبوں کے سچے قدر داں ہوا کرتے تھے مگر آج کل بعض مدیر جن کا ادب سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا محض رسالہ نکالتے ہیں کہ وہ ادب میں اپنی ساکھ بنا سکیں اور اپنی جبلت خودنمائی کا سامان کر سکیں۔ ان کا کوئی سرمایہ دار دوست ان کی مالی اعانت کرنے کے لیے اس لیے تیار ہو

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P7.jpg 1/1

3/21/2018 P8.jpg (1561×2200)

جاتا کہ اسے اس رسالے کے بہانے اپنے انکم ٹیکس کو ٹھکانے لگانے کا ایک آسان ذریعہ مل جاتا ہے اس پر مستزاد یہ کہ بعض خوشامدی قسم کے قلم کار اپنے خطوط کے ذریعے ایسے 'رنگیلے سیار' قسم کے مدیروں کی جھوٹی تعریفیں کرکے ان کی انانیت کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

ر ع: دیگر زبانوں کے کن ادیبوں سے آپ نے استفادہ کیا ہے؟

سلام: اردو کے علاوہ میں ہندی اور مراٹھی زبان سے بھی واقف ہوں۔ گاہے بہ گاہے ان زبانوں کے فکشن سے بھی کما حقہ استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ ہندی میں لیش پال، فنش ور ناتھ رینو، دھرم ویر بھارتی، موہن راکیش میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ مراٹھی میں وی سی کھانڈیکر، گنگا دھر گاڈگل، اروند گوکھلے، ونکٹیش ماڈگل کر اور جی اے کلکرنی وغیرہ کے فکشن کو میں نے پڑھا ہے۔

ر ع: تنقید کی ادب میں کیا حیثیت ہے؟

سلام: تنقید دراصل تخلیق کا سایا ہے، یعنی تنقید اس وقت تک ظہور میں نہیں آسکتی جب تک تخلیق معرضِ وجود میں نہ آجائے۔ اس لیے ادب میں تنقید کی حیثیت ہمیشہ ثانوی ہوگی۔

ر ع: کیا ادب میں جنس کے اظہار کو آپ معیوب تصور کرتے ہیں؟

سلام: ادب میں کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ وہ 'ادب' ہو۔ جنسی موضوعات بھی ادب کا موضوع بن سکتے ہیں۔ بنتے رہے ہیں۔ بنتے رہیں گے۔ بس اس موضوع کو احتیاط اور سلیقے سے برتنے کی بات ہے۔

ر ع: ادب میں 'ہم جنس پرستی' کے بیان کو کیا حرام قرار دیا جاسکتا ہے؟

سلام: میں کوئی مولوی یا مفتی نہیں ہوں کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دوں۔ جب میرے سامنے اس قسم کا کوئی مسئلہ آتا ہے تو میں سب سے پہلے اسے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس کا تجزیہ کرتا ہوں اور اس کے امکانی پہلوؤں کو اپنی تخلیق میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اچھا، برا، غلط صحیح یا حلال حرام کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔

ر ع: آپ نے بچوں کے لیے بھی خوب لکھا ہے۔ بچوں کے ادب کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے؟

سلام: بچوں کے ادب میں پھولوں کی سی معصومیت، تتلیوں کی سی رنگینی اور پرندوں کی سی چہکار ہونی چاہیے۔ زبان اس قدر سلیس ہو کہ ہر عمر کا بچہ آسانی سے پڑھ سکے۔ روانی ایسی جیسے کوئی ڈھلان پر سائیکل چلا رہا ہو۔ شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہے۔ ساتھ ہی اس کے علم میں، الفاظ کے ذخیرے میں اور آس پاس کے ماحول اور کرداروں کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔

ر ع: غالباً آپ اردو کے واحد ادیب ہیں جنھیں ساہتیہ اکادمی نے تخلیقی اور ترجمہ دونوں میدانوں میں ایوارڈ سے نوازا ہے۔ آپ نے مراٹھی اور ہندی زبان سے کئی شہ پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ادب میں ترجمے کی اہمیت اور ضرورت پر مختصراً روشنی ڈالیے؟

سلام: ہر زمانے میں ترجمے کی اہمیت اور افادیت مسلم رہی ہے۔ ترجمہ دو زبانوں، دو تہذیبوں، دو قوموں اور دو ملکوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔ اور انسان کے آپسی رشتوں کو مستحکم کرتا ہے۔ ترجمے کی پہلی شرط یہ ہے کہ مترجم اپنی زبان میں مہارت رکھتا ہو نیز جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہو اس زبان کے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی پس منظر سے کما حقہ واقفیت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ ترجمہ ایسا رواں ہو کہ نقشِ ثانی پر نقشِ اول کا گمان ہو۔ میرے نزدیک ایک عمدہ ترجمہ ایک ناقص تخلیق سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔

ر ع: اردو کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟

سلام: اردو والے اردو کی زبوں حالی کا رونا تو روتے ہیں لیکن اس کی بقا کے لیے ہم نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا ہے۔ زبان صرف سرکاری امداد اور حکومت کی سرپرستی سے زندہ نہیں رہ سکتی اسے دل میں جگہ دینی ہوتی ہے۔ اپنے روزمرہ کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ یہودیوں نے صدیوں تک خانہ بدوشی کی زندگی گزاری مگر 'ہبرو' زبان کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ ہمیں بھی اردو کے ساتھ اسی محبت کا ثبوت دینا ہوگا ورنہ اس ملک میں اردو زبان بھی رفتہ رفتہ فارسی کی طرح کالعدم ہوجائے گی۔ زبان کے فروغ کی بات تو بعد میں آئے گی پہلے تو اس کی بقا کے جتن کرنے ہوں گے۔

◘

A. Rahman Abbas,204/A, Poonma Park Mira Road, Thane 401107, Mobile 09869083297

Thanks,

Salam bin Razak, B-603, New Aakaar CHS, Opp. Haidary Masjid, Naya Nagar, Mira Road (E), Dist. Thane - 401 107
Contact : +91 9967330204

سلام بن رزاق: ایک نظر میں

نام: سلام بن رزاق

پیدائش: 15 نومبر 1941 (پنویل، مہاراشٹر)

ملازمت:

بی ایم سی کے شعبۂ درس و تدریس میں 36 سال وابستگی کے بعد 1999 میں سبک دوش۔

تصانیف:

ننگی دوپہر کا سپاہی، معبّر، شکستہ بتوں کے درمیان، شکستہ بتوں کے درمیان (انتخاب)، زندگی افسانہ نہیں، ماہم کی کھاڑی (مراٹھی ناول کا ترجمہ)، کام دھینو (افسانے ہندی میں)، شری پد کرشن کولہٹکر (سوانح)، عصری ہندی کہانیاں (ہندی سے ترجمہ)، جی اے کلکرنی کی کہانیاں (مراٹھی سے ترجمہ)، بادل کی آپ بیتی (بچوں کے لیے مضامین)، ننھے کھلاڑی (بچوں کے لیے ناول)، مراٹھی لوک کہانیاں (ترجمہ و انتخاب)، رابعہ بصری (بچوں کے لیے سوانح)،

اعزازات وانعامات:

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ برائے تخلیقی ادب، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ برائے ترجمہ، مہاراشٹر اسٹیٹ ایوارڈ برائے اردو، مراٹھی ادبی خدمات کے لیے، مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی ولی دکنی ایوارڈ، مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی سے 6 انعامات۔ (چھ بار)، اترپردیش اردو اکیڈمی سے 2 انعامات، بہار اردو اکیڈمی سے 2 انعامات، کتھا ایوارڈ، اترپردیش اردو ہندی ساہتیہ کمیٹی ایوارڈ

☆ کئی افسانے ہندی، مراٹھی، تیلگو، پنجابی کے علاوہ انگریزی، روسی، ازبیک، جرمن اور نارویجین زبانوں میں ترجمہ۔

☆ چند یک بابی ڈراموں کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے لیے ۱۰۰ سے زائد ریڈیائی ڈرامے نشر۔

ٹیلی فلمیں:

(1) آندھی میں چراغ
(2) خوں بہا
(3) انجام کار
(4) باہم
(5) ایک لمبی رات (شارٹ فلم)

فیچر فلمیں:

(1) انگاروادی
(2) تیرا ساتھ
(3) نائک بنا کھلنائک، رکن بال بھارتی اردو کمیٹی (پونے)

صدر: مہاراشٹر اردو رائٹرس گلڈ (ممبئی)

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P8.jpg 1/1

3/21/2018 P9.jpg (1598×2200)

مجاز - کچھ باتیں

زبیر رضوی

اپنے زمانے کے کسی بھی فنکار، ادیب کو اُس کی فنی خوبیوں اور عوام میں اُس کی مقبولیت کی بنا پر اُسے دیکھنے اور اُسے آئیڈیل مان کر اسے ٹوٹ کر چاہنے کا اِضطراب نئی نسل میں قابلِ دید ہوتا ہے اِس انداز اور زاویے سے اگر ہم اپنے اپنے زمانے کے صفِ اول کے لکھنے والوں کی تحریروں اُن کی یادوں اور Memoires کی ورق گردانی کریں تو فنکاروں اور ادیبوں پر جان ودل سے فدا ہونے کے بے شمار دلچسپ واقعات آپ جیسے سامعین کو سنانے کے لیے مل جائیں گے ایسا ہی ایک واقعہ اور اردو کی بے مثال افسانہ نگار عصمت چغتائی نے اپنی یادوں کو کرید کر لکھا ہے ایک مرتبہ انھیں پہلی بار پریم چند کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پریم چند کے آس پاس اُن کے عقیدتمند انھیں ڈائز تک پہنچانے کے لیے انھیں گھیرے میں لیے چل رہے تھے ان میں عصمت بھی تھیں پریم چند کے پیچھے بے حد جذباتی ہو کر چلنے والی عصمت نے پریم چند کے ڈائز پر چڑھنے سے پہلے اپنے پورے ہاتھ سے انھیں سہارا دینے کی کوشش میں اپنا پورا ہاتھ ان کی پیٹھ پر رکھنا چاہا مگر مشتاق لوگوں کی ریل پیل میں ان کے پورے ہاتھ کے بجائے ان کی ایک دو انگلیاں ہی پریم چند کی پشت کو چھو سکی تھیں عصمت لکھتی ہیں ''تو میں ان انگلیوں میں قلم تھام کر قابل ذکر افسانہ نگار بن گئی اگر میں پورے ہاتھ سے پریم چند کو چھو لیتی تو نہ جانے میری افسانہ نگاری کیا قیامت ڈھاتی!''

بالکل ایسا ہی میرے ساتھ اُس وقت ہوا جب میں حیدر آباد میں تھا۔ اور ہائر سیکنڈری کا طالب علم تھا یہ 1951 کا سال تھا شاعر مجاز ایک Craze کی صورت نئی نسل میں مقبول تھے وہ سٹی کالج کے ایک مشاعرے میں آئے تھے ان کی غزلیں اور نظمیں نئی نسل میں امکان بھر مقبول تھیں ان کی بے پناہ مقبول نظم 'آوارہ' ہمیں زبانی یاد تھی لڑکوں کا ایک ہجوم تھا جو مجاز کو گھیرے ہوئے تھا۔ عصمت کے برخلاف میں اور میرے دوست دور ہی سے کرتے پاجامے پر واسکٹ پہنے قبول صورت مجاز کو صرف دیکھ پائے تھے سن پائے تھے اور میں مجاز کو صرف دیکھ کر ہی شاعری کرنے لگا تھا۔

بہت دنوں بعد یہ راز ہم پر کھلا کہ بڑے فنکاروں اور اَدیبوں کی شخصیت ایسا ہی جادوئی اثر اپنے اپنے وقتوں کی نئی نسل پر چھوڑ جاتی ہے۔ عصمت ہی نے مجاز کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ گرلز ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں میں مجاز کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ لڑکیاں اُن کے نام کی قرعہ اندازی کرتی تھیں یہ جاننے کے لیے کہ مجاز سے عشق کرنے کا حق کس ایک خوش قسمت لڑکی کے حصے میں آتا ہے۔

یہ تھی 19 اکتوبر 1911 کو لکھنؤ کے قریب ایک بستی ردولی میں ایک خوشحال زمیندار گھرانے میں پیدا ہونے والے مجاز کی مقبولیت کی ایک جھلک بیسویں صدی کے ثقافتی اور فکری منظرنامے میں رنگ بھرنے والے لکھنؤ شہر نے جو اُس وقت ہندوستان کا شیراز بنا ہوا تھا مجاز کو کیسے کیسے ناز ونعم سے پالا اور اُن کی شعری ذہانتوں کی پذیرائی کی۔ اُس کی بے شمار تصویریں ہمیں جہاں جہاں ہلکے گہرے رنگوں میں ملتی ہیں اُن میں تین کتابیں اُس مُطربِ بزمِ دلبراں کی ذات کے نہاں خانوں میں جھانکنے اور مجاز کی زندگی کے اُن شب وروز کی گواہی اور آنکھوں دیکھی بیان کرتی ہیں جو عموماً پڑھنے والوں کے علم میں نہیں ہیں یہ بنیادی حوالے کی کتابیں ہیں مجاز- حیات اور شاعری- منظر سلیم، مجاز کی زندگی پر مبنی سوانحی ناول غم دل وحشتِ دل ڈاکٹر محمد حسن اور مجاز کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم کی یادیں 'ہم ساتھ تھے' مجاز کی زندگی اور اُن کی شاعری کے 44 برسوں کو بڑے مستند انداز میں بیان کرتی ہیں ان کے علاوہ رسالہ شاہراہ اور کراچی کے رسالے افکار کا مجاز نمبر اور علی سردار جعفری کی کتاب لکھنؤ کی پانچ راتیں بھی مجاز کے شب وروز کے کئی Shades کے ساتھ ہمارے مطالعے کا حصہ بنتی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے 'دیوانہ مرگیا' کے نام سے مجاز کی زندگی پر ایک ادھورا ناول لکھا جس کے سترہ باب میں صرف گیارہ باب ہی وہ لکھ پائی تھیں اس ادھورے ناول کا چرچا کم ہی ہوا۔

کسی بھی شاعر کے بارے میں اس کی شاعری کے اوپری رنگ اور غازے کو بنیاد بنا کر اُس کی شاعری پر کئی طرح کے لیبل چسپاں کردیے جاتے ہیں اور پھر اُسی طرح کی چھپی سخن فہموں کے درمیان بغیر کسی نظرِ ثانی کے گردش کرتی رہتی ہے۔ مجاز بھی ایسے ہی شاعر تھے جو کتنے ہی کلشوں کا شکار بنے رہے انھیں مطربِ بزمِ دلبراں بھی کہا گیا اور ایسا ترقی پسند بھی جو انقلاب آفریں شاعری کرنے والا تھا مجاز کا تمام شعری سرمایہ 'آہنگ' کے نام سے ترتیب پا چکا ہے مجاز نے اس کے انتساب میں خود کو جن معاصر شاعروں سے ہم آہنگ ہونے کا اعتراف کیا تھا وہ تھے ان کے دل وجگر فیض اور جذبی اور دست وبازو تھے سردار جعفری اور مخدوم آہنگ کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا تھا اور انھوں نے آہنگ کے پہلے ہی صفحے پر درج اس شعر کا حوالہ دیا تھا

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز کے اِس شعر کو اُس کی شاعری کی کلید بنا کر فیض نے لکھا تھا:

''مجاز کی شاعری انھی تین اجزا سے مرکب ہے یعنی ساز، جام اور شمشیر، فیض نے اپنے اِسی دیباچے میں مجاز کی شاعری کے ان تین اجزائے ترکیبی اور امتزاج کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا ''مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے اُس کے کلام میں خطیب کے نُطق کی کڑک نہیں باغی کے دل کی آگ نہیں نغمہ سنج کے گلے کا 'وفور' ہے یہی 'وفور' مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین''

سردار جعفری 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' میں لکھتے ہیں ''نوعمر ترقی پسندوں کی ٹولی عجیب وغریب زندگی بسر کر رہی تھی کچھ تو ابھی تک کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے لیکن سارے ہندوستان میں مشہور ہو چکے تھے ہمارے چار مشغلے تھے تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ گردی ہم مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر پائے جاتے تھے۔''

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P9.jpg 1/1

3/21/2018 P10.jpg (1507×2200)

ہمارے عہد کے بے حد معتبر نقاد وارث علوی نے 'مجاز کی یادیں' ایک طویل مضمون لکھتے ہوئے اِس طرح آغاز کیا تھا۔

''رومانیت، غنائیت اور آوارگی— یہ تین عناصر ہیں جن سے مجاز کی شاعری کا خمیر اُٹھا ہے'' یہ بات ان مذکورہ Quotation سے واضح ہوجاتی ہے کہ مجاز کے 'تصور انقلاب' کی اوڑھی ہوئی ترقی پسندی کے جن حامیوں نے زیادہ ڈگڈگی بجائی وہ تھے جو شاعری کی اکہری سطحوں کو چھو کر شاعر کی تخلیقی فکر کو نظریات کی ٹوپی پہناتے رہے تھے۔ مجاز کی سرخ آندھی کو روس اور چین کے سے مارکسی انقلاب کی ردائیں اوڑھانے والوں نے فیض کو بھی انقلاب کی رزم گاہ کا 'شمشیر زن' بنادیا تھا اور مجاز کو بھی جس نے 22 سال کی عمر میں انقلاب جیسی نظم عنفوانِ شباب کے آتش فشاں دور میں لکھی تھی اس ایک نظم کے حوالے سے مجاز کی 'انقلابی فکر' کے ذکر کا سلسلہ آج بھی جاری ہے دیکھیے 'آجکل' اکتوبر 2011 کے مجاز نمبر میں کچھ مضامین۔

فیض صدی کی تقریبات کے دنوں میں فیض کی شاعری کے نئے نئے شارحین کی جو باڑھ آئی تھی اُس میں بھی اور فیض کی شاعری پر صدی سے پہلے فکری اعتبار سے جو چاق و چوبند تجزیاتی مطالعے سامنے آچکے تھے اُن میں بھی یہ ایک بات بڑے تواتر سے کہی گئی تھی کہ فیض اور مجاز کا شعری لہجہ اس طرح کے بلند آہنگ رزمیہ لہجے کی گھن گرج سے خالی رہا جو جوش کی شاعری کا طُرہ امتیاز بن گیا تھا۔ اردو تنقید کی اس طرح کی امیج سازی کو بے توقیر اور بے بنیاد قرار دینے میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور اپنی نہج کے نقاد سلیم احمد نے ایسے مفروضوں کو خاصا بے توقیر کردیا تھا اس عرصے میں خود ترقی پسندوں کی کجی انداز میں لکھی گئی تحریروں نے جو مجاز کی ساغر و جام سے ہمہ وقت کی یاری پر تیر و نشتر کا کام کرتی رہیں وہ بھی مجاز کی شاعری اور اُس کے شعری محاسن کو پس پشت ڈالنے اور مسخ کرنے میں خاصی فعال رہی ہیں۔ مجاز نے اپنے معاشرے کے اس بے توقیر کرنے والے Intolarence والے رویّے سے ملال زدہ اور مجروح ہوکر 30 جنوری 1948 کو ساحر لدھیانوی کے نام ایک طویل خط اپنی مے نوشی کے دفاع میں لکھا تھا ساحر اس زمانے میں لاہور میں ادبی رسالے 'سویرا' کو ایڈٹ کررہے تھے انھوں نے 'سویرا' میں لکھا تھا 'مجاز دو دفعہ دیوانگی کے مراحل طے کرچکے ہیں دن رات شراب پیتے ہیں اور قدم قدم خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہیں' ساحر کے اس غلط تاثر کے خلاف مجاز نے اپنے خط کو شدید نوعیت کے احتجاج سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ان پر دیوانگی کا دورہ نہیں پڑا تھا وہ دوبار Nervous Breakdown کی حالت سے گزرے تھے مجاز کا کہنا تھا جنون کی تشہیر بس شعر کی حد تک ٹھیک ہے مجاز نے وضاحت کرتے ہوئے ساحر کو یاد دلایا تھا ''بمبئی میں جسم و روح و دل سے اس قدر قریب رہنے کے بعد تم مجھے ہر حال میں دیکھ چکے ہو کم بھی پی ہے، زیادہ بھی پی ہے اس رویّے میں کسی غیر معمولی تبدیلی کی خبر تمھیں کیسے ملی؟''

مجاز نے ساحر کو یاد دلاتے ہوئے لکھا 'یادش بخیر احمد آباد کا وہ دن تمھیں یاد ہے جب اسی قسم کے الزام کی بنا پر مجھے پوری 'ادبی تحریک' سے دامن کش ہوجانے کا الٹی میٹم دے دیا گیا تھا اور کرشن نے میری حمایت کرکے اس عتاب ناگہانی سے مجھے بچالیا تھا۔ یہ دوستوں کا عتاب تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ ناجائز اور ناروا عتاب تھا''

جیسا کہ دنیا بھر میں ہوا ہے ایسے حالات میں شاعر اور ادیب کو دماغی توازن کھودینے کے جواز کے ساتھ Intolrent معاشرہ اُسے پاگل خانے کے حوالے کردیتا ہے اردو شاعری کو 'آوارہ' جیسی بڑی نظم اور کئی اعلیٰ غزلیں دینے والا شاعر عشق میں ناکام اور معاشی اعتبار سے دوسروں کا محتاج رہا ایک اچھی، خوش آثار اور خوش اطوار تخلیقی زندگی کی آرزو کرنے والا شاعر معاشرے کی نگاہ میں ملزم، مجرم ٹھہرا، منٹو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے ثقہ معاشرے نے اپنی محفلوں سے دُور رکھا۔ مٹکائیوں اور کنجریوں کی صحبتوں میں متاعِ جسم و جاں کو ارزاں کرنے والے منٹو کو ریڈ لائٹ گلیاروں کا گندہ کیڑا بتادیا گیا۔ مجاز اور منٹو مہذب کہے جانے والے تنگ نظر معاشرے کی عدم رواداری کا نشانہ بنے راندۂ درگاہ ہوئے راہ نجات شراب اور بیسواؤں کے گلیاروں میں ڈھونڈی اور جب رخصت ہوئے تو اپنے عصر کے تخلیقی منظرنامے کو مالا مال کرگئے انھیں کوئی سارتر بھی نہیں ملا جو اپنے عہد کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار آرتو کی طرح مینٹل ہاسپٹل سے اس ضمانت کے ساتھ باہر نکال لیتا کہ آرتو کی طرح مجاز اور منٹو کی Madness ایک سیدھے سادھے آدمی کی Biological دیوانگی نہیں تھی یہ تو وہ تخلیقی دیوانگی تھی جو عدم رواداری معاشرے کی فہم سے باہر تھی کہ چاہے یورپ کا کھلا معاشرہ ہو یا ہندوستان کا حبس اور گھٹن والا معاشرہ کہ جو اپنے فنکاروں سے اُس طرزِ عمل اور طرزِ زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جس میں سرِ مُو انحراف اور انکار کی چھوٹ نہیں ملتی میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی ایک اکیلی نظم 'آوارہ' اردو کی نظمیہ تاریخ میں اپنی دوامیت کا اَن مٹ نقش چھوڑ چکی ہے اس نظم کی تفہیم میں وارث علوی کا مضمون جو ذہن جدید شمارہ 16 میں شامل ہے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ آوارہ بادلیئر کے پیرس اور ایلیٹ کے لندن کی شب گردی کی حامل نظموں کی یاد دلاتی ہے میرے خیال میں مجاز کی نظم صنعتی دور کے جگمگاتے شہروں اور ان کی پر اسرار راتوں کے باطن میں ڈوب کر ایک ایسے آوارہ شب گرد کی ذہنی کشاکش، تذبذب، تشکیک اور تضاد کی شوریدہ آواز بن کر اُبھرتی ہے جس کے لکھے جانے کے کچھ عرصے بعد اس کی گونج امریکی شاعر ایلین گنز برگ کی نظم Howl میں دنیا کو سنائی دی تھی میں نے مجاز کی موت پر دسمبر 1955 میں ایک طویل نظم لکھی تھی جو شاہراہ کے مجاز نمبر میں شامل تھی یہ طویل نظم اس طرح ختم ہوتی ہے

آج پھر اک خبر موت کی ساقیا/ ایک غم اک خلش
اک چُبھن دے گئی/ مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی/
گاتے گاتے غزل کوئی چپ ہوگیا/ پیتے پیتے کوئی
بادہ کش سوگیا/ بزم کی خامشی داستاں بن گئی/
زندگی موت کی میزباں بن گئی

مجاز کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے مجاز کی پوری شاعری تخلیق کی سرمستی اور اُس کے مترنم لہجے اور غنائیت سے معمور محسوس ہوتی ہے مجاز کی غزلیں مجروح اور جذبی کی غزلوں کی طرح آج بھی اپنے ہیئتی بانکپن میں سرسبز اور شاداب لگتی ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی مجاز کی غزلیں سنانے گانے اور ان غزلوں کے منتخب اشعار خاص خاص موقعوں اور کیفیت میں بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں مجاز کو خواہ ہم کسی بھی رومانی لہجے میں پکاریں مجاز نے خود اپنی شاعری کو کس طرح یاد کیا ہے اس تعلق سے دو شعر سنا کر بات ختم کرتا ہوں:

ساری محفل جس پہ جھوم اُٹھی مجاز
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے
مجھے سُنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

اپنے معاشرے سے شکوہ گزار مجاز کی آواز مجھے یہ مصرعہ سناتی ہوئی دور سے آتی اکثر سنائی دیتی ہے:

'اک نشترِ زہرآگیں رکھ کر نزدیک رگِ جاں بھول گئے'

□

Zubair Razvi, C-2AB Complax, 179/8, Zakir Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-25

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P10.jpg 1/1

حکیم عبدالناصر فاروقی

ابوالقاسم زہراوی - ایک عظیم سرجن

طبی اور سائنسی علوم کو فروغ دینے اور انھیں بام عروج پر پہنچانے میں عرب عالموں نے جس محنت اور جانفشانی سے دنیا کو فیضیاب کیا ہے اسے تاریخ کے صفحات میں زریں حروف میں رقم کیا جاتا رہے گا۔ دورِ حاضر کی سائنسی ترقیات میں ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف مغربی مورخین نے کھلے دل سے کیا ہے، بالخصوص علم طب میں ان کے انکشافات، ایجادات اور نظریات کو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان سائنسدانوں میں بہت سے نام ایسے ہیں جنھوں نے اپنے حیرت انگیز کارناموں کی وجہ سے شہرت دوام حاصل کی۔ ان میں حساب اور الجبرا میں الخوارزمی (م950)، علم المناظر میں حنین بن اسحاق (م873) اور ابن الہیثم (م1040)، فلسفے میں الکندی (م887)، الفارابی (م950) اور ابن طفیل (م 1185) اور طب میں علی بن عباس (م 994)، محمد بن زکریا رازی (م 926)، ابن سینا (م 1037)، زہراوی (م 1013)، ابن وافد (م 1070)، البیرونی (م 1047)، ابن البیطار (م 1248)، اور ابن نفیس (م1288) جیسی شہرہ آفاق ہستیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ بات قابل فخر ہے کہ ان بزرگوں نے جس طرح علوم کی دیگر شاخوں میں اپنے کمالات و ایجادات سے پوری دنیا کی رہنمائی کی تھی اسی طرح فن جراحت کو بھی بلندی کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں آج موجودہ سرجری اپنی تمام تر ترقیوں اور معجز نمائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج کل آپریشن تھیٹر میں قطع و برید کے لیے جو جراحی آلات استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر وہی ہیں جو ابوالقاسم زہراوی کے ذریعے تیار کردہ آلات کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔ جس طرح ابن سینا، رازی اور ابن نفیس وغیرہ نے علم طب کو ایک بلند مقام عطا کیا تھا اسی طرح ابوالقاسم زہراوی اور دیگر اطبا نے فن جراحت کو عروج بخشا تھا اور اس میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ آج بھی دنیائے طب محو حیرت ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں علم الجراحت جیسے اہم شعبوں میں جو بھی ترقی حاصل ہوئی ہے، درحقیقت اس میں ان عرب سرجنوں کی کاوشوں کا بھی بڑا دخل ہے، جنھوں نے وسائل کی عدم فراہمی کے باوجود محض اپنی فنی بصیرت اور قابلیت سے فن جراحت کے ایسے پیچیدہ مسائل سے بحث کی ہے جو آج بھی ایک معمہ بنے ہوئے ہیں۔

ان عرب سرجنوں میں ابوالقاسم زہراوی کا مقام سب سے بلند ہے جو فن جراحی میں یکتائے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ بعض اعمال جراحی کا موجد بھی تھا۔ اس نے آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'التصریف لمن عجز عن التالیف' میں ہر قسم کے جراحی امراض اور ان کے عملیات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے اور اس سلسلے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے فن پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ یہ کتاب پانچ چھ سو سال تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں جزوِ نصاب رہی ہے اور موجودہ عملیات جراحی کے لیے بنیاد بنی ہے۔

3/21/2018 P12.jpg (1612×2200)

ابوالقاسم زہراوی جسے یورپ میں تعصب کی بنا پر ابوالکیس (Abulcasis) اور البوکیس وغیرہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اندلس میں قرطبہ کے نزدیک زہرا نامی شہر میں پیدا ہوا، اسی وجہ سے زہراوی کہلایا گیا۔ قرطبہ اس زمانہ میں علوم وفنون کا ایک اہم مرکز تھا۔ مشہور طبی مورخ ابن ابی اصیبعہ (م 1270) نے اس کا نام خلف بن عباس الزہراوی لکھا ہے اور اسے ایک ماہر جراح ہونے کے ساتھ ہی ادویہ مفردہ و مرکبہ کا عالم بھی بتایا ہے۔ اس کے آبا واجداد مدینہ منورہ سے آئے تھے۔ اس کی تاریخ وسن پیدائش کے بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ یہ عبدالرحمٰن سوم اور المستنصر کا درباری طبیب اور قرطبہ کے شاہی اسپتال میں چیف سرجن کے عہدہ پر فائز تھا۔ اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس نے ستتر (77) سال کی عمر میں 404 ہجری/1013 عیسوی میں وفات پائی۔

زہراوی کو ابوالجراحت (Father of Surgery) اور امام الجراحت جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ فن جراحت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا اور اس فن پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس نے عرصہ دراز تک یوروپین طلبا کو علمی و عملی جراحی سکھائی تھی۔ اس نے اپنی کتاب 'التصریف' کے 30ویں مقالے میں جن اعمال جراحیہ کا ذکر کیا ہے وہ زمانہ حال کے عملیات سے بہت حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

ڈارلینڈ اپنی لغت میں زہراوی کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''جراحیات کا سب سے بڑا مشہور عربی مصنف، کہا جاتا ہے کہ اس نے قرطبہ میں مطب کیا اور 1110 کے قریب اس کا انتقال ہوا۔ اس نے معالجات اور جراحیات کے موضوع پر ایک بہت ہی ضخیم کتاب لکھی ہے جو بیس ابواب پر مشتمل ہے اور جس کا نام 'التصریف' ہے۔

فرانسیسی مورخ گستاؤلیبان (Gustav Leban) نے اپنی کتاب 'تمدن عرب' میں لکھا ہے:

''عربوں میں سب سے بڑا جراح قرطبہ کا ابوالقاسم ہے، جس نے 1107 میں وفات پائی۔ اس نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کیے جن کی تصاویر اس کی کتابوں میں درج ہیں۔''

مشہور انگریز مورخ ڈونالڈ کیمپبل نے بھی زہراوی کے بارے میں اسی طرح کے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اس کی تصنیف کو معیاری اور بلند مرتبہ بتایا ہے۔

رازی کی طرح زہراوی نے بھی زخموں میں ٹانکے لگانے کے لیے جانوروں کی آنت کا استعمال کیا جس کا اعتراف مغربی ماہرین طب نے کیا ہے۔ آج بھی زخموں کی سلائی کے لیے یہی طریقہ رائج ہے جو ہمیں زہراوی کے دور جراحی کی یاد دلاتا ہے۔ زہراوی نے جنگ کے دوران لگنے والے زخموں اور چوٹوں کے علاج پر بھی روشنی ڈالی ہے اور گردن، سانس کی نالی، پھیپھڑے اور آنتوں کی جراحت وغیرہ کا علاج بہت واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ زہراوی نے آپریشن کے اصول، قواعد وضوابط، خطرات اور اس کے بہترین ومناسب وقت کا تعین کیا۔

یہ بات مبالغہ آرائی سے خالی ہے کہ زہراوی اور قدیم اطبا کے وضع کردہ اصول ستہ پر ہی آج کی ترقی یافتہ سرجری کی بنیاد قائم ہے۔ یہ اصول ستہ مندرجہ ذیل ہیں:

ابوالقاسم زہراوی

(1) جبر (Coaptation): کسی ٹوٹے ہوئے عضو کو دستکاری سے باندھنا۔
(2) رد (Reduction): اکھڑی ہوئی ہڈی کو اس کی جگہ بٹھانا۔
(3) بط (Incision): شگاف دینا یا نشتر لگانا۔
(4) قطع یا بتر (Excision or amputation): کسی عضو کو کاٹنا۔
(5) کئی (Cauterization): لوہا گرم کر کے کسی عضو کو داغنا۔
(6) خیاطت (Suturation): زخم کو سینا یا ٹانکے لگانا۔

'معروف مسلم سائنسداں' میں زہراوی کی جراحی دریافتیں بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

''آج ہمیں صرف یہ علم ہے کہ سولہویں صدی کے فرانسیسی جراح Ambrose Pare نے سب سے پہلے شریانوں کا خون بند کرنے اور زخموں کو ٹانکے لگانے کا طریقہ دریافت کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ زہراوی نے اس سے بہت پہلے کٹی ہوئی شریانوں کا خون بند کرنے کے لیے انھیں باندھنے کا طریقہ بتایا تھا اور زخموں میں ٹانکے لگانے کے لیے بہت سی قسموں کے دھاگے اور تانتیں بھی اسی نے متعارف کرائی تھیں۔''

زہراوی نے سب سے پہلے کان کے اندر کے پردے کا صحیح طور پر پتہ لگایا۔ وہ استسقاء الراس (Hydrocephalus) کے بارے میں اپنے کلینکی مشاہدہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ میں نے ایک ایسا بچہ دیکھا ہے جس کا سر نہایت خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا اور اس کی پیشانی اور سر کے اطراف اس قدر نمایاں ہو گئے تھے کہ جسم اس خوفناک سر کو اوپر اٹھائے رکھنے سے قاصر تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رطوبت بڑھتی گئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اس نے اس مرض کے آپریشن کا طریقہ بھی تحریر کیا ہے۔

زہراوی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے آلات جراحی کو دھاردار بنانے اور صفائی پیدا کرنے کے لیے پہلے کاغذ پر آلات کی تصویریں بنائیں اور پھر ہوشیار کاریگروں سے ویسے ہی آلات تیار کرائے۔ فولاد بھی اعلیٰ قسم کے استعمال کیے گئے تھے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ کارآمد ثابت ہوں۔

زہراوی کو ماہر امراض عظام (Orthopaedic Surgeon) کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل ہے۔ اس نے ہڈیوں کے ٹوٹنے کی تقسیم مفرد (Simple) مرکب (Compound) اور پیچیدہ (Complicated) وغیرہ میں کی تھی۔ موجودہ دور میں بھی ہڈیوں کے ٹوٹنے اور جوڑنے کی یہی تقسیم کی جاتی ہے۔ زہراوی نے ہڈیوں کے ٹوٹنے اور جوڑنے کے باب میں جو مقدمہ لکھا ہے، اس سے اس باکمال سرجن کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے:

''اس بات کا دعویٰ جاہل اطبا اور عوام بہت کرتے ہیں لیکن انھوں نے نہ کبھی کچھ پڑھا اور نہ ہی قدما کی کتاب موجود ہے۔ اس لیے یہ فن ہمارے دور میں معدوم ہو گیا۔ میں اس کو قدما کی کتابوں کے وسیع مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر لکھتا ہوں۔ میں نے اس کو بہت سمجھنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ میں نے اس بات کو معلوم کر لیا اور تمام عمر اس کے متعلق تجربہ کرتا رہا۔

زہراوی نے سب سے پہلے عظام العانہ (Pelvis bones) کے فریکچر کا علاج دریافت کیا، نیز دیگر مقامات کی ہڈیوں کے کسور وخلوع (Fractures and dislocations) کو درست کرنے کا جو طریقہ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مخصوص فن میں بھی دستگاہ

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P12.jpg 1/1

3/21/2018 P13.jpg (1635×2200)

رکھتا تھا۔ اس نے کندھے کے جوڑ کے بار بار اکھڑنے کے علاج میں مشورہ دیا ہے کہ ایسی حالت میں جوڑ کو بے حرکت کر دیا جائے۔ جدید طریقۂ علاج میں A-O Splint کا استعمال اسی مقصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ کندھے کے جوڑ کے اکھڑنے کی صورت میں اسے صحیح مقام پر بٹھانے کے لیے اس نے جس طریقے کو بیان کیا ہے اسے آج Kocher's Method کہا جاتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عضلہ تحت الکتف (Subscapulasis muscle) کھنچ جائے تا کہ اکھڑا جوڑ اپنے مقام پر واپس آجائے جبائر یعنی وہ تختیاں جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر باندھی جاتی ہیں ان کی بہت سی شکلیں بھی زہراوی نے اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اعمال اور کسر و خلع کو درست کرنے کی بہت سی ترکیبیں اس نے بتائی ہیں۔

زہراوی نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے لیے ایک خاص قسم کے پلاسٹر کو ایجاد کیا تھا جو آٹے کی گرد میں انڈے کی سفیدی ملا کر ایک گاڑھے لیپ کی شکل میں تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی بدلی ہوئی شکل 'پلاسٹر آف پیرس' آج بھی مستعمل ہے۔

عورتوں اور بچوں میں اس کا لیپ زہراوی نے بہت مفید بتایا ہے۔ ہنسلی اور بازو کی ہڈی کے فریکچر میں اس کا استعمال بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ بات قابل تعجب ہے کہ تھومس گیل نے 1564 میں اس قسم کے لیپ کو اپنے مریضوں پر استعمال کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کوپر اور فرانسیسی سرجن بیرن لیرے نے بھی اسی ترکیب کو اختیار کیا جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

علم القابلہ اور فن ولادت (Midwifery) میں بھی زہراوی کو کافی مہارت حاصل تھی۔ اس نے مردہ جنین کو باہر نکالنے کے لیے قوی مراہم استعمال کرنے کے بعد آپریشن کا سہارا لیا تھا۔ علاوہ ازیں امراض نسواں اور فن قابلہ میں کام آنے والے آلات کی تصویریں بھی اس نے اپنی کتاب میں بنائی ہیں۔ معمولی ردّ و بدل کے ساتھ آج بھی یہی آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس نے اعمال قبالت کے ذیل میں اس مخصوص وضع کو بھی بیان کیا ہے جسے (Walcher's Position) کہا جاتا ہے جس میں مریضہ پشت پر اس طرح لیٹی رہتی ہے کہ اس کے سرین میز کے کنارے کے قریب ہوتے ہیں اور دونوں ٹانگیں لٹکی رہتی ہیں۔

زہراوی نے آنکھوں کے نازک سے نازک آپریشن بڑے کامیاب انداز سے انجام دیے تھے۔ نزول الماء (Cataract) کے عملیہ کو اس نے جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ اس کی عملی جراحت کا بین ثبوت ہے۔ دانتوں کے ہلنے، ڈھیلا کرنے اور انھیں نکالنے کے لیے بھی اس نے آلات وضع کیے اور دانتوں کو کسنے کے لیے سونے اور چاندی کے تاروں کا استعمال بھی اس نے کیا تھا۔ یہ عملیات آج بھی بکثرت انجام دیے جاتے ہیں۔ دانتوں کے امراض اور اس کی جراحی کے وہ تمام اصول جو آج جدید طریقۂ علاج کی اساس تصور کیے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ڈینٹل سرجری کا پہلا باقاعدہ معلم زہراوی ہے۔

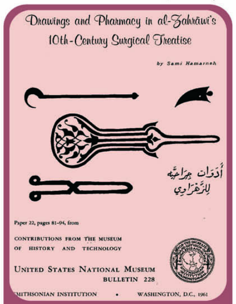

ابوالقاسم زہراوی کے ایجاد کردہ آلات جراحت

زہراوی نے عانہ (Pelvis) اور غدہ منی (Prostate gland) کے آپریشن کے دوران اختیار کی جانے والی اس وضع کو بھی بیان کیا ہے جسے آج Trendelenburg position کا نام دیا گیا ہے جس میں مریض کے سرہانہ کو نیچے کر کے کندھوں کو بیلٹ سے اپنی جگہ مضبوطی سے قائم کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پائنتی کو بھی اس طرح نیچے کر دیا جاتا ہے کہ ٹانگیں میز کے کنارے پر گھٹنوں سے نیچے لٹکی رہتی ہیں۔

عمل کیّ (Cauterization) کے بارے میں جس قدر تفصیل زہراوی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے اس سے پہلے کسی نے نہیں بیان کی چنانچہ 56 ابواب میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ آج کل بجلی سے داغنے کا عمل چھوٹے بڑے اسپتالوں میں مختلف امراض کے علاج کی غرض سے بکثرت انجام دیا جاتا ہے یعنی آج کل ریڈیم اور الٹراوائلٹ ریز اور بجلی سے جو علاج کیا جاتا ہے وہ اسی سے اخذ کیا گیا ہے اور اس کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس نے قیلۃ الماء (hydrocele) اور حصاۃ المثانہ (Vesical calculus) کے آپریشن کو بھی بہت خوبی سے بیان کیا ہے جو موجودہ سرجری کی کتابوں سے بعض مقامات پر بہت بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مثانہ، بول الدم (haematuria) اور قیح الدم (Pyeuria) جیسے مرضی حالات میں مثانہ کو دھونے اور صاف کرنے کے لیے سرنج کا استعمال بھی زہراوی کی دین ہے۔ فالج کی وہ قسم جو حرام مغز پر چوٹ لگنے سے واقع ہوتی ہے اس کا ذکر بھی زہراوی نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ اس نے التہاب اوردہ (Phlebitis)، التہاب مسخ العظم (Osteomyelitis) ورید دوالی (Varicose Vein) کا آپریشن اور عروق کو باندھنے کا طریقہ، مسوں کو نکالنے اور قطع کرنے کے لیے ہک کا استعمال، فرج (Vagina) کی دیوار پر شگاف لگانا، خون کی خرابیاں، استسقاء الراس، خنازیر کا آپریشن، نرخرے میں شگاف دینا، قیلۃ الحلقوم (Thryoid) کا آپریشن، پستانوں کو قطع کرنا، ہڈیوں کو چھیلنا اور تراشنا وغیرہ کے طریقوں کو بالتفصیل اپنی کتاب میں بیان کیا ہے اور تقریباً دو سو آلات جراحی کی تصاویر بھی دی ہیں۔ ان آلات کی مدد سے موجودہ سرجری کے آلات تیار کیے گئے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں شعبہ جراحی کا خصوصی مضمون نگار زہراوی کے کمال فن کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

''اس نے مریض قیلۃ الحلقوم (goitre) پر عمل جراحی کرنا نامناسب قرار دیا اور عمل فتح القصبہ (Tracheotomy) کو تامل کے ساتھ محض نادر حالات میں جائز سمجھا۔ مرض سرطان میں جراحی مداخلت کرنے سے قطعی اجتناب کیا اور بڑے قسم کے خراج (Abscess) کو چیرنے کے لیے افراغ تدریجی (Slow drainage) کی ترکیب ایجاد کی جس میں پیپ یکلخت خارج نہیں کی جاتی۔''

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ابوالقاسم زہراوی نے فن جراحت میں مہارت تامہ حاصل کر رکھی تھی اور ہر قسم کے آپریشن وہ خود ہی انجام دیتا تھا۔ اس کی اس عملی جراحت اور مہارت سے قدیم سرجری کی عظمت و رفعت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک انصاف پسند مورخ کبھی بھی اس کی ان خدمات سے انحراف نہیں کر سکتا۔

◘

Dr. Abdul Nasir, Azad Apartment,
RZ-2541/28, Tughlaqabad Ext. New Delhi - 110019

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P13.jpg 1/1

3/21/2018 P14.jpg (1580×2200)

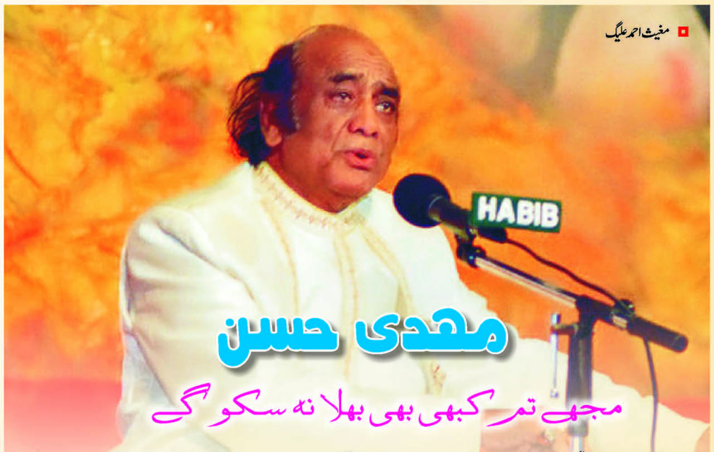

مغیث احمد علیگ

مہدی حسن

مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے

خبریں اگر سچی ہوں تو اچھی لگتی ہیں۔ کاش! مہدی حسن کے انتقال کی خبر سچی نہ ہوتی اور ایک بار پھر کوئی آصف مہدی اس کی تردید کردیتا کہ ابھی تو وہ زیر علاج ہیں۔

جی ہاں! میں بات کررہا ہوں اس مہدی حسن کی جن کی گلوکاری کبھی لفظوں اور سروں سے اٹھکیلیاں کیا کرتی تھی اور محفل میں موجود ان کے پرستار ان کی آواز کی اٹھان، لے اور سوز پر جھوم جھوم اٹھتے تھے۔ ان کی آواز کا جادو کوئی 5 دہائیوں تک مقبولیت کے ایوانوں میں سر چڑھ کر بولتا رہا۔ کئی دہائیوں تک اپنی خوبصورت آواز سے دنیائے غزل کے لاکھوں شائقین کو محظوظ کرنے والے شہرۂ آفاق، شہنشاہ غزل مہدی حسن کے انتقال کی خبر ان کی شہرت کی مانند جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل گئی اور ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ مہدی حسن ایک طویل عرصے سے فالج کے عارضہ کے ساتھ سینے، پھیپھڑوں اور مثانے کے مختلف امراض میں مبتلا چلے آرہے تھے اور کراچی کے آغا خان پرائیوٹ اسپتال میں زیر علاج تھے۔ گزشتہ ماہ سانس کی تکلیف کے باعث انھیں اسپتال میں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ جہاں انھوں نے آخری سانسیں لی۔ ابھی گزشتہ ہی ماہ راجستھان حکومت نے مہدی حسن کے علاج کے لیے ہندوستانی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا سے درخواست کی تھی کہ انھیں اور ان کے اہل خانہ کو ہندوستان آنے کے لیے ویزا دیا جائے لیکن افسوس کہ اس ساعت کے آنے سے قبل وقت موعود نے دستک دے دی۔ 13 جون 2012 کو صبح 9:30 بجے کے قریب آغا خان اسپتال میں زیر علاج مہدی حسن کی طبیعت اچانک بگڑنی شروع ہوگئی اور بالآخر 12:15 بجے گائیکی کے میدان کی بازی مارنے والا یہ شخص اپنی زندگی کی بازی نہ جیت سکا۔

مہدی حسن اس شخص کا نام ہے جو غزل گائیکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی اساتذہ کا کلام بھی گایا اور ان کی گائی ہوئی بیشتر غزلوں کو لوگوں نے پسند کیا، بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ متعدد شعرا اور ان کی غزلوں کو شہرت دوام بخشنے میں مہدی حسن کی آواز کا بہت اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے تقریباً ہر راگ میں غزلیں گائیں اور غزل گائیکی کو اس مقام تک پہنچا دیا جہاں اس نے موسیقی کے ایک گھرانے کی حیثیت اختیار کرلی۔ انھیں غزلوں کے انتخاب پر بھی داد دی جاتی ہے۔ مہدی حسن کو ہزاروں ایوارڈ ملے مگر ان کے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ وہ بلاشرکت غیر دنیائے غزل کے شہنشاہ تسلیم کیے گئے۔ انھیں خود بھی یہ یاد نہیں کہ انھیں کب سے شہنشاہ غزل کہا جانے لگا۔ ہاں ان کا اتنا ضرور کہنا تھا کہ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ میری گائی ہوئی زیادہ تر غزلیں پسند کی گئیں۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اپنی محنت اور ریاضت کا ثمرہ نہیں بلکہ اللہ کی کرم فرمائی قرار دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی پرسوز آواز اور غزل گائیکی کے مثالی اسالیب سے موسیقی کے شائقین کی ایک پوری نسل کو اپنا دیوانہ بنا کر رکھا۔

مہدی حسن خان 18 جولائی 1927 کو ہندوستان کی ریاست راجستھان کے ضلع جھن جھنوں کے گاؤں لونا میں موسیقاروں کے ایک روایتی خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ خود کو موسیقی کے کلونت گھرانے کی 16 ویں نسل قرار دیتے تھے۔ انھوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد استاد عظیم خان اور چچا استاد اسماعیل خان سے حاصل کی۔ یہ دونوں دھروپد کے روایتی گلوکار تھے۔ مہدی حسن نے اوائل عمری سے ہی گائیکی کا آغاز کردیا اور ایک محنتی طالب علم کی طرح موسیقی کے اسرار و رموز سے آشنائی حاصل کی اور عمر کے کسی حصے میں بھی ریاض سے گریز نہیں کیا۔ 1935 میں انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اس وقت کے غیر منقسم پنجاب میں فاضل کا بنگلہ میں منعقد ایک پروگرام میں حصہ لیا۔ 1947 میں پاکستان کے قیام کے بعد 20 سالہ مہدی حسن اپنے اہل خانہ کے ساتھ راجستھان سے کراچی منتقل ہوگئے، جہاں ابتدا میں انھیں شدید مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، جس کے لیے انھوں نے نہ صرف محنت اور مزدوری کی بلکہ سائیکل پنکچر بنانے کی دکان پر بھی کام کیا اور میکینک کے کام میں مہارت حاصل کی۔ پہلے موٹر میکینک پھر اس کے بعد ٹریکٹر کے میکینک بن

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P14.jpg 1/1

3/21/2018 P15.jpg (1568×2200)

گئے۔ کسب معاش کی سخت کوشیوں کے باوجود بھی وہ یک لمحے کے لیے موسیقی کے خیال سے غافل نہیں رہے۔ وہ بچپن سے ہی گلوکاری کے اسرار و رموز سے بحسن وخوبی آشنا تھے اور ہر حال میں ریاض کر کے اپنے اس فن کو صیقل کرتے رہے۔

50 کی دہائی ان کے لیے فال نیک ثابت ہوئی جب ان کا تعارف ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسر سلیم گیلانی سے ہوا۔ جوہری نے اس ہیرے کی اصلیت کو پہچان لیا۔ چنانچہ دھروپد، خیال، ٹھمری اور دادرے کی تنگنائے سے نکل کر یہ ہیرا غزل کی پرفضا وادی میں آنکلا جہاں اس کی صلاحیتوں کو مزید جلا ملی۔ 60 کی دہائی میں ان کے ذریعے گائی ہوئی فیض احمد فیض کی غزل 'گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے' اتنی مقبول ہوئی کہ ہر گلی کوچے میں گونجنے لگی۔

5 عشروں پر محیط اپنے کیریئر کے دوران انھوں نے 25 ہزار سے زائد فلمی اور غیر فلمی گیتوں اور غزلوں کو اپنی آواز سے سجایا، سنوارا اور پروان چڑھایا اور اپنی اس کارکردگی کے صلے میں اعلیٰ اعزازات سے سرفراز ہوئے۔ وہ فلمی موسیقار جوان کے فن کو ریڈیو کی گائیکی کہہ کر دامن چھڑاتے رہے تھے، سکہ رائج الوقت سمجھ کر ان کے گرد منڈلانے لگے۔ مہدی حسن کے مشہور البم میں ہنا ان سے، نذرانہ، انداز مستانہ، دل جو روتا ہے، کھلی جو آنکھ، صدائے عشق، سرحدیں، طرز اور نقش فریادی شامل ہیں۔ ان کے گائے ہوئے فلمی اور غیر فلمی گانوں اور غزلوں کی تقریباً 250 ویب سائٹس ہیں، جن پر ان کی آواز میں غزلوں اور گانوں کے سی ڈیز اور ان کی محافل موسیقی کے ویڈیوز بھی شامل ہیں۔ ان کی گائیکی، شخصیت اور ان کی آواز پر اب تک ہزاروں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔

مہدی حسن کو اپنی محنت کا پہلا ثمرہ اس وقت ملا جب انھیں 1957 میں ریڈیو پاکستان کے لیے گانے کا موقع دیا گیا۔ اس وقت استاد برکت علی خان، بیگم اختر اور مختار بیگم گلوکاری کی دنیا میں بڑے نام تھے، لیکن رقابت اور فنی چشمک سے بے نیاز مہدی حسن اپنی محنت اور لگن میں مصروف رہے اور ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن غزل کے شہنشاہ بن گئے۔ غزل گائیکی میں ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد انعامات سے نوازا گیا۔ حکومت پاکستان نے انھیں 'تمغۂ امتیاز' اور 'ہلال امتیاز' جیسے اہم اعزازات سے نوازا جب کہ حکومت نیپال نے انھیں 'گورکھا دکشنا باہو' کے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ گزشتہ دنوں وہ دبئی میں بھی ایوارڈ حاصل کرنے گئے تھے۔

60 اور 70 کی دہائیوں میں مہدی حسن پاکستان کے معروف ترین فلمی گائیک بن گئے، ان کا شمار عوام کے پسندیدہ فلمی گلوکاروں میں ہونے لگا اور سنتوش کمار، درپن، وحید مراد اور محمد علی سے لے کر ندیم اور شاہد تک ہر ایک ہیرو نے مہدی حسن کے گائے ہوئے گیتوں کی خوشہ چینی کی۔

سلامت علی خان نے پہلی بار ہندوستانی عوام کو یہ مژدہ سنایا کہ پاکستان میں ایک مہدی حسن نامی شخص ہے جو غزل نواز اور ہندوستان ہی کا نقش فریادی ہے۔ چنانچہ ہجرت کے بعد 1977 میں پہلی بار مہدی حسن ہندوستان آئے اور دہلی کے ماڈرن اسکول میں اپنا پروگرام پیش کیا۔ انھوں نے 2 ہندی فلموں 'مرگیہ ترشنا' اور 'دھن' میں بھی غزلیں گائی تھیں مگر دھن ریلیز نہیں ہوسکی۔

80 کی دہائی میں انھوں نے اپنا بیشتر وقت یوروپ اور امریکہ کے دوروں میں گزارا لیکن بعد میں علالت کی وجہ سے انھوں نے گلوکاری کا سلسلہ ترک کردیا، تاہم صحت بحال ہونے کے بعد انھوں نے لتا منگیشکر کے ساتھ 'ترا ملنا' گایا جسے اکتوبر 2010 میں 'سرحدیں' البم میں جاری کیا گیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان کا آخری نغمہ تھا۔

مہدی حسن کی حیثیت ایک غزل گائیک کے طور پر مستحکم رہی اور اسی حیثیت میں انھوں نے برصغیر کے ملکوں کا کئی بار دورہ کیا۔ ہندوستان سے لے کر پاکستان کے سیاسی اور غیر سیاسی، اکیڈمک اور کلچرل ہر میدان کی محفلوں اور ان کے زعما کے دلوں کی دھڑکن بنے رہے۔ مہدی حسن کی اپنے فن میں مہارت کا اندازہ لتا منگیشکر کے اس خراج تحسین سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'مہدی حسن کے گلے میں تو بھگوان بولتے ہیں'۔ نیپال کے شاہ وریندرا ان کے احترام میں کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور فخر سے کہتے تھے کہ انھیں مہدی حسن کی کئی غزلیں زبانی یاد ہیں۔

پاکستان کے صدر ایوب، صدر ضیاء الحق اور صدر پرویز مشرف بھی ان کے مداح تھے اور انھیں اعلیٰ ترین سول اعزازات سے بھی نواز چکے تھے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کے لیے سب سے بڑا اعزاز تو وہ بے پناہ مقبولیت اور محبت تھی جو عوام کے دربار سے انھیں حاصل تھی۔ ہندوپاک کے علاوہ جہاں جہاں بھی اردو اور شیدایان اردو نے غزل کی محفلیں سجائیں، وہاں مہدی حسن ضرور یاد کیے گئے۔

ہمارے بزرگ جب کسی کو دعائیں دیتے ہیں تو کہتے ہیں ''دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو'' ایسا لگتا ہے کہ مہدی حسن کو کسی ایسے بزرگ کی دعا نصیب ہوئی تھی اور وہ اس حیثیت سے بھی غنی تھے کہ اللہ نے انھیں کثیر اولادیں عنایت کی تھی۔ ان کے کل 14 بچے ہیں جن میں سے 9 بیٹے اور 5 بیٹیاں ہیں۔ اپنے بیٹوں آصف اور کامران کے علاوہ انھوں نے پوتوں کو بھی موسیقی کی تعلیم دی اور آخر عمر میں ان کا شجرہ اس قدر پھلا پھولا کہ انھوں نے پردادا بننے کا اعزاز بھی حاصل کرلیا اور اپنے پڑپوتوں کے سر پہ بھی دست شفقت رکھنے کا لطف اٹھایا۔

ان کے شاگردوں میں سب سے پہلے پرویز مہدی نے نام پیدا کیا اور تمام عمر اپنے اُستاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے۔ بعد میں غلام عباس، سلامت علی، آصف جاوید اور طلعت عزیز جیسے ہونہار شاگردوں نے اُن کی طرز گائیکی کو زندہ رکھا۔ ملکہ ترنم نور جہاں کا کہنا تھا کہ ایسی آواز صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتی ہے، یہ بات تھی کہ یہ جملہ خود ان کی شخصیت پر بھی اتنا ہی صادق آتا ہے۔ مہدی حسن کو اس عہد کے بہترین غزل گو کے طور پر جانا جاتا ہے، ان کی گائی ہوئی چند مقبول غزلیں درج ذیل ہیں:

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے، اس کے بعد آئے جو عذاب آئے
اب کہ ہم بچھڑیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
اپنوں نے غم دیا تو یاد آ گیا
چلتے ہو تو چمن کو چلیے
چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں
اک ستم اور مری جان ابھی جاں باقی ہے
گلوں میں رنگ بھرے بادنو بہار چلے
یہ تیرا نازک بدن ہے یا کوئی مہکا گلاب
اک بار چلے آؤ پھر آ کے چلے جانا
مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو
مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے
زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
رفتہ رفتہ وہ میری تسکیں کا ساماں ہو گئے وغیرہ

آج مہدی حسن جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہ سہی لیکن اپنی مسحور کن آواز کے ذریعے ہمیشہ محفلوں کو جلو اور ہمارے دلوں کو جلا بخشتے رہیں گے۔

■

Moghees Ahmad Alig, B-58,Mujeeb Bagh
Jamia Nagar, New Delhi-25

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P15.jpg 1/1

اجمل سعید

پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقت

مسائل اور امکانات

'تعلیم' اور 'روزگار' کسی بھی شخص کی ایسی دو بنیادی ضرورتیں ہیں جن کے بغیر وہ ایک بہتر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ الگ الگ دیکھا جائے تو تعلیم اور روزگار دونوں کی بہت سی شکلیں ہیں، لیکن جب انہیں ایک دوسرے سے جوڑا جاتا ہے تو آج اکیسویں صدی میں بھی تعلیم سے صرف اسکول کالج میں ملنے والی تعلیم مراد لی جاتی ہے اور روزگار کے معنی کسی سرکاری محکمے یا پرائیویٹ کمپنی کی نوکری مل جانے تک محدود کردیے جاتے ہیں۔ ووکیشنل ایجوکیشن یا پیشہ ورانہ تعلیم کا تصور تقریباً ایک صدی پرانا ہے لیکن روایتی دست کاریوں اور خاندان در خاندان چلے آرہے ہنر اور کاریگری کے شعبوں میں تربیت دینے یا دست کار اور کاریگر کی صلاحیت و لیاقت کی درجہ بندی کرنے کا نظریہ نیا ہے جس کی طرف مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل بے حد سنجیدگی سے کام کررہی ہے۔ بنارس کی ساڑھیاں ہوں یا مرادآباد میں پیتل کے ظروف پر نقاشی کا کام۔ فیروز آباد میں چوڑی بننے کی صنعت ہو یا خورجہ میں چینی کے برتن بنانے کا کام، جام نگر میں 'باندھنی' کے نام سے ہونے والا کپڑوں کی آرٹسٹک رنگائی کا کام ہو یا سہارنپور میں چوبی نقاشی Wood Carving، بھدوھی میں قالین سازی ہو یا لکھنؤ میں چکن کام، ملک کے مختلف صوبوں اور شہروں میں روایتی کاروبار آج بھی جاری ہیں اور سماج کے پچھڑے طبقوں، خاص طور سے مسلمانوں میں لاکھوں لوگ ان سے روزگار پارہے ہیں۔ لیکن بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے مطابق ان کاریگروں کے ہنر کو مزید چمکانے، انہیں مواقع و سہولتیں مہیا کرانے، اور ان کے فن کی درجہ بندی کرکے انہیں ان گھریلو صنعتوں کی توسیع کے عمل سے جوڑنے کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت کیا کررہی ہے؟ گجرات کے جام نگر اور اترپردیش کے سہارنپور اور مرادآباد میں روایتی صنعتوں کا کیا حال ہے؟ مستقبل میں کس طرح کے امکانات ہیں؟ زیرنظر 'کور اسٹوری' میں ان سبھی سوالوں کا جواب ڈھونڈھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (ادارہ)

3/21/2018 P17.jpg (1594×2200)

ہر کسی کی نگاہ میں تعلیم کا اپنا مقصد اور اپنا ایک مفہوم ہوتا ہے جسے وہ ذہن میں رکھتے ہوئے تعلیم کی طرف راغب ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص اپنے بچے کو جس مقصد سے تعلیم دلوا رہا ہے وہی مقصد اُسی بچے کی جماعت میں پڑھنے والے دوسرے طالب علم یا اُس کے والدین کا ہو۔ خواہ کچھ بھی ہو تعلیم کا مقصد جہاں لوگوں میں جانکاری منتقل کرنا ہے وہیں انسان کو اس لائق بھی بنانا ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح طالب علم کے مستقبل کو تابناک بنا سکے۔ چاہے روایتی تعلیم ہو یا پیشہ ورانہ تعلیم۔ اس کا مقصد بچے کو خود کفیل بناتے ہوئے اس کے مستقبل کو سنوارنا ہوتا ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام ہندوستان میں کوئی خاص نیا نہیں ہے۔ تقریباً 200 سال قبل انگریزوں نے اس نظامِ تعلیم کی بنیاد محض ہندوستان میں حکومت کرنے کی غرض سے ڈالی تھی جو کہ فرنگیوں کے مقاصد کو تو پورا کرتی تھی پر ہندوستانیوں کے لیے غیر موزوں تھی۔ کیونکہ ہم ہندوستانی شروع سے ہی دست کاری اور ہنرمندی کے ایسے کاموں سے جڑے ہوئے تھے جن کے لیے کتابی پڑھائی غیر ضروری تھی۔ اس کے مقصد کو حل کرنے کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم کی سخت ضرورت تھی ۔ اسے ذہن میں رکھتے ہوئے 1937 میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی نے 'بنیادی تعلیم' کے نام سے ایک ایسا نصاب تجویز کیا جس کی بنیاد حرفہ اور دست کاری پر ہی تھی۔ جو کہ بچے کی ہمہ جہت ترقی پر مبنی تھی، جو طالب علم کو دوسرے علوم کی جانکاری کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہر تعلیمی کمیشن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام جو کہ اب روایتی تعلیم کی شکل اختیار کر چکا ہے اسے کسی نہ کسی طرح پیشہ ورانہ تعلیم، جو کبھی روایتی تعلیم ہوا کرتی تھی، سے جوڑا جائے۔ ایک بار پھر

وزارت ہند برائے فروغِ انسانی وسائل اس بات کو بہت شد و مد سے منظر عام پر لائی ہے۔ اور تعلیم کے مقصد کو کتابوں تک محدود نہ رکھتے ہوئے اسے کام کاج سے جوڑ کر پوری طرح سے طفل مرکوز اور بچے کی دلچسپی کے مطابق کرنے میں کوشاں ہے۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وزارت نے National Vocational Education Qualification Framework (NVEQF) کے نام سے ایک پیشہ ورانہ تعلیمی خاکہ پیش کیا ہے جس میں نہ صرف ان صنعتوں کو شامل کیا ہے جن میں باضابطہ طور پر تربیت کا اہتمام ہے بلکہ ایسی صنعتوں کو بھی مین اسٹریم میں لانے کی کوشش کر رہی ہے جن میں آج تک باقاعدہ طور پر تربیت کا کوئی اہتمام نہیں ہے کیونکہ ہندوستان میں ایسا کوئی تعلیمی نظام نہیں ہے جو ایسی صنعتوں سے جڑے فرد کی پہلے سے سیکھی ہوئی صلاحیت کی تصدیق کر سکے۔ حالانکہ وہ کام خود ایک بڑی صنعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں حکومت کی یہ تجویز ہے کہ وہ فرد کے پہلے سے سیکھے ہوئے ہنر کی تصدیق کرتے ہوئے اسے ایسے تعلیمی مواقع فراہم کرے گی جو کہ بین الاقوامی سطح کے ہوں گے۔ جن کی بنیاد پر اسے نہ صرف تعلیم، ہنر، معاش اور سماج میں آگے بڑھنے کا موقع مل سکے گا بلکہ وہ ملک کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کر سکے گا۔ یہ خاکہ اس سمت میں اہم رول ادا کرے گا۔

مغربی بنگال اور ہریانہ میں NVEQF پائلٹ اسٹڈیز چل رہی ہیں۔ جن کے کامیاب تجربے کے بعد اسے پورے ملک میں نافذ کر دیا جائے گا۔

اس طرح کا پیشہ ورانہ تعلیمی خاکہ پہلے سے ہی چین، انگلینڈ، ویلس، جنوبی آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ، فرانس، نیوزی لینڈ، اور آسٹریلیا جیسے دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں نافذ ہے جس کی وجہ سے وہاں کا طالب علم تعلیم حاصل کرنے کے درمیان ہی خود کو ہنر، دست کاری اور دوسرے ایسے کاموں سے منسلک کر لیتا ہے جن کی بنیاد پر تعلیم مکمل کرتے ہی اسے ذریعہ معاش دستیاب ہو جاتا ہے جو کہ اس کے اسکولی نصاب کا حصہ ہوتی ہے۔

مرادآباد کی پیتل صنعت

مرادآباد پیتل صنعت کی وجہ سے تمام دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے یہاں پیتل کے کاروبار کی شروعات افغانستان سے ہجرت کر کے آئے مغلوں نے کی اور یہی یہاں کے پہلے ایکسپورٹر کہلائے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور آج مرادآباد پوری دنیا میں اپنے اس خوبصورت فن سے پہچانا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں ایک بڑی تعداد میں پیتل کے ایکسپورٹر موجود ہیں اگر مرادآباد میں پیتل کے کاروبار کی داغ بیل نہ پڑی ہوتی تو ہمارے اس شہر کا حال بھی دوسرے شہروں جیسا ہوتا۔ مرادآباد ضلع اپنے بڑھتے ہوئے کاروبار کی بنا پر ہی کمشنری بنا ہے۔ پیتل کی تجارت سے نہ صرف یہاں کے لوگوں کو روزگار فراہم ہے بلکہ یہ حکومت ہند کو کروڑوں روپیہ کا زرمبادلہ بھی کما کر دیتا ہے۔ یہاں کی پیتل صنعت ہی یہاں کی خوش حالی کی ضامن ہے اس صنعت سے یہاں کے گھر گھر میں پیتل کا کاروبار ہے۔ کہیں سلّی بن رہی ہے کہیں برتنوں کی ڈھلائی ہو رہی ہے تو کہیں چھلائی و پالش کہیں پروڈکٹس پر رنگ ہو رہا ہے تو کہیں برتنوں پر چاندی چڑھائی جاتی ہے۔ غرضیکہ کسی نہ کسی طور پر ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ہر اس کام سے منسلک ہے۔ سلّی بنانے سے لے کر ڈھلائی، چھلائی، پالش، پلیٹنگ وغیرہ سے گزر کر پیکنگ ہو کر سامان ملک اور بیرون ممالک میں ایکسپورٹ ہوتا ہے۔ اگر حکومت مرادآباد میں توجہ دے اور اس کام کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑ دے اور ضرورت کے مطابق بجلی فراہم کر دے تو مرادآباد کی پیتل صنعت اور فروغ سکتی ہے جس کی وہ حقدار ہے۔

—فیضان علی خان، مرادآباد

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P17.jpg 1/1

اس سمت میں گزشتہ برس قومی اردو کونسل کی میٹنگ میں مرکزی وزیر جناب کپل نے کونسل کو یہ ذمے داری دی تھی کہ وہ اردو کو پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑتے ہوئے ایسے کورسز چلائے جنھیں NVEQF سے جوڑا جاسکے گا جن سے اقلیتوں کو تعلیمی اور معاشی ترقی کا موقع ملے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اقلیتوں کی تعلیم کے لیے وزارت نے قومی نگراں کمیٹی کی بھی تشکیل کی ہے ۔ جس کے تحت پانچ ذیلی کمیٹیاں بھی بنائی گئی ہیں جس میں کونسل کلیدی رول ادا کررہی ہے۔ اس کا مقصد اقلیتی لڑکیوں میں تعلیم کے فروغ اور ان کے لیے اساتذہ کی فراہمی، اقلیتی اکثریت والے علاقوں میں ان کی ضرورت کے مطابق پیشہ ورانہ کورسز کی شروعات اور ان کے لیے اساتذہ کی فراہمی، NVEQF کے مسودے کا جائزہ لے کر اقلیتوں کی تعلیم کے لیے مشورے دینا، اردو زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے انگریزی تعلیم کی فراہمی، خطے اور ضلعی سطح پر اقلیتوں کی تعلیمی ضرورتوں کا خاکہ تیار کرنا اور اقلیتوں سے متعلق اسکیموں پر عمل آوری کی نگرانی کرنا ہے۔ ان اسکیموں سے اردو کو باضابطہ طور پر جوڑنے کے لیے ایک خاکہ تیار کیا جارہا ہے جس سے اقلیتوں کو زبردست فائدہ ہوگا۔

وقت کی ضرورت اور ذمے داریوں کا خیال کرتے ہوئے کونسل نے اس سمت میں قدم بڑھایا ہے اور ایسے اضلاع میں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں ایسی صنعتوں میں ہنرمندی کے کورسز چلانے کا فیصلہ کیا ہے جن میں باضابطہ طور پر تربیت کا اہتمام نہیں ہے۔ اس بات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کونسل نے مرادآباد اور جام نگر میں وفد بھیج کر وہاں کی دست کاریوں کا جائزہ لیا ہے اور اس سمت میں اہم پیش رفت کرتے ہوئے کونسل جلد ہی مرادآباد میں 'پیتل کی سامان سازی' اور جام نگر، گجرات میں باندھنی (Tie-dye) کے کورسز اردو زبان میں شروع کرنے والی ہے۔ جن کو کامیابی کے ساتھ شروع کرنے کے بعد کونسل خورجہ میں چینی کی برتن سازی (Ceramic)، بھدوہی میں قالین سازی اور فیروزآباد میں چوڑی سازی کے کورسز بھی شروع کرے گی۔ کونسل کی اس پہل سے جہاں نہ صرف اردو بولنے والے اقلیتی دست کاروں کو تعلیمی، معاشی اور سماجی طور پر ابھرنے کا موقع ملے گا وہیں اردو کو مختلف پیشوں سے جوڑ کر اُردو کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی۔

جام نگر

گزشتہ دنوں قومی اردو کونسل کی جانب سے مجھے جناب نسیم احمد صاحب (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر) کے ساتھ جام نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم وہاں چل رہے باندھنی اور پیتل کے کام کا جائزہ لینے کے لیے گئے تھے۔ جام نگر جو ایک تاریخی شہر کی حیثیت رکھتا ہے وہ کبھی پیتل نگری کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن آج یہاں دنیا کی سب سے بڑی تیل ریفائنری ہونے کی وجہ سے اسے آئل سٹی آف انڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ پیتل کے کاروبار کے اعتبار سے جام نگر کافی بڑا کاروباری شہر ہے۔ یہاں پیتل کا سامان بنانے والے تقریباً 18000 چھوٹے بڑے کارخانے ہیں۔ یہاں بننے والا پیتل کا سامان مرادآباد میں بننے والے سامان سے مختلف ہے۔ یہاں مشینوں کے ذریعے بجلی کے آلات میں استعمال ہونے والے پیتل کے چھوٹے چھوٹے پرزوں کے ساتھ ساتھ دروازوں اور کھڑکیوں میں لگنے والے خوبصورت ہینڈل اور قبضے بھی بنائے جاتے ہیں۔ ان کارخانوں میں کام کرنے والے مزدروں میں تقریباً 60 فیصد مزدور مسلم اقلیتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

جام نگر باندھنی کے کام کی وجہ سے ملک و بیرون ملک میں بہت مشہور ہے۔ اس صنعت میں کام کرنے والوں میں بھی اکثریت مسلم اقلیتی طبقے کی ہے۔ یہ کام بنیادی طور پر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک تو کپڑوں پر خوبصورت ڈیزائن کے مطابق ان پر چھوٹی چھوٹی گرہ لگانے کا ہے تو دوسرے انھیں رنگنے کا ہے۔ یہ کام وہاں زیادہ تر گھروں میں ہی کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کام نے گھریلو صنعت کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور جام نگر کی کل آمدنی کا 10 فیصد حصہ اسی صنعت سے حاصل ہوتا ہے۔

باندھنی جو کہ ایک ہندوستانی روایتی فن ہے یہ گجرات کے شہر جام نگر کے ساتھ ساتھ 'کچھ' میں بھی کافی بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان میں بھی باندھنی پر اچھا خاصا کام ہوتا ہے۔ لفظ باندھنی سنسکرت کے لفظ 'بندا' سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم باندھنا ہے۔ باندھنی کو 'بندیج'، 'ٹائی ڈائی' اور 'بندنا' بھی کہتے ہیں۔ اس کام میں عموماً زرد، سرخ، سنہرا اور سیاہ رنگوں کا

3/21/2018 P19.jpg (1611×2200)

استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کام کی ایجاد گجرات کے شہر 'کچھ' میں مسلمانوں کے کھتری خاندان نے کی تھی۔ جام نگر میں اس فن کے بہت ہی کامیاب دست کار موجود ہیں جو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ خوبصورت ڈیزائن کے لیڈیز سوٹ اور چادریں رنگتے ہیں جہاں یہ سوٹ اور چادریں اپنی بہترین کاریگری کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول ہوتی جا رہی ہیں وہیں اچھے اور ضرورت کے مطابق دست کار نہ ملنے کی وجہ سے بازار کی ضرورت کو پورا نہیں کر پانے میں، ساتھ ہی ساتھ دن بہ دن دستکاروں کی کمی کی وجہ سے یہ کام بازار سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس فن کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑا جائے اور اس کو محفوظ کیا جائے۔ اس لیے کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ اس فن کو محفوظ کرنے کے لیے جام نگر میں باندھنی فن کا اردو زبان میں کورس شروع کرے گی جسے NVEQF کے تحت جوڑ کر دست کاروں کو upward mobility کا موقع ملے گا اور کام کا تحفظ ہوگا وہیں معاش کے نئے ذرائع پیدا ہوں گے۔

مرادآباد

پیتل نگری کے نام سے جانا جانے والا شہر مرادآباد پورے ہندوستان میں اپنی دست کاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ مجھے پچھلے دنوں جناب نسیم احمد صاحب پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اور جناب آفاق حسین صاحب پرنسل آئیڈیل آئی ٹی آئی نوئیڈا کے ساتھ وہاں جانے کا خوبصورت اتفاق ہوا۔ وہاں جانے کا مقصد وہاں چل رہے 'پیتل کے سامان سازی' کے کام کا جائزہ لینا تھا۔ وہاں ہم نے مختلف تنظیموں اور مختلف کارخانوں کا دورہ کیا۔ پیتل بستی دست کار ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری جناب زاہد حسین منصوری نے ہمیں مرادآباد میں چل رہے روایتی فن 'پیتل کے سامان سازی' کے متعلق تفصیل بتائی اور پیتل کے سامان بنانے والے مختلف کارخانوں کا معائنہ کرایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں گورنمنٹ آئی ٹی آئی مرادآباد جانے کا بھی موقع ملا جہاں ہماری ملاقات وہاں کے عملے سے ہوئی جنھوں نے اس فن کو محفوظ کرنے کی بات پر زور دیتے ہوئے اس کام میں مشغول دستکاروں کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنے اور انھیں باضابطہ طور پر تربیت دینے کی بات کہی۔ آئی ٹی آئی کے محکمے نے بتایا کہ دو سال قبل اس سمت میں International Labour Organization نے آئی ٹی آئی مرادآباد میں ورکشاپ کروائی تھی اور اس کے بعد اس سمت میں مزید کارروائی نہیں ہوئی جب کہ اس کام کو جلد سے جلد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی بات وہاں کے دست کاروں نے بھی کہی کہ جتنی جلد ہو سکے اس کام کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑا جائے کیونکہ روایتی طریقہ استعمال کرنے کی وجہ سے اس میں بہت محنت کے ساتھ ساتھ بہت وقت بھی درکار ہے جب کہ دستکاروں کو ان کی محنت کے مطابق رقم نہیں مل پاتی جس کی وجہ سے نئے دستکار اس کام سے جڑنے پر کتراتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فن کے تحفظ کے لیے اسے جلد از جلد جدید ٹکنالوجی سے جوڑا جائے تاکہ یہ فن جو کہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے، محفوظ رہے۔

ہماری ملاقات مرادآباد میں قائم Moradabad Handicraft Service Centre کے عملے سے بھی ہوئی۔ یہ تنظیم ان دست کاروں کے لیے کام کرنے میں انٹرسٹڈ ہے۔ یہ تنظیم بالکل بنیادی سطح کے ایک ماہ کا کورس بھی چلاتی ہے پر مکمل نصاب اور مناسب میعاد نہ ہونے کی وجہ سے یہ کورس ضرورت کو پورا نہیں کر پا رہا ہے۔ اس کام میں بھی دوسرے روایتی فن کی طرح مسلم اقلیتی طبقہ ہی شامل ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے نہ جڑے ہونے کی وجہ سے اس کام میں سخت محنت درکار ہے اور اسی وجہ سے یہ دست کار رات دن اسی میں مشغول رہتے ہیں۔ نتیجتاً زیادہ تر دست کار نہ تو خود تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے بچوں کو پڑھا پاتے ہیں۔ البتہ دینی علوم حاصل کرنے کی وجہ سے یہ لوگ تھوڑی بہت اردو جانتے ہیں۔ کونسل کی یہ تجویز ہے کہ وہ جلد ہی اس سمت میں قدم اٹھائے گی اور اردو زبان میں پیتل کے سامان سازی کے مختلف مراحل کے کورسز چلائے گی، تاکہ اس کام کو کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑ کر upward mobility کا موقع دیا جائے اور اس روایتی فن سے مزید افراد کو وابستہ کر کے اس میں روزگار کے نئے مواقع فراہم کئے جا سکیں۔

◘

Ajmal Saeed, Asst. Education Officer,
NCPUL, New Delhi 110025

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P19.jpg 1/1

3/21/2018 P20.jpg (1605×2255)

شاہد زبیری

سہارنپور کی عالمی شہرت یافتہ ووڈ کارونگ انڈسٹری مسائل سے دوچار

یوپی کا آخری ضلع جس کی سرحدیں ہریانہ، اتراکھنڈ اور ہماچل سے ملتی ہیں اپنی گوناگوں خوبیوں سے عالمی نقشہ میں اپنی پہچان اور اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ 32 لاکھ کی آبادی کا یہ ضلع عالم اسلام میں جہاں دارالعلوم دیوبند کی وجہ سے جانا جاتا ہے اور جنگ آزادی کی تاریخ میں علمائے دیوبند کے مجاہدانہ کارناموں سے یاد کیا جاتا ہے وہاں اپنی ووڈ کارونگ انڈسٹری کی وجہ سے عالمی مارکیٹ میں اس کو شہرت حاصل ہے اور اس انڈسٹری سے ہندوستان کو کروڑوں کا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اب سے تقریباً چار صدی قبل سینہ بہ سینہ روایت کے مطابق کچھ ہنرمندوں نے لکڑی کی کنگنی پر بیل بوٹے سجائے تھے۔ بے جان لکڑی پر یہ پہلی نقاشی بھی شہر کے باذوق ورؤسا نے اس فن کی سرپرستی کی اپنے گھر کے دروازوں سے لے کر خواب گاہوں میں مسہری کے تکیے (سرہانے) اور ان کے پایوں پر بیل بوٹے بنوائے آگے چل کر جس نے باقاعدہ ایک ایسی صنعت کی شکل اختیار کرلی جس سے ہزاروں گھروں کے چولھے روشن ہونے لگے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک یہاں کی لکڑی کی نقاشی قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔ یہاں کی بنی اشیا کا کمروں کی آرائش سے لے کر دفتروں کی زیبائش کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ سہارنپور اور قرب وجوار میں اس انڈسٹری کی وجہ سے خوش حالی آئی۔ لاکھوں ہاتھوں کو کام ملا۔ 5 سال کے بچے سے لے کر 70 سال کے ضعیف تک اور خواتین بھی اس صنعت سے وابستہ ہوگئیں۔ عالمی سطح پر چائلڈ لیبر ممنوع قرار دیے جانے کے بعد اور حکومت کی بندشوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ اب بچوں سے یہ کام عام طور پر نہیں لیا جارہا ہے لیکن جس کے گھروں میں اس کام کو پشتینی حیثیت حاصل ہے ان گھروں کے بچے کسی نہ کسی حد تک ابھی بھی اپنے کومل ہاتھوں سے سخت لکڑی پر بیل بوٹے اگاتے ہیں خواتین مرمت اور بفنگ کرتی ہیں فی الوقت ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے ہنرمند اور (کینڈل اسٹینڈ) بک ریک چاقو، جیولری باکس، فوٹو فریم، ایش ٹرے، کوسٹر، وال پٹی، اسٹول اور راؤنڈ ٹیبل سے لے کر مہین باریک جالی کے پردے (اسکرین) اور بھاری فرنیچر کی زیبائش ہے اور جو نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان اشیا کی زیبائش میں اضافہ کے لیے چاندی اور ہاتھی دانت کی بھرائی (INLEY) ہوتی تھی اب چاندی کی جگہ پیتل نے اور ورلڈ لائف قانون کی پابندی کی وجہ سے ہاتھی دانت کی جگہ پلاسٹ کی بھرائی کی جاتی ہے۔ ووڈ کارونگ میں ایک اندازہ کے مطابق ہر ماہ 3 ہزار 500 کوئنٹل لکڑی استعمال میں آئی ہے جو ملک کی مختلف ریاستوں سے یہاں پیٹر مرچنٹ کے کانٹوں لکڑ منڈی پر فروخت کرنے کے لیے لائی جاتی ہے۔ زیادہ تر لکڑی یوپی کے مشرقی اضلاع بہرائچ، لکھیم پور، کھیری، ہردوئی، سیتاپور، گونڈہ اور شاہ جہاں پور وغیرہ سرفہرست ہیں تقریباً 40 نمبر مرچنٹ ہیں جہاں لکڑی کی نیلامی لگتی ہے اور آڑھت ہوئی ہے۔ کارخانہ دار اس لکڑی کو جو بڑے بڑے تنوں کی شکل میں ہوتی ہے جس کو ان کی زبان میں لیٹا کہا جاتا ہے اپنی ضرورت کے مطابق چھوٹے بڑے سائز آرامشینوں پر چرواتے ہیں پھر اس لکڑی کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لکڑی کی فروخت کے لیے محکمہ جنگلات کے اپنے ڈپو ہیں وڈ کارونگ میں استعمال ہونے والی سب سے اچھی لکڑی شیشم اور ساگون پائی جاتی ہے اب آم اور پاپڑی اور جامن کی لکڑی بھی کثرت سے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P20.jpg 1/1

3/21/2018 P21.jpg (2010×2796)

استعمال میں لائی جارہی ہے۔ آم کی لکڑی کے ساتھ آئرن (لوہے) کا بھی استعمال ہورہا ہے۔ جن کارخانوں اور یونٹوں میں یہ کام ہوتا ہے ان چھوٹے بڑے کارخانوں کی تعداد 2 ہزار 61 ہے جو لیبر آفس میں درج بتائی جاتی ہے اس کے علاوہ دستکار اپنے گھروں اور دوکانوں پر بھی یہ کام کرتے ہیں یہاں بنائی گئی اشیا اندرونِ ملک کے علاوہ بیرونِ ملک میں ایکسپورٹ کی جاتی ہیں جن میں امریکہ، فرانس، برطانیہ، جرمنی، کناڈا اور آسٹریلیا، سرِفہرست ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں بھی یہاں کی نقاشی کے فن کو پسند کیا جاتا ہے اور وہاں ان اشیا کی نمائشیں بھی لگتی ہیں اور ایکسپورٹ بھی ہوتا ہے ایک اندازے کے مطابق کساد بازاری اور عالمی مسابقت کے باوجود عالمی مارکیٹ میں آج بھی 250 کروڑ سے 300 کروڑ کا سالانہ ایکسپورٹ کا کاروبار ہوتا ہے جس سے ملک کو کروڑوں کا زرِمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ ایکسپورٹ پرموشن کونسل آف ہینڈی کرافٹ دہلی کے زونل کنویز اور سہارنپور وڈ کارونگ مینوفیکچررس ایسوی ایشن کے صدر شیخ فیضان کے مطابق 100 کے قریب ایکسپورٹرس ایکسپورٹ پرموشن کونسل کے ممبر ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ہنرمندوں اور دستکاروں کی اکثریت مسلمان ہے جب کہ ایسکپورٹرس زیادہ تر برادرانِ وطن ہیں اب کارخانہ داروں میں بھی اوّل حصے داری صاف دکھائی دیتی ہے۔ اینہ انٹر پرائنرز کے ڈائریکٹر شاہنواز زبیری کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب کارحانہ داروں اور ایکسپورٹرس میں حاجی امام اینڈ سنز، محمود حسن اینڈ سنز اور شیخ عبدالمجید اینڈ سنز کا ڈنکا بجتا تھا اور ان کی شہرت تھی لیکن امتداد زمانہ کی گرد نے ان ناموں کی شناخت ختم کردی ہے۔ ہر چند کہ ان کے وارثین آج بھی اپنے ان بزرگوں کے نام کی لاج رکھے ہوئے ہیں اور ان ناموں سے اپنا کاروبار کررہے ہیں۔

اس عالمی شہرت یافتہ انڈسٹری کے فروغ اور ترقی میں حکومت کی عدم دلچسپی اور توجہ نا کے برابر ہے جب کہ اس کی بندشیں اور نت نئے قانون انڈسٹری کے فروغ اور ترقی میں رخنہ ڈال رہے حکومت کا ایک سبز مشک پلانٹ ہے جو انڈسٹری کی ضرورت کے مطابق ناکافی ہے ایک فرٹو فریم سینٹر اور ایک ڈیزائننگ سینٹر ہے جو مرکزی حکومت کی ٹیکسٹائل منسٹری کے تحت ایکسپورٹس پرموشن کاؤنسل کی نگرانی میں کام کررہے ہیں اور عالمی معیار کے مطابق ووڈ کارونگ اشیا کے ڈیزائن دستکار وں کو سکھائے جاتے ہیں لیکن باقاعدہ اور مستقل کوئی ٹریننگ دستکاروں کو ان سینٹروں کے نہیں دی جاتی ہے سوائے اس کے سال میں ایک دو مرتبہ کچھ ڈیزائننگ ایکسپرٹس آکر دستکاروں کو تھوڑا بہت بتا جاتے ہیں اور ایک آدھ سیمینار میں ایکسپورٹس کے قوانین کی جانکاری دے دی جاتی ہے۔ ٹیکسٹائل منسٹری کی طرف سے اپنے فن میں نام کمانے والے استادوں کو نیشنل ایورڈ دینے سے زیادہ حکومت چاہے وہ مرکزی ہو یا ریاستی اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی یہ نیشنل ایوارڈ یافتہ استاد بھی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ایسے ہی ایک نیشنل ایوارڈ یافتہ شیخ عبدالرحمٰن صدیقی علیگ کہتے ہیں کہ حکومت ایوارڈ دے کر ایوارڈ لینے والے کو بھول جاتی ہے یہ ایوارڈ انڈسٹری کی ترقی میں کوئی رول ادا نہیں کرتا اور نہ حکومت ایوارڈ یافتہ استاد کی کوئی مستقل مالی مدد کرتی ہے۔ ٹیکسٹائل منسٹری کی طرف سے نیشنل ایوارڈ یافتہ استاد کے ذریعے کچھ نئے دستکاروں کو ٹریننگ دینے کے لیے ایک خاص مدت تک جو چند سال سے زائد نہیں ہوئی تھوڑی بہت مالی مدد کرتی ہے اس کے لیے بھی ایک غیرسرکاری تنظیم کا بورڈ ہونا ضروری ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن صدیقی جو ہینڈی کرافٹ آرٹیزنس ایکسپورٹس ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری بھی ہیں ان کو شکایت ہے کہ نیشنل ایوارڈ یافتہ استاد کو 50 سال کی عمر ہونے کے بعد معمولی پینشن دی جاتی ہے۔ حکومت کی ٹیکسٹائل منسٹری ووڈ کارونگ انڈسٹری کے ساتھ امتیازی سلوک کرتی ہے۔ ٹیکسٹائل منسٹری کے تحت ووڈ ہینڈ کرافٹس اور ہینڈلوم دونوں آتے ہیں لیکن منسٹری کی طرف سے ہینڈلوم انڈسٹری کو تو رعایتیں دی جاتی ہیں اور ان کے قرض بھی معاف کردیے جاتے ہیں۔ ووڈ ہینڈی کرافٹس ان رعایتوں اور مراعتوں سے محروم ہے۔ دستکاروں کے لیے کوئی میڈیکل ریلیف نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے انڈسٹری میں کام کرنے والے 14 سال سے زائد کی عمر کے بچوں کی تعلیم کے لیے 'بال شرمک ودھالیہ' کے نام سے چند اسکول ہیں جہاں ان بچوں کو 100 روپے ماہانہ وظیفہ بچہ کے کھاتہ میں جمع کیا جاتا ہے جب کوئی بچہ درجہ 5 پاس کرکے درجہ 6 میں داخل ہوتا ہے تب وہ وظیفہ کی رقم اس کو یکمشت دی جاتی ہے لیکن گنتی کے ان چند اسکولوں میں اسکول کا چپراسی ماسٹر کے فرائض

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P21.jpg 1/1

بھی انجام دیتا ہے۔ اکثر ماسٹر غیر حاضر رہتے ہیں بچو ں کی تعداد بھی انتہائی قلیل ہوتی ہے۔ سہارنپور ووڈ کار ونگ مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے سکریٹری جاوید اقبال انڈسٹری کو درپیش مسائل پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نت نئے قانون وڈ کارونگ انڈسٹری کے لیے بحران کا سبب بن گئے ہیں ان میں سے ایک انٹرنیشن اسٹر یٹفکیشن (ایف سی ایس) توریسٹ ایواڈ کونسل اور کمیٹی کمپلائینسیز سرٹیفکیٹس سسٹم ایکسپورٹس کاروبار میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ اس کے بغیر یوروپ اور امریکہ میں ووڈ کارونگ کا ایکسپورٹس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سٹیفکیٹ اس لیے ہونا ضروری ہے کہ ووڈ کارونگ میں ایسی کسی لکڑی کا استعمال نہیں کیا گیا جس پر عالمی سطح پر پابندی عائد ہو علاوہ ازیں کمیٹی کمپلائینسیز کا سٹیفکیٹ کی پابندی بھی لگا دی گئی ہے غیر ممالک میں مال فروحت کرنے کے لیے بائنگ انجینئر ان کے ساتھ بھی ووڈ کارونگ کا کاروبار کرنیکی پابندی ہے جن کے پاس یہ سرٹیفکیٹ ہو یا یونٹ کمپٹی کمپلائنسیز ہو اس کے لیے سالانہ خرچ بڑھ جاتا ہے۔ چھوٹے کارخانے دار یا چھوٹے ایکسپورٹرس کو پریشانی آرہی ہے۔ غیر ملکی آرڈر حاصل کرنا جوئے شیر ثابت ہو رہا ہے۔

ان مسائل کے علاوہ مقامی مسائل جو انڈسٹری کو درپیش ہیں انھیں سب سے بڑا مسئلہ بجلی کا بحران ہے۔ بجلی کا کوئی مستقل شیڈول نہیں ہے جس کی وجہ سے غیر ملکی آرڈر وقت پر تیار نہیں ہوتے۔ آرڈر کینسل ہونے کا ڈر ہمیشہ رہتا ہے جب کہ غیر ممالک کی ووڈ کارونگ انڈسٹری جو نقاشی کے بغیر فرنیچر اور روزمرہ کی دوسری اشیا تیار کرتی ہے اس کو بجلی کی قلت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ان کا آرڈر وقت پر تیار ہوتا ہے اور وقت پر سپلائی ہو جاتا ہے۔ لکڑی کے معیار اور اشیا کی فٹنگ میں غیر ملکی فرنیچر سہارنپور کے وڈ کارونگ فرنیچر کے مقابلہ زیادہ بہتر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے عالمی مارکیٹ میں بھی ووڈ کارونگ انڈسٹری سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، چین تائیوان، ہانگ کانگ، فرانس اور پاکستان نے جب سے ووڈ کارونگ انڈسٹری میں قدم رکھا ہے ہماری ووڈ کارونگ انڈسٹری کو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اگر ہماری اشیا پر نقاشی نہ ہوتو ہم کہیں نہ ٹکتے نقاشی کے طفیل ہی سہارنپور کی ووڈ کارونگ انڈسٹری غیر ممالک اور عالمی مارکیٹ میں اپنے وجود کی جنگ لڑ رہی ہے۔ علاوہ ازیں جب سے وائلڈ لائف کو بچانے کے لیے درختوں کے کٹان پر پابندی لگی ہے خام مال کی قلت بھی ایک مسئلہ بن گئی۔

ماحولیاتی آلودگی کے خطرہ کو دیکھتے ہوئے اور عدالتی احکامات کے بعد اس میں اور سختی آگئی ہے۔ مارچ 1997 سے سپریم کورٹ کے حکم پر درختوں کے کٹان کو روکنے کے لیے آرامشینوں کے نئے لائسنس جاری کرنے اور پرانے لائسنس کی تجدید (رینول) پر پابندی لگا دی ہے اور جن لائسنسوں کی تجدید 4 مارچ 1997 کے بعد کی گئی ہے یوپی حکومت کے ان لائسنسوں کو رد کردیا ہے اب سے چند سال قبل ضلع سہارنپور میں 41 آرامشینیں کام کرتی تھیں جن سے فوری طور پر 25 مشینوں کو حکومت نے سیل کردیا تھا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ چھوٹی آرامشینوں پر کام ہو رہا ہے وہ بھی نہ جانے کب اس حکم کی زد میں آجائیں۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

جو لکڑی قانونی طور پر استعمال میں لائی جارہی ہے اس پر یوپی حکومت نے 17 فیصد ٹیکس لگا رکھا ہے۔ منڈی ٹیکس اور سیل ٹیکس لگا کر یہ ٹیکس 23 فیصد ہو جاتا ہے جس کو ہٹائے جانے کا مطالبہ کیا جاتا رہا۔ ستم بالائے ستم انڈسٹری جن علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اس علاقے کی سڑکیں خستہ حال پانی کی نکاسی کا نظم بد سے بدتر جگہ جگہ غلاظت کے انبار ٹریفک کی بدحالی جس کی وجہ سے غیر ملکی خریدار یہاں آتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ ایکسپورٹرس کو ان سے ملنے اور آرڈر لینے کے لیے دہلی جانا پڑتا ہے اور غیر ملکی بائرس کی شرطوں پر کاروبار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال بھیجے جانے کے باوجود رقم پھنس جاتی ہے۔ عام طور پر ایکسپورٹرس مال کا بیمہ نہیں کراتے اور اس سلسلہ میں جو ضروری کارروائی ہوتی ہے عموماً اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اندرونِ ملک مال کی اتنی کھپت نہیں ہے کہ اس کے سہارے یہ انڈسٹری خود کو زیادہ دن تک سنبھال پائے گی یہی وجہ ہے کہ ان مسائل کے برے اثرات اس انڈسٹری پر تیزی سے پڑ رہے ہیں۔ سہارنپور کے ہنرمند اور دستکار اس فن سے توبہ کرکے کوئی دوسرا روزگار کرنے پر مجبور ہیں۔ یا ایک خاصی تعداد جے پور اور جودھپور کا رخ کر رہی ہے جہاں ایک ہی یونٹ میں اور ایک ہی چھت کے نیچے روزگار ونگ کی صنعت کی ترقی کے امکانات سہارنپور سے زیادہ روشن نظر آرہے ہیں راجستھان حکومت بھی اس کے فروغ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ علاوہ ازیں ایک بڑا مسئلہ اس انڈسٹری کے سامنے یہ ہے کہ اس انڈسٹری کی رگوں میں تازہ خون دوڑنا بند ہو گیا ہے اس فن کو سیکھنے میں اب نئی نسل کو کوئی دلچسپی نہیں ہے جو مزدوری اس میں پڑتی ہے وہ اس سے زیادہ کمائی ہے۔ چائلڈ لیبر پر پابندی کی وجہ سے بچے بھی اب یہ قدیم اور پشتینی ہنر نہیں سیکھ رہے ہیں جو ہنرمند یہ کام کر رہے ہیں ان پر کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے اس لیے اب ہاتھ کی جگہ مشین لے رہی ہے۔ نقاشی کا جو معیار اب سے 15-10 سال پہلے تک تھا وہ بھی روبہ زوال ہے۔ پرانے استاد اللہ کو پیارے ہوگئے اس لیے کام میں جو نفاست اور خوبصورتی تھی وہ اب نظر نہیں آتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ لکڑی کے سینے پر لالۂ وگل کی بہار گئے وقتوں کی بات ہوتی جارہی ہے اور اس قدیم فن کی چمک ماند پڑتی جارہی ہے جس سے نہ صرف ایک فن کے ختم ہونے کا خطرہ بڑھ گیا ہے اور بیروزگاری کا خطرہ بھی شدید ہو گیا ہے لیکن مرکزی اور ریاستی حکومت کو اس کی کوئی پروا نہیں۔

■

Shahid Zuberi, 13/1419, Bazar Nakhasa,
Saharanpur - 247001

3/21/2018 P23.jpg (1621×2255)

مرادآباد ایک تعارف

خورشید زیدی

رام گنگا کنارے بسا ہوا شہر مرادآباد ایک عظیم تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں اس کا نام چوپلہ تھا۔ افغانوں کی تاریخ میں اس کا نام لکھنور ملتا ہے آج جس علاقہ کو ہم روہیل کھنڈ کے نام سے جانتے ہیں روہیلوں کے آنے سے پہلے اس کا نام کٹھیر تھا جو بجنور تک پھیلا ہوا تھا۔ ضلع بجنور کے کچھ علاقہ کو اب بھی کٹھیر کہا جاتا ہے۔ جبکہ اب وہ روہیل کھنڈ کی حدود سے باہر ہے۔

شہنشاہ شاہجہاں نے 1625 میں رستم خاں نامی ایک شخص کو کٹھیر کا گورنر بنا کر بھیجا تھا رستم خاں نے اسی آبادی کو اپنا مسکن بنایا اور اس نے اپنے نام کی نسبت سے اس آبادی کا نام رستم آباد رکھ دیا۔ جب شاہجہاں کو اس بات کی اطلاع ملی تو انھوں نے رستم خاں کو طلب کیا اور استفسار کیا کہ نئے شہر کا کیا نام رکھا ہے؟ رستم خاں ذہین اور حاضر جواب انسان تھا فوراً جواب دیا کہ حضور وہ جاٹوں اور احرار لوگوں کا علاقہ ہے جو کہ بڑے مفسد ہیں لیکن ظلِ سبحانی اور چھوٹے صاحب عالم (مراد) کی شجاعت اور ہمتِ عالی کا بڑا چرچا ہے اس وجہ سے میں نے نئے شہر کا نام مرادآباد رکھ دیا ہے۔ بادشاہ اس جواب سے بڑے خوش ہوئے اور رستم خاں کو انعامات واکرام دے کر رخصت کر دیا۔

جس عمارت میں اس وقت گورنمنٹ انٹر کالج ہے یہی رستم خاں کا قلعہ تھا اور اس کالج کے دروازے کے باہر جو مسجد ہے وہ آج بھی مسجد رستم خانی کہلاتی ہے کیونکہ اس کا بانی یہی رستم خاں تھا۔ 1658 سے 1685 تک محمد قاسم، میر آتش اور مکرند رام یہاں کے صوبیدار رہے۔ 1685 میں عمید الدولہ یہاں کا صوبیدار ہوا۔ 1718 میں محمد مراد کشمیری عرف رکن الدولہ نے اپنے نام کی نسبت سے مرادآباد کا نام بدل کر رکن آباد کر دیا تھا لیکن ایک سال کے بعد اس کے یہاں سے جاتے ہی اس شہر کا نام پھر سے مرادآباد ہو گیا۔

1858 میں سر سید احمد خاں یہاں آئے اور 1862 تک یہاں کے صدر الصدور کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ مسلم یونیورسٹی بھی یہاں بنانا چاہتے تھے لیکن ایک تو 1857 میں یہاں انگریزوں نے قتلِ عام بہت کیا تھا اور دوسرے اس وقت یہاں کے لوگوں میں تعلیم کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کی وجہ سے سر سید نے یہاں یونیورسٹی بنانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ یہاں قیام کے دوران ہی ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا جن کی قبر یہاں شوکت باغ میں موجود ہے۔

صنعت و حرفت

مرادآباد پیتل کی صنعت کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے پیتل کے گفٹ آئٹم یہاں سے دنیا بھر میں ایکسپورٹ کیے جاتے ہیں۔ 1857 میں یہاں سے ایکسپورٹ کا کام شروع ہوا تھا محمد یار خاں صاحب نے 1857 میں یہاں پہلی ایکسپورٹ فرم قائم کی تھی۔ دوسری ایکسپورٹ فرم حاجی کلن صاحب نے قائم کی تھی۔ اب یہاں بہت سی ایکسپورٹ فرمیں موجود ہیں جو پیتل کے علاوہ دیگر سامان بھی دنیا بھر میں ایکسپورٹ کرتی ہیں۔ یہاں کے باشندوں کا عام طبقہ اسی پیتل کے کاروبار سے وابستہ ہے۔ چھ لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں تعلیم کا رجحان جتنا ہونا چاہیے اتنا اب بھی نہیں ہے۔

دینی تعلیم کا ایک بڑا ادارہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی یہاں 1878 میں قائم ہوا تھا اس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ اس میں دارالعلوم دیوبند کی طرز پر

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P23.jpg 1/1

3/21/2018 P24.jpg (1600×2256)

تعلیم دی جاتی ہے دیگر کئی مدارس جیسے مدرسہ جامع الہدیٰ، حیات العلوم، اور مدرسہ امدادیہ میں بھی اسی طرز پر تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ جامعی نعیمیہ کا نام بھی بڑے مدارس کی فہرست میں شامل ہے۔ یہ 1912 میں قائم ہوا تھا اور یہ مولانا نعیم الدین صاحب سے منسوب ہے۔ مولانا عبدالجبار صاحب، مولانا نذیر الاکرم صاحب، اور مولانا محمد حیات صاحب یہاں کے معروف علماٗ گزرے ہیں۔

آزادی کی جدوجہد میں بھی مرادآباد کی سرزمین پر پیدا ہونے والے بہت سے جاں نثاروں نے یہاں بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں نواب مجید الدین خاں عرف نواب مجوخاں اور مولوی مستو کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نواب مجوخاں کو 25 اپریل 1858 کو انگریزوں نے نواب رام پور کی فوج کی مدد سے قتل کردیا تھا۔ تحریک آزادی کے دوران رامپور کے نواب حامد علی خاں نے جب مولانا محمد علی جوہر کو رام پور سے جلاوطن کردیا تھا تو ان کا خاندان بھی یہاں مقیم رہا تھا اور ان کی ایک بیٹی کا نکاح بھی یہیں پر ہوا تھا۔

بہت سے عصری تعلیمی ادارے بھی قابل ذکر ہیں جن کے بغیر مرادآباد کا تعارف مکمل نہیں ہوسکتا ان میں ہندو ڈگری کالج، مرادآباد مسلم ڈگری کالج، مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج، گوکل داس گرلس ڈگری کالج، فلاحِ دارین انٹر کالج، مسلم انٹر کالج انصار انٹر کالج وغیرہ مشہور ہیں مذکورہٗ بالا تمام کالجز میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے، سب سے پہلے مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج میں ایم اے اردو کورس 1990 میں شروع ہوا تھا جبکہ بی اے تک اردو صرف ہندو کالج میں پڑھائی جاتی تھی اب وہاں سے بھی اردو میں ایم اے ہونے لگا ہے۔

تحریک آزادی کے دوران یہاں کئی اردو اخبارات شائع ہوتے تھے ان میں مخبرِ عالم اور کانگریس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ادبی دنیا میں مرادآباد کو شہرِ جگر کہا جاتا ہے لیکن ان سے بھی پہلے اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہاں دو اہم شعرا گزرے ہیں ایک پروانہ علی شاہ پروانہ مرادآبادی جو مصحفی کے ہم عصر تھے اور نواب محمد یار خاں امیر کے یہاں ٹانڈہ میں ملازم تھے لیکن مزاج کے لاابالی پن کی وجہ سے ان کا کلام یکجا نہیں ہوسکا۔ یہ قائم چاند پوری کے شاگرد تھے اور ان کا ذکر اپنے اشعار میں بڑے فخریہ انداز میں کرتے تھے:

آج ثابت نہ رہے دل نہ کوئی جان درست
ان کی مژگاں نے کیے پھر پر و پیکان درست
ہمت حضرتِ قائم سے اگر ہو امداد
چند ایّام میں کر لیجیے دیوان درست

دوسرے مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی جو نواب محمد سعید خاں کے یہاں ریاست رامپور میں 1855 میں بحیثیت داستان گو ملازم ہوئے تھے انھوں نے وہاں قیام کے دوران پانچ داستانیں لکھیں جن کے قلمی نسخے رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔

ان کے علاوہ کیف مرادآبادی اور قمر مرادآبادی بھی

یہاں کے مشہور شعرا گزرے ہیں۔ دورِ حاضر کے شعرا میں منصور عثمانی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے جو مشاعروں کی نظامت کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں اور دنیا کے 35 ممالک میں مشاعروں کی نظامت کر کے مرادآباد کا نام روشن کر چکے ہیں۔ ان کے والد گوہر عثمانی اور بھائی کشور عثمانی بھی شاعر تھے۔ ان کے علاوہ شاہد احسن مرادآبادی، حیرت مرادآبادی، دلشاد بزمی، دلکش آفریدی، نزہت نگار، تابش حیدری، سلیم کیفی، انور کیفی، جلال مرادآبادی، ولی حسن پوری، بہار سنبھلی (بہار سنبھلی کے 5 مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں) یہاں کے معروف شعرا ہیں جو وقتاً فوقتاً قرب و جوار کے مشاعروں میں مرادآباد کی نمائندگی کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً ان سبھی حضرات کے مجموعہ ہائے کلام بھی شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں کی تاریخی عمارتوں میں جامع مسجد کے علاوہ مسجد جرنیل عظیم الدین خاں، بڑی مسجد رستم خانی، مندروں میں چوراسی گھنٹہ مندر، سول لائن کا میتھوڈسٹ چرچ، اور کنجری سرائے کا گردوارہ قدیمی عمارتوں میں شامل ہیں۔

مرادآباد کے لوگوں کی بول چال کی زبان اردو ہی ہے لیکن باضابطہ طور پر سرکاری ریکارڈ کے مطابق یہاں کے 55 فیصد عوام کی زبان اردو ہے۔ اردو کی معروف ہستیوں میں داکٹر عارف حسن خاں، لیکچرر ہندو کالج، اسماعزیز لیکچرار ایم ایچ کالج، زیبا ناز (گوکل داس کالج) ان کے علاوہ عبدالحمید شمسی مدیر ماہنامہ شمسی آواز ڈاکٹر صابر سنبھلی، عزیز مرادآبادی وغیرہ کے نثری کارناموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مرادآباد میں کوئی اردو میڈیم اسکول نہیں ہے پھر بھی تعلیم اور اردو کے حوالہ سے جنت نشاں گرلس انٹر کالج قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے اس میں مولانا آزاد یونیورسٹی اور قومی کونسل کے سینٹرس بھی ہیں ویسے اور بھی کئی اداروں نے اردو کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مدد سے قابلِ ستایش کام کیا ہے۔ لیکن ہماری تہذیبی وراثت کتابت سکھانے کا کوئی سینٹر اب مرادآباد میں نہیں ہے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے اور قومی کونسل کو اس سلسلہ میں غور کرنا چاہیے اور کسی ادارے کو کتابت سینٹر بھی منظور کرنا چاہیے جو اس کا خواہش مند ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کونسل کے نیٹ ورک کو اور کشادہ کیا جائے۔

فاطمہ ایجوکیشنل سوسائٹی کا افتتاح محلّہ پیر غیب میں 1983 میں حافظ محمد صدیق صاحب ایم ایل اے کے ہاتھ سے ہوا تھا۔ 7 دسمبر 1984 کو اس اسکول میں سید حامد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لائے۔ 3 مارچ 1985 کو اے ایم یو کے ہی وی سی جناب سید ہاشم صاحب تشریف لائے۔ اسکول میں فروغ اردو سینٹر کا قیام 2004-2005 میں ہوا تھا۔ اسکول میں نرسری سے ہی اردو کی تعلیم دی جاتی ہے فروغ اردو سینٹر میں فارم بھرنے والے طلبا میں سے زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور اردو ان کو نہیں پڑھائی جاتی ہے یا ایسے ہندی میڈیم اسکولوں کے بچے ہوتے ہیں جو اردو کی تعلیم سے محروم ہیں۔ فروغِ اردو سینٹر سے یہ بچے خوب اچھی طرح مستفید ہو رہے ہیں۔

■

Khursheed Zaidi, Principle Fatima Educational Society, Kamble ka Tazia, Moradabad, Mobile:09557732383

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P24.jpg 1/1

3/21/2018 P25.jpg (1647×2251)

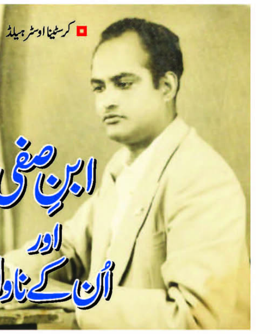

ابنِ صفی اور اُن کے ناول

کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ

ابن صفی اردو والوں کے لیے تعارف محتاج نہیں ہیں۔ اردو میں وہ 'سری ادب' کے بے تاج بادشاہ تھے۔ شاید اسی لیے اردو کے نقادوں نے انھیں لایق اعتنا نہیں سمجھا۔ اردو ادب میں 'سری ادب' تو کیا 'پاپولرلٹریچر' یا مقبول عام ادب کو اس کی واجب جگہ نہیں دی گئی۔ لیکن حال ہی میں مزاج کچھ بدلا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی جیسے اہم ترین نقاد بھی اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ان ہزاروں جاسوس، رومانی اور تاریخی ناولوں کے ذخیرے کو جو پاپولٹریچر کے ذیل میں آتے ہیں، یکسر نظرانداز کردینا عقل مندی نہیں ہے۔ جنھوں نے اردو کے لاکھوں عام قارئین کو اس زبان سے جوڑا اور جن میں سے بہت سوں کا ادب کی اعلیٰ اقدار و اصناف سے رشتہ مضبوط ہوا۔ آج بھی ایسے بہت سے ادیب مل جائیں گے جو بتاتے ہیں کہ اچھی اردو لکھنا انہوں نے ابن صفی، عارف مارہروی، اظہار اثر کی تحریریں پڑھ کر سیکھا ہے۔ ابن صفی کے انتقال کو ۳۲ برس گزر چکے ہیں لیکن ان کی تحریروں کا جادو اب بھی برقرار ہے۔ اس تعلق سے یہ مختصر سا ادبی گوشہ ابن صفی کو ہی منسوب ہے، امید ہے قارئین پسند کریں گے۔ (مدیر)

ابنِ صفی اردو کا وہ مقبول ناول نگار ہے جس پر اردو فکشن کی کسی کتاب میں بات نہیں کی گئی ہے سوائے سلیم اختر کی کتاب 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' (لاہور، 1993) کے جسے خود اردو ادب کے مورخین بھی سنجیدگی سے نہیں لیتے:

> ''اگرچہ ہمارے نقاد ابنِ صفی کو مصنف نہیں مانتے، تاہم 250 مقبول ترین ناولوں کے مصنف کو نظرانداز کرنا مشکل ہے...'' (ص: 267)

کتابوں کی فہرستوں میں ان کی مطبوعات کی اس قدر تعداد ہی مجھے ان کے بارے میں جاننے کو مجبور کر دیتی ہے۔

یہ صورتِ حال صرف اردو کے ساتھ مخصوص نہیں۔ مغرب میں بھی مقبولِ عوام ادب پر علمی تحقیق کا کام 1950 کی دہائی کے اختتام اور 1960 کے عشرے کی ابتدا میں کہیں جا کر شروع ہوا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو حالیہ مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ مقبولِ عام یا پاپولر فکشن شروع سے اس ادب کو مانا جاتا تھا جس کی کتابیں لائبریریوں سے زیادہ تعداد میں اشو کرائی جاتی ہوں۔ ظاہر ہے اسی کی توقع بھی کی جاسکتی ہے! انگریزی کے جن مصنّفین کے ناولوں کو ہندوستانی قارئین میں سب سے زیادہ مقبول پایا گیا وہ ہیں ڈبلیو ایم رینالڈس W M Reynolds (تقریباً فراموش شدہ مصنف جس کا انگریزی ادب کی تواریخ میں شاذ و نادر ہی ذکر آتا ہے) میری کوریلی Marie Corelli اور ایف میریون کرافرڈ FMarion Crawford۔ رینالڈ کا ترجمہ وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ اس نے 12 ناول لکھے جن میں 'اسرارِ لندن' (مسٹریز آف لندن Mysteries of London) شامل ہے۔ ہندوستان کی کم از کم تین زبانوں میں جن مصنّفین کی انگریزی تصنیفات کا ترجمہ ہوا ہے ان میں وہ سرِفہرست ہے اور وہ تنہا مصنف ہے جس کی تمام کتابیں کم از کم چار ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔

ابنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا اور وہ 26 جولائی 1928 کو الہ آباد کے نزدیک نارہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ آٹھ سال کی عمر سے ہی وہ 'طلسمِ ہوش ربا' پڑھنے لگے تھے۔ ان کی پہلی کہانی ایک ہفت روزہ میں اس وقت چھپی جب وہ ساتویں جماعت میں تھے۔ ایک سال بعد وہ شاعری بھی کرنے لگے۔ ثانوی تعلیم انہوں نے الہ آباد میں حاصل کی۔ تحریکِ آزادی کے دوران وہ ترقی پسند مصنّفین سے ذہنی طور پر قریب تھے اور انھوں نے سماجی خرابیوں کے خلاف نظمیں لکھیں۔ 1947 میں انہیں الہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ مل گیا لیکن تقسیم ملک کے فسادات کی وجہ سے وہاں وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ بعد میں انہوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ دیگر دو مصنفوں کے ساتھ انہوں نے 1948 میں ایک اشاعتی ادارہ 'نکہت پبلی کیشنز' کے نام سے قائم کیا۔ اس عرصے میں وہ مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے جن میں افسانہ نویسی اور طنز و مزاح نگاری شامل ہیں۔

1949 میں ابنِ صفی نے الہ آباد کے سیکنڈری اسکولوں میں معلّمی شروع کی اور اپنی تعلیم پوری کرنے کے لیے جزوقتی طور پر پڑھائی کرتے رہے۔ ان کی پہلی جاسوسی کہانی 'دلیر مجرم' کے نام سے 1952 میں جاسوسی دنیا سیریز کے پہلے حصے کے طور پر شائع ہوئی۔ اسی سال وہ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں وہ اپنے والد کے ساتھ رہنے لگے جو 1947 میں پاکستان جا چکے تھے۔ کراچی میں ابنِ صفی نے اسرار پبلی کیشنز کی بنیاد ڈالی اور جاسوسی دنیا کو ایک ساتھ ہندوستان اور پاکستان سے شائع کرنے لگے۔ 1953 میں انھوں نے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس (!) کی بیٹی سے شادی کی۔ 1955 میں انھوں نے جاسوسی دنیا کے علاوہ 'عمران سیریز' کے نام سے بھی ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ تین سال تک schizophrenia کی دماغی بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد رو بہ صحت ہونے پر 1963 میں 'ڈیڑھ متوالے' کے نام سے بے حد بکنے والے ناول کے ساتھ ان کی واپسی ہوئی اور 26 جولائی 1980 کو اپنے انتقال تک وہ مسلسل لکھتے رہے۔

ابنِ صفی کی کتابیں ہندوستان پاکستان دونوں جگہ دستیاب ہیں۔ شروع کے چھوٹے اور کم قیمت کے واحد کہانی والے شماروں کے علاوہ اب نئی طرز کے ایڈیشن بھی ملتے ہیں جن میں دو یا تین کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہ ایڈیشن خوب صورت رنگین ٹائٹل کور کے ساتھ خاصے عمدہ کاغذ پر جدید کمپیوٹر کمپوزڈ ٹائپ سیٹنگ میں چھاپے گئے ہیں۔ اسرار پبلی کیشنز کے لاہور سے چھپے ہوئے پاکستانی ایڈیشنوں پر تاریخِ اشاعت نہیں ہوتی۔ نہ نئے ایڈیشنوں میں نہ پرانی اشاعتوں میں۔ لیکن کسی کسی میں مصنف کے تحریر کردہ پیش لفظ سے تصنیف کی تاریخ ضرور معلوم ہوجاتی ہے۔ دہلی سے چھپنے والے حالیہ ایڈیشنوں میں صرف نئی اشاعتوں کی تاریخ درج ہوتی ہے۔ کچھ حوالوں میں ان کی جاسوسی کہانیوں اور ناولوں کی مجموعی تعداد 250 بتائی گئی ہے۔

حالیہ عرصے میں اس قدر غیرمعمولی اور دائمی مقبولیت والے اس مصنف پر کسی قدر توجہ دی گئی ہے۔

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P25.jpg 1/1

3/21/2018 P26.jpg (1609×2247)

خالد جاوید نے ابنِ صفی اور ان کے کرداروں کا ایک جائزہ 'اردو ادب' (انجمن ترقی اردو ہند، دہلی؛ 2006) میں پیش کیا ہے۔ قبل ازیں خرم شفیق ڈان Dawn میں اپنے ایک مضمون میں لکھ چکے ہیں:

'1950 اور 1980 کے عشروں میں جوان ہونے والی نسلوں کے لیے ابنِ صفی ایسی ہی ایک چیز تھے جس سے خواب تعمیر ہوتے ہیں۔ ساتویں دہائی کے آخری ایام تک، ریڈیو اور سنیما (اور کچھ علاقوں میں ٹیلی ویژن) کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ قلم کار ہمیں دس بارہ ناول ہر سال دیتا رہا جن کی ہزاروں کاپیاں ہر ماہ شائع ہوتی تھیں۔ اس کام کی ادبی قدر و قیمت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے ابنِ صفی یقیناً اس کارنامے کے لیے یاد رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے لفظوں میں وہ جادو تھا کہ جو لوگ پڑھ نہیں پاتے وہ دوسروں سے ان کے ناول بلند آواز میں پڑھوا کر سنتے تھے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے اردو نہ جاننے والے قارئین نے (بشمول مشرقی پاکستانیوں کے) صرف اس لیے اردو سیکھی تا کہ ابنِ صفی کو پڑھ سکیں'۔ (شفیق:7)

اس کے بعد شفیق نے ابنِ صفی کی اردو نثر کی اعلیٰ خصوصیات، اس میں پیش کردہ ماحول، کرداروں اور موضوعات میں رنگا رنگی اور تحریروں کی اخلاقی پہلوؤں کی جم کر تعریف کی ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اردو کی ادبی تنقید اور تاریخ میں انہیں کس قدر نظر انداز کیا گیا ہے جب کہ ان کی تحریروں کا اردو کی ایک مقبولِ عام بیانیہ صنف 'داستان' سے سیدھا تعلق ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کے نقاد مغربی معیاروں کے پیروکار ہونے کی وجہ سے ابنِ صفی کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

'ابنِ صفی دورِ جدید کے اردو ناقدین کے لیے اس وجہ سے ناقابلِ فہم رہے کہ دونوں مختلف روایتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ابنِ صفی اپنے طور پر 'داستان' کو نئے زمانے کے قالب میں ڈھال رہے تھے'۔ (شفیق:8)

اس بیان کی صداقت پر شک کرنے کی کئی وجوہ ہیں لیکن بیان میں کچھ حد تک سچائی ضرور ہے یہ آگے کی بحث سے ثابت ہو جائے گا۔ مغرب میں بھی دراصل جاسوسی کہانیوں کو ادبی نقاد سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ یہ رجحان گرامسکی Gramsci اور اس کے پیروکاروں کی مزاحمت کے باوجود مقبولِ عام ثقافتی رویّوں کو حقارت سے دیکھنے کے عام رویّے کا حصہ تھا۔ دوسری جانب شفیق یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو کی تصانیف کو ان کی اپنی روایتوں کی روشنی میں جانچنا پرکھنا چاہیے اور یہ غلط ہو گا کہ ہمیشہ انہیں مغربی معیاروں سے ہی تولا جائے۔ اس معاملے میں ابنِ صفی کی صحت مندانہ خود اعتمادی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے شفیق نے، اس سوال کے جواب میں کہ وہ ارل اسٹینلے گارڈنر Erle Stanley Gardener کی طرح کیوں نہیں لکھتے، ابنِ صفی کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ:

"کیا آپ میں اتنی جرأت ہے کہ اسٹینلے گارڈنر سے جا کر یہ پوچھیں کہ وہ ابنِ صفی کی طرح کیوں نہیں لکھتا؟" (شفیق:8)

اپنی بے پناہ کامیابی کے پیشِ نظر ابنِ صفی کو ایسا جواب دینے کا پورا حق تھا۔ اپنے اوپر یہ اعتماد انھیں کتابوں کی فرخت ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان بے شمار پر جوش خطوط کی وجہ سے بھی تھا جو انھیں اپنے پڑھنے والوں سے موصول ہوتے تھے۔

پھر بھی شفیق سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے یہ کیوں طے کر لیا ہے کہ ابنِ صفی پر غیر ملکی مصنّفین کا کوئی اثر تھا ہی نہیں۔ آخر غیر ملکی مصنّفین کا اثر قبول کرنا کوئی ایسی شرم کی بات تو نہیں۔ پوری دنیا کے ادیبوں میں یہ عام روش ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں رینالڈس فرسودہ ہو چکا تھا لیکن نئے ماڈل پہلے ہی اس کی جگہ لے چکے تھے جن میں سب سے نمایاں تھا آرتھر کانن ڈائل Arthur Conan Doyle کا شرلاک ہومز Sherlock Holmes۔ ابنِ صفی خود شرلاک ہومز کے معترف ہیں اور ای ایس گارڈنر اور رائڈر ہیگرڈ Rider Haggard کی کتابوں کے بھی۔ ان کی تحریروں میں ہم شرلاک ہومز کے بارے میں کئی مزے دار حوالے پاتے ہیں۔ مثلاً 'لرزتی آگ' میں جہاں عمران خود کو ایک بے ضرر اور سیدھا سادا شخص ظاہر کرتا ہے جو شرلاک ہومز کی سب کتابیں پڑھے ہوئے ہے۔ یا 'جاپان کا فتنہ' میں جہاں فریدی، حمید سے یہ کہتا ہے کہ "اب غالباً تم شرلاک ہومز والی پھبتی دہراؤ گے" ایک منظر میں فریدی کو وائلن بجاتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ گارڈنر کے اور ہیگرڈ کے ناول 'شی' کے حوالے بھی ملتے ہیں۔

مغربی مصنّفین یا ناولوں کے سرسری نوعیت کے ان حوالوں کے باوجود ایسا کہیں نہیں لگتا کہ مصنف نے کسی غیر ملکی نمونے کو اپنایا ہے۔ اس کے برعکس وہ بڑے مزے سے اپنی مختلف ادبی رغبتوں کو سامنے لاتا ہے اور کھلے ڈھنگ سے ان کے حوالے دیتا ہے۔ چنانچہ، اپنے بعض دیباچوں اور کہانیوں کے اندر بھی داستان کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ حمید اپنا موازنہ 'فسانۂ آزاد' کے مشہور کردار خوجی سے کرتا ہے۔ 'ٹھنڈی آگ' میں وہ داستان گو کا کردار اپنا کر شکوہ کرتا ہے کہ کہانیوں میں اس کی حماقتوں کو کس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور پھر خود ہی اس پر اپنا یہ تبصرہ صادر فرماتا ہے کہ آخر قصے کو دل چسپ بنانے کے لیے کچھ زیبِ داستاں بھی تو چاہیے۔ لہٰذا جہاں ہم استاد سراغ رساں فریدی اور اس کے لائقِ ہمدردی، لاپرواہ اور غیر سنجیدہ اسسٹنٹ حمید کو شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کی بدلی ہوئی شکل کہہ سکتے ہیں وہاں اس جوڑی کو امیر حمزہ اور عمرو عیار یا آزاد اور خوجی سے بھی ملایا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے ان کا اور دوسرے کرداروں کا کچھ نہ کچھ عنصر جاسوسی دنیا کے خاص کرداروں میں بھی پایا جاتا ہے مگر، کل ملا کر وہ اپنے تمام ادبی پیش رووں سے مختلف اور انوکھے نظر آتے ہیں۔ ابنِ صفی کی کہانیوں نے، جہاں تک مقبولیت کا سوال ہے تو ہو سکتا ہے روایتی داستانوں کی جگہ لے لی ہو، لیکن وہ جدید جاسوسی کہانیوں/ ناول کی ایک جدید قسم کی نمائندگی کرتی ہیں جس نے انیسویں صدی کے اختتام پر اردو زبان میں اپنی جڑیں اتاری تھیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جاسوسی کہانیوں کا یہ دیسی نمونہ کام کس طرح کرتا ہے۔

جاسوسی دنیا کی پہلی کہانیاں کسی قدر مختصر اور اپنی ساخت کے اعتبار سے کافی سیدھی سادی تھیں جن کے مرکز میں قتل یا ڈکیتی جیسا ایک سیدھا سا جرم ہوتا تھا۔ کہانی میں دو تین موڑ آتے تھے اور پھر کیس سلجھا لیا جاتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کہانیاں طویل تر اور مفصل ہوتی گئیں اور فریدی و حمید کی مرکزی جوڑی کے گرد کئی نئے اور اضافی کردار نمودار ہوتے گئے۔ دائرۂ عمل شمالی ہندوستان کے چھوٹے مقامات سے ایک مسلم ملک میں منتقل ہو گیا جو کہیں پاکستان کے شمالی حصوں کی طرح کا محسوس ہوتا، کہیں کراچی سے ملتا جلتا نظر آتا، لیکن اس کا اصل جغرافیائی نام ظاہر نہیں کیا جاتا۔ پہلے کی کہانیوں میں جہاں جرم کے محرکات ذاتی پس منظر (حسد، لالچ، وراثت کے جھگڑے وغیرہ) لیے ہوتے تھے وہاں بعد کے حصوں میں سیاست، اندرونی و بین الاقوامی دونوں طرح کی سیاست، منشیات کی تجارت، فوجی نوعیت کی جاسوسی، بڑی طاقتوں کی رقابت اور کسی بڑی طاقت کے غلبے کے خلاف تیسری دنیا کے ممالک کی جدوجہد جیسے عوامل بھی ان میں داخل ہو گئے۔ واقعات و موضوعات میں اس توسیع کے ساتھ تکنیکی ساز و

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P26.jpg 1/1

3/21/2018 P27.jpg (1621×2253)

سامان اور تنصیبات کے سلسلے میں بھی وسعت آئی۔ سوکھے کنوؤں، تہ خانوں، دوہری دیواروں اور چور دروازوں کی دنیا سے نکل کر ہم آبدوزوں، حیرت انگیز طیاروں، اڑنے والے روبوٹس، کیمیائی ہتھیاروں، مصنوعی بارشوں اور طوفانوں کی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں۔ غیر ملکی خفیہ ایجنسیاں، اسمگلروں کی ٹولیاں، بین الاقوامی مجرموں کے گروہ اور دہشت گرد تنظیمیں اسٹیج پر دکھائی دینے لگتی ہیں۔ جاسوسی کے آلات اور نصب کی جانے والی چیزیں ہمیں سائنس فکشن کی کتابوں وفلموں اور جیمس بونڈ کی فلموں کی یاد دلاتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابنِ صفی نے انھیں ان ہی کتابوں یا فلموں سے مستعار لیا ہے۔ ان کی ابتدائی کہانیاں 1952 میں جیمس بونڈ کی پہلی کہانیوں کے ساتھ ساتھ اور 1962 میں بونڈ کی پہلی فلم کی ریلیز سے کافی پہلے شائع ہوئی تھیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ بین الاقوامی سطح پر کرائم فکشن، فنتاسی اور سائنس فکشن کی دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس سے ابنِ صفی واقف رہتے تھے، اور اس سے انھیں ہر اس مصنف کی طرح جو یہ بھی پڑھتا ہے کہ دوسرے کیا لکھ رہے ہیں، تخلیقی تحریک بھی ملتی تھی۔ علاوہ ازیں ان کے متن سے ثابت ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاسی واقعات پر بھی نزدیکی نظر رکھتے تھے۔ اس طرح ہم ان کی تحریروں میں غیر ملکی مصنّفین اور اردو ادب کے حوالے سے اور خود ان کی کہانیوں کے درمیان جو کہ اپنے آپ میں 'مکمل کہانی' ہونے کے دعوے کے باوجود آپس میں ہم رشتہ ہیں، بین المتنیت intertextuality کا ایک دل چسپ جال بُنا ہوا پاتے ہیں۔ خرّم شفیق کا یہ بیان کہ مغربی جاسوسی ادب کا ابنِ صفی نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا اس نکتے کو فراموش کرتا ہے۔ ابنِ صفی نے معلومات کو جذب کیا، جو کچھ انھیں اچھا لگا اس سے تحریک بھی لی اور اس سے ان کی کامیابی کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ شفیق خود بھی اعتراف کرتے ہیں:

"...قارئین کی ایک بڑی تعداد کے لیے ابنِ صفی کے ناول ایک ایسی کھڑکی ہیں جس سے وہ انسانی فکر ونظر کے تصورات، مثلاً فرائڈ اور ینگ Jung کی نفسیات، کنفیوشس اور نیتشے کے نظریے، انسان کے سماجی رشتوں anthropology، آرٹ، پکاسو، نسل پرستی کے خلاف بحث، سیاسی اقتصادیات، بین الاقوامی امور، جدید ٹیکنالوجی کو دیکھ پاتے ہیں... دراصل ان کے ناول وہ دستی کتابیں ہیں جو آپ کو وہ سب کچھ بتاتی ہیں جو آپ کو اسکول میں کسی نے نہیں بتایا..."

اس میں کچھ دروغ بیانی ہو سکتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ابنِ صفی کی کہانیاں حالاتِ حاضرہ اور جدید ترین ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قارئین ان کی کتابوں کو جدیدیت اور اس دنیا کی جھلک دکھانے والے دریچوں کی طرح لیتے تھے جو ان کے اپنے حالات کی وجہ سے ان کی نظر سے کافی دور ہے۔ اس نکتے پر ہم بعد میں واپس آئیں گے۔

ان کے بنیادی کردار فریدی وحمید اور علی عمران کئی معنوں میں بظاہر انگریزی کرداروں جیسے ہیں۔ وہ ہمیشہ 'سوٹ بوٹ' اور فیلٹ ہیٹ پہنے رہتے ہیں، سگار اور پائپ پیتے ہیں، قیمتی کاریں چلاتے ہیں اور عالی شان ہوٹلوں کلبوں اور شراب خانوں میں گھومتے ہیں۔ وہ پرائیویٹ جاسوس نہیں ہیں لیکن انٹیلی جنس یا تفتیشی ایجنسیوں کے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود، اپنی مرضی سے سب کام کرتے ہیں، ضرورت پڑنے پر ہی پولیس یا سیکریٹ سروس کی مدد لیتے ہیں، اور کسی کی ماتحتی میں کام نہیں کرتے۔ دونوں ہر طرح سے خودکفیل، بہادر، خوب صورت اور جسمانی طور پر مضبوط ہیں۔ علی عمران تو ایم ایس سی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی کیے ہوئے ہے۔ فریدی کے پاس شرلاک ہومز کی طرح ایک باقاعدہ تجربہ گاہ بھی ہے، جس میں وہ خفیہ تجربات کرتا ہے۔ لیکن یہ مطابقت بس یہیں تک ہے۔ ان کے خاص ہیرو فریدی اور عمران پوری طرح پاکباز اور صاف ستھرے کردار کے مالک ہیں، شراب نہیں پیتے اور عورتوں کے آگے پیچھے نہیں منڈراتے۔ فریدی ایک صاف، سیدھا کردار ہے جب کہ عمران کا کردار کافی پیچیدگی لیے ہوئے ہے۔ وہ کئی شخصیتوں کو اوڑھے رہتا ہے، نہایت چالاک، بہروپ اور بھیس بدلنے میں ماہر اور خود کو بے وقوف ظاہر کر کے دوسروں کو بے وقوف بنانے میں ہمیشہ کامیاب رہنے والا کردار۔ (عمران کے تفصیلی بیان کے لئے ملاحظہ ہو جاوید، ص:-227 229) اس کا مسخرہ پن کئی مضحکہ خیز مناظر پیش کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ناقابلِ شکست فریدی ہے جو خود اپنی غلطیوں سے کئی بار خطرناک حالات میں پھنس جاتا ہے لیکن ہر مرتبہ ان سے نکلنے میں کامیاب رہتا ہے۔ جاسوسی دنیا میں تفریح کا سامان حمید یا دوسرے چھوٹے موٹے کردار فراہم کرتے ہیں، مثلاً ایک پٹھان، قاسم ہے جو کہ بے وقوف ہے اور جوکر جیسا کردار نبھاتا ہے جو کہ ہندوستانی جمالیات کا ایک مرکزی عنصر ہے... یہاں ذرا سنسکرت ڈراما، لوک ناٹک اور بالی وڈ فلموں کو ذہن میں لائیے۔

گھریلو سامان جیسی تفصیلات کو چھوڑ دیں تو کہانیوں کا ماحول قطعی حقیقی نہیں ہے۔ یہ پریوں کی کہانیوں جیسی دنیا ہے جو 'طلسمِ ہوش ربا' سے مطابقت رکھتی ہے جس میں سب کچھ جدید ترین طرزِ زندگی سے لیا گیا ہے: بڑی بڑی، نہایت سلیقے سے آراستہ کوٹھیاں، بیش قیمت کاریں، اعلیٰ درجے کے نائٹ کلب، کاروں، ٹرینوں، ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں میں سفر۔ پریوں کی جگہ ہوش ربا حسن کی مالک یوریشین اور یوروپین لڑکیاں اور عورتیں۔ اور سب کچھ یہ کہے بغیر چلتا ہے کہ تمام ہیرو خوابوں کے کسی شہزادے، جیمس بونڈ (عورتوں کے ساتھ اس کے معاملات کو چھوڑتے ہوئے) اور سپرمین کا مرکّب ہیں۔ داستان کی رعنائی اور معجزوں کی جگہ اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز تکنیکی کرشمے لے لیتے ہیں اور یہ سب بھی اس دعوے کے بغیر بیان ہوتا ہے کہ نیکی اور بدی کی آفاقی جنگ میں وقتی طور پر سہی، فتح بالآخر نیکی کی ہوتی ہے۔

ان لوازمات اور کہانی بیان کرنے کی اپنی غیر معمولی صلاحیت اور ہنرمندی کی بدولت ابنِ صفی وہ ادب تخلیق کرتے رہے جو باعثِ تفریح تھا۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ میں نے اس سے زیادہ کچھ کر دکھانے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی۔ پڑھنے والے جب اصرار کرتے کہ انھیں 'سنجیدہ ادب' (اردو والوں کے بقول صرف 'ادب') لکھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے تو ان کا جواب ہوتا تھا:

"بھائی آپ مجھے صرف اردو کی خدمت کرنے دیجیے (اس کے باوجود کہ صرف ونحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہوں گی) آپ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی بھائی کا کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اردو پڑھ رہا ہوں۔ پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کہاں تک لیا جائے۔

اب بتایئے میں 'ادب' کی خدمت کروں یا میرے لیے 'اردو' ہی کی خدمت مناسب ہوگی۔ ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور سوسائٹی کی بھی۔

...کچھ لوگ ادب میں میرے مقام کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کی نظروں میں میرا کوئی مقام ضرور ہے۔ ورنہ آپ کو اس کی فکر ہرگز نہ ہوتی۔ ('تیسری ناگن' پیش رس، ص:95)

پھر وہ کہتے تھے کہ اگر انہیں ادب میں کوئی مقام بنانا ہے تو اس کے لیے اپنے جاسوس کو قربان کرنا پڑے گا

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P27.jpg 1/1

اور یہ انھیں قبول نہیں۔ وہ بدی کے خلاف اپنی جنگ کو ترجیح دیتے تھے۔ بدی اور مایوسی کو سر اٹھانے دینا انھیں منظور نہیں تھا، اس لیے وہ کہتے تھے:

''بس تو پھر آپ بھی مقام وقام کا چکر چھوڑیے اور مجھے وہیں رہنے دیجیے جہاں میں ہوں۔ اگر آپ کو میری کہانیاں پسند ہیں اور آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں آپ کے تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے معیاری تفریح مہیّا کر رہا ہوں تو میں اس پر مطمئن ہوں۔ امید کہ آپ بھی مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ (ایضاً، ص:96)

ابنِ صفی نے تقریباً تمام کہانیوں کے دیباچے لکھے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے اپنی تحریروں اور اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ان کے رویّے کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ پڑھنے والوں کے ردِّ عمل اور ان کی توقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بھی ایک بڑا وسیلہ ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ بہت سے دوسرے مصنّفین اور کتابوں کے بارے میں پڑھنے والوں کے ردِّ عمل کا اتنا عمدہ دستاویزی اندراج کبھی ہوا ہوگا۔ مصنف کے بیان کو اگر تشکیک کی نظر سے دیکھا جائے تب بھی وہ معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ ان کی اپنی شہادتوں کی بنیاد پر ہم کیا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں لوگ ابنِ صفی کے ناول تفریحی مشغلے کے طور پر پڑھتے تھے تاکہ ایک بے کیف زندگی سے باہر نکل کر سنسنی اور تفریحی سکون محسوس کر سکیں۔ ان کہانیوں میں انہیں پُرآسائش زندگی، حسین عورتوں (یا مرد) بڑی کاروں، اقتدار اور دوسروں پر اختیار اور بدی پر نیکی کی فتح کے خواب سچ ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ خطرناک حالات کی سنسنی کا اور ممنوعہ اعمال (منشیات و شراب نوشی کی کثرت اور ناجائز جنسی تعلقات) کی متصوّرہ لذتوں کا تجربہ کر سکتے تھے، جو ویسے ہمیشہ برے کرداروں سے وابستہ ہوتے تھے اور جن کا واضح اور تفصیلی بیان کبھی نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہادر اور پاکباز ہیرو کے ساتھ جوڑ سکتے تھے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ دوسری زبانوں میں بھی پاپولر لٹریچر کے بارے میں تحقیقات سے اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ معمولی درجے کے کم قیمت فکشن کے قاری بھی اس میں صرف فرار ہی نہیں ڈھونڈتے۔ وہ ان کہانیوں کو کسی نہ کسی شکل میں اپنی زندگیوں اور قدروں سے جوڑ کر بھی دیکھتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی انہیں نصیحت کرے اور سبق سکھائے۔ اچھی قدروں اور بہتر آدرشوں کو وہ کہانی کے سلسلۂ واقعات اور کرداروں کی نشوونما سے اخذ کرتے ہیں۔ ابنِ صفی کی تحریروں میں بعض آدرش اسی بالواسطہ انداز میں تشکیل پاتے ہیں۔ وہ سماج جس میں یہ بنیادی کردار متحرّک ہوتے ہیں بنیادی طور پر سیکولر بلکہ کاسموپولیٹن ہوتا ہے۔

بعد کی کئی کہانیاں ملک کی خودمختاری کو کم کرنے اور اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی سازشوں کے بارے میں ہیں۔ عمران اور اس کے ساتھی ان کوششوں کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور خود انحصاری اور استحکام کے لیے لڑتے ہیں۔ اپنے ایک پیش لفظ میں ابنِ صفی ملک کی آزادی اور خودمختاری کے لیے اقتصادی خود انحصاری کو پہلی شرط بتاتے ہیں ('دہشت ناک'، ص: 146) جن کہانیوں کا تعلق بڑی طاقتوں کے توسیع پسندانہ عزائم سے ہے ان میں تیسری دنیا کی لفاظی بھی خوب ملتی ہے۔

جہاں تک اندرونی حقائق کا تعلق ہے تو وہ سماجی ناانصافی اور جاگیردارانہ مظالم کو جرائم اور دہشت گردی کی بنیادی وجہ گردانتے ہیں۔ ناول 'دہشت ناک' کے خاتمے پر جب وہ مجرم جس کے پورے کنبے کا ایک بے رحم زمیندار نے صفایا کر دیا تھا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور ایک چھ سال کے بچّے کی ذہنی حالت میں واپس چلا جاتا ہے تو عمران پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے اور وہ کہتا ہے:

> اس شخص کے لیے میرا دل رو رہا ہے۔ کاش اس کے انتقامی جذبے نے انفرادی رنگ اختیار کرنے کی بجائے ایسی تحریکوں کا ساتھ دیا ہوتا جو ظلم اور جبر کے نظام کو مٹا دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ (ص: 144)

سماج کے اعلیٰ طبقوں میں پائی جانے والی بدعنوانیوں اور تمام حکام کے لیے عام طور پر پائی جانے والی بے اعتمادی کا بھی کافی بیان ہوا ہے۔ کچھ ناولوں میں بڑے تاجروں اور انتظامیہ کی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ملی بھگت کو بھی دکھایا گیا ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ صفی پاکستانی شہریوں کے اپنے حکمرانوں کے ساتھ پائے جانے والے رویّے کی عکاسی کر رہے ہیں۔ تاہم کل ملا کر ہمیں اس طرح کی سماجی حقیقت پسندی ان کے یہاں نہیں دکھائی دیتی جو بعض مغربی زبانوں کے عصری کرائم فکشن کا طرّۂ امتیاز ہے۔ ابنِ صفی کی کہانیوں کی دنیا پوری طرح ایک خوابوں کی دنیا ہے، جس کے کردار عام زندگی کے کرداروں سے بہت بلند ہیں، اور جو حیرت انگیز واقعات سے بھری ہے۔ تاہم تصوّر کی اڑان کتنی بھی اونچی کیوں نہ ہو، آخر میں اس پر معقولیت غالب آ جاتی ہے۔ مافوق الفطرت باتوں اور جادوٹونے کو ابنِ صفی اپنی کہانیوں میں جگہ نہیں دیتے۔ کہانی کا ہر راز منطقی انداز میں سائنسی طریقوں، جدید تفتیشی تکنیک اور نفسیاتی تجزیہ کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ اختتام پر، سب کچھ (عارضی طور سے ہی سہی) درست ہو جاتا ہے، بدی کی شکست ہوتی ہے، جذبے قابو میں آ جاتے ہیں۔ (عمران اور اس کا نیٹ ورک، پراسراریت کی دھند میں چھپے رہتے ہیں اس سے کہانی اور دل چسپ ہو جاتی ہے)

ایک مختلف سطح پر انیسویں صدی کے نذیر احمد کی طرح ابنِ صفی بھی یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان اگر دل اور اپنے اخلاقی عمل سے اچھا ہے تو وہ دنیا میں کس قدر کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابنِ صفی کی کتابیں پڑھنے میں اس قدر صاف ستھری ہیں کہ پورا کنبہ انھیں پڑھ سکتا ہے اور اتنی دل چسپ بھی کہ نوجوانوں کو بھی پسند آئیں گی مگر ان کے اخلاق پر ان کا کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتابیں اتنی کامیاب نہ ہوتیں اگر وہ اتنے دل چسپ، عام فہم، پڑھے جانے لائق اندازِ بیان میں نہ لکھی جاتیں، ان میں طنز و مزاح کی ایسی چاشنی نہ ہوتی، اور نہایت پرلطف مکالمے، لفظوں کی دھر پکڑ اور محوروں کا ماہرانہ استعمال نہ ہوتا۔ ابنِ صفی کی زبان کی عام طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ خالد احمد لکھتے ہیں:

''ان کا مزاح اور طرزِ بیان ان کا اپنا ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب صاف ستھری اور رواں دواں اردو لکھتے ہیں۔ کسی قدر منٹو سے ملتی جلتی۔ پوری طرح فطری (organic) جس میں وہ جو چاہتے ہیں اسے بیان کر دیتے ہیں۔ (احمد:3) اور افضال احمد کی رائے میں ان کی تحریر کی خاص خوبی مضمر ہے 'ان کی شستہ، بلکہ کلاسیکی طرز کی اور غیر پیچیدہ اردو میں، نیز کہانی میں رونما ہونے والے واقعات کی مسحور کن رفتار میں...' (احمد:3) اور وہ ایک نوجوان دوست کا حوالہ دیتے ہیں جو ابنِ صفی کی اردو کو ''خوب صورت، عام فہم اور دل چسپ'' قرار دیتا ہے (احمد: 4) یوں ان کی زبان واقعی غیر معمولی طور پر اعلیٰ معیار کی زبان قرار پاتی ہے۔

ہر سال اتنا زیادہ لکھ کر دینے والے ابنِ صفی سے آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ خود کو بالکل نہ دوہرائیں۔ ان کی کچھ کہانیاں خاصی مبہم ہیں اور کئی بار کہانی کا ایکشن اکتا دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن کل ملا کر اس میں شک نہیں کہ وہ اس زمرے کے سب سے بہترین نہ سہی سب سے بہتر داستان گوؤں میں سے ایک ضرور تھے۔

(انگریزی سے ترجمہ: نصرت ظہیر)

■

تلخیص بشکریہ: 'ادب ساز' شمارہ 7-6

3/21/2018 P29.jpg (1591×2200)

لئیق رضوی

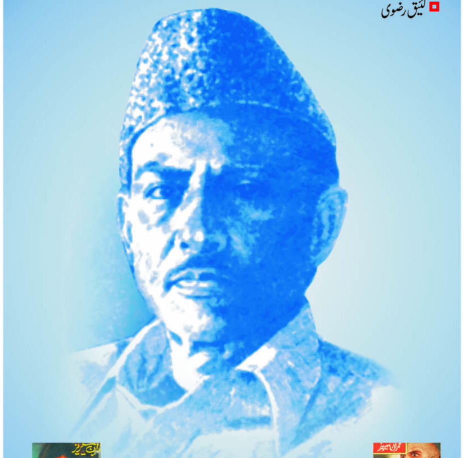

ابن صفی زندہ ہے جادو

ابن صفی بی اے۔ نام ہی کافی ہے۔ ان کی تحریروں نے اپنے ساتھ اور اپنے بعد کی تین نسلوں کو متاثر کیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ انھوں نے 26 اپریل 1928 کو الہٰ آباد ضلع کے ایک گاؤں نارہ (اب یہ گاؤں کوشامبی ضلع میں ہے) میں ایک مسلم کائستھ خاندان میں آنکھ کھولی۔ علم کی دولت انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ابتدائی تعلیم مکمل کر کے ابن صفی نارہ سے الہٰ آباد شہر آگئے۔ یہاں ڈی اے وی اسکول سے ہائی اسکول اور ایوینگ کرسچین کالج سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد 1947 میں انھوں الہٰ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا، لیکن ابھی بی اے کے پہلے سال میں ہی تھے کہ حالات کچھ ایسے بنے کہ انھیں پڑھائی بیچ میں چھوڑ کر ملازمت کرنی پڑی۔ بی اے کی ڈگری 1951 میں انھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔

کھیلنے، کودنے کی عمر میں ہی انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ادب کے کئی علاقوں میں ان کا بخوبی دخل تھا۔ شعر تو بچپن سے ہی کہتے تھے، پھر افسانے بھی لکھنے لگے۔ جب ان کی پہلی کہانی (ناکام آرزو) اپنے وقت کے نمائندہ رسالے شاہد ویکلی (بمبئی) میں اہتمام سے شائع ہوئی تھی، وہ محض ساتویں جماعت میں تھے۔ یہ سلسلہ وقت کے ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ 1948 میں جب عباس حسینی نے ماہنامہ 'نکہت' (الہ آباد) شروع کیا تو، اسرار اس سے وابستہ ہو گئے طالب علمی کے زمانے میں۔ 'نکہت' میں ان کے افسانے اور کلام بڑے اہتمام سے شائع ہوتے۔ اس زمانے میں ابن صفی اسرار ناروی تھے۔ سنکی سولجر، طغرل فرغان اور عقرب بہارستانی کے قلمی ناموں سے انھوں نے 'نکہت' کے لیے تقریباً ڈیڑھ سو طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھے۔ لیکن یہ ان کی منزل نہیں تھی۔ 1952 میں جب عباس حسینی نے ماہنامہ 'جاسوسی دنیا' شروع کیا تو اسرار ناروی، ابن صفی کے نام سے جاسوسی ناول لکھنے لگے اور پھر یہی ان کی پہچان بھی ٹھہری۔

ابن صفی کو جنون کی حد تک مطالعے کا شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ کورس کے علاوہ، مختلف موضوعات کی کتابیں تلاش کر کر کے پڑھا کرتے تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے نمائندہ ادبی شاہکار ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ داستانوں اور ناولوں میں انھیں خاص دلچسپی تھی۔ طلسم ہوش ربا تو انھوں نے بچپن میں ہی پڑھ لی تھی۔ بڑے ہوئے تو انگریزی ناولوں سے بھی ملاقات ہوئی اور پھر اسی مطالعے اور ملاقاتوں نے اسرار ناروی کے اندر کے ابن صفی کو جگا دیا۔ خود لکھتے ہیں:

'طلسم ہوش ربا اور رائڈر ہیگرڈ کے اثرات نے آپس میں گڈ مڈ ہو کر میرے لیے ایک عجب سی ذہنی فضا مہیا کر دی تھی جس میں ہمہ وقت ڈوبا رہتا۔ ایسے ایسے خواب دیکھتا کہ بس... خوابوں اور مطالعوں کا سلسلہ جاری رہا۔' (عالمی ڈائجسٹ 1970)

ابن صفی کی ناول نگاری کا خمیر انھیں خوابوں سے اٹھا ہے۔ ابن صفی کا پہلا ناول 'دلیر مجرم' مارچ 1952 میں منظر عام پر آیا۔ تحریر کے اس نئے ذائقے نے لوگوں کو بہت متاثر کیا اور پھر ابن صفی کے قلم کا جادو چل گیا۔ ہر نئے ناول کے ساتھ ان کی مقبولیت اور ساکھ بھی بڑھتی گئی۔ جلد ہی دوسری زبانوں میں بھی ڈیمانڈ پیدا ہو گئی اور پھر ان کے ناول ہندی، بنگلا اور گجراتی میں بھی خوب چھپے اور بکے۔ اگست 1952 میں وہ الہ آباد چھوڑ کر کراچی (پاکستان) چلے گئے۔ 1955 میں انھوں نے علی عمران کے نام سے ایک نیا مرکزی کردار تخلیق کیا۔ عمران سیریز کا پہلا ناول 'خوفناک عمارت' تھا جو پہلی مرتبہ اگست 1955 میں کراچی سے شائع ہوا۔ اکتوبر 1956 میں اسرار پبلی کیشنز نام سے ابن صفی نے کراچی میں اپنا الگ ادارہ قائم کیا، بعد میں عمران سیریز کے ناول اسی ادارے سے شائع ہوئے، لیکن فریدی اور حمید سیریز کے ناول انھوں نے صرف 'جاسوسی دنیا' (الہ آباد) کے لیے ہی لکھے۔ ابن صفی

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P29.jpg 1/1

3/21/2018 P30.jpg (1486×2200)

کی بے پناہ مقبولیت نے ان کے دشمن پیدا کر دیے۔ ابن صفی کے بازار میں نقب زنی کے لیے بہت سی فرضی دوکانیں کھل گئیں اور نقل نگاری کا بازار گرم ہو گیا۔ کچھ نے ابن صفی کے کردار چرائے، تو کچھ نے ان کے ملتے جلتے نام سے ناول لکھ کر قاریوں کو دھوکہ دیا۔ جولائی 1960 سے اگست 1963 تک جب نروس بریک ڈاون کے سبب ابن صفی کا قلم خاموش رہا، ان کاروباری دشمنوں کو اور بھی موقع مل گیا۔ طرح طرح کی افواہیں اڑا کر انھوں نے اپنا بازار بنانے کی لاکھ کوشش کی، لیکن نومبر 1963 میں ناول 'ڈیڑھ متوالے' کی اشاعت کے ساتھ ذہانتوں کی جستجوں کا یہ دلکش سلسلہ پھر رواں دواں ہو گیا۔ اس کے پیش رس میں ابن صفی نے ان لوگوں کی اپنے انداز میں خوب چٹکی لی ہے:

'ادھر یاران طریقت تھے کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ ابن صفی پاگل ہو گیا ہے۔ کاٹنے دوڑتا ہے۔ ابن صفی نے پینے کی حد کر دی تھی (حالانکہ میری سات پشتوں میں بھی کسی نے نہ پی ہوگی) اس لیے ایک دن نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ابن صفی کا کسی سے عشق چل رہا تھا، اس نے بے وفائی کی، دل شکستہ ہو کر گوشہ نشیں ہو گیا۔ (حالانکہ گھٹیا قسم کے عشق کا تصور ہی میرے لیے مضحکہ خیز ہے) آخری اطلاع یہ تھی کہ ابن صفی کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر پر سچ مچ دل بھر آیا تھا، جیسے میں خود ہی ابھی ابھی ابن صفی کو مٹی دے کر واپس آیا ہوں، پھر درجنوں ابن صفی پیدا ہو گئے، جواب بھی بہ فیض تعالی بقید حیات ہیں اور ڈھڑلے سے میرے کرداروں کی مٹی پلید کر رہے ہیں ... خدا ان سبھوں کی مغفرت فرمائے اور مجھے صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔'

کچھ پبلشر جہاں ابن صفی کی نقل میں ناول لکھوا کر ابن صفی کے نام سے چھاپ کر اپنا الو سیدھا کر رہے تھے، تو کچھ ان کے ناولوں کو دوسروں کے نام سے شائع کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ ناول 'گیارہ نومبر' کے پیش رس میں ابن صفی نے لکھا تھا:

'اب آیئے بے چارے مصنف (ابن صفی) کی طرف کہ اسے بہت دنوں کے بعد وہی پرانا مرض لاحق ہو گیا ہے، لیکن اس بار بنگلہ بھاشا میں ہوا ہے۔ یعنی مشرقی پاکستان کے دو پبلشروں نے میرے کچھ ناولوں کا بنگلہ ترجمہ چھاپا ہے اور اس پر میرے نام کے بجائے مراد پاشا اور آلک باری رسید کر دیا ہے۔ یعنی اردو میں تو چوریاں ہوتی تھیں لیکن بنگلہ میں تو ڈاکہ پڑا ہے۔'

ابن صفی نے اپنی زندگی جاسوسی ادب کے لیے وقف کر دی تھی۔ تقریباً ہر مہینے انھیں کم از کم ایک نیا ناول تصنیف کرنا ہوتا تھا، لیکن کمال یہ ہے کہ اس دباؤ کا اثر ان کے فن پر نہیں پڑا۔ انھوں خوب لکھا اور بہت خوب لکھا۔ ابن صفی کا قلم 26 جولائی 1980 کو ان کی سانس کے ساتھ ہی رکا۔ اس دوران انھوں نے جاسوسی ادب کی ایک دنیا ہی آباد کر دی ہے۔ 'دلیر مجرم' سے لے کر 'آخری آدمی' تک انھوں نے 242 جاسوسی ناول یادگار چھوڑے ہیں۔ ان ناولوں میں زندگی کی مکمل تصویر نہ بھی سہی، لیکن ان میں زندگی کے بہت سے رنگ بخوبی نظر آتے ہیں۔ ایسے سچے اور زندہ رنگ، جو شعور کو متحرک کر دیں۔ ابن صفی نے زندگی کو ایک خاص، صورت حال میں دیکھنے، سمجھنے کی جستجو کی ہے۔ ان کے ناولوں میں انسانی نفسیات کی موثر عکاسی ہے۔ ابن صفی کے ناولوں میں محض تفتیش کی عام ڈگر اور مجرم کی روایتی تلاش نہیں، بلکہ وہ جا بجا ان سوتوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں، جو لگاتار جرم اور مجرم اگل رہے ہیں۔

ابن صفی کے پلاٹ بڑے تہدار ہیں۔ انھوں نے کہانی اور اس کی جزیات کو اس فنکاری سے برتا ہے کہ ان میں کشش اور تجسس بڑھتا گیا ہے۔ ان کے منظر زندہ اور متحرک لگتے ہیں۔ لفظوں کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں کہ قاری خود کو اسی منظر کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ ابن صفی کے بعض ناولوں میں سائنس فکشن اور سائنس فینٹیسی کا سہارا لیا ہے۔ قسم قسم کے حیرت انگیز واقعات، قاری کو ایک ایسی فضا میں لے جاتے ہیں، جہاں قدم، قدم پر ایک نئی حیرت سے اس کا سامنا ہوتا ہے۔

کردار سازی میں بھی ابن صفی خود ہی اپنا جواب تھے۔ ان کے خیالی کردار، بھی مانوس اور جیتے جاگتے لگتے ہیں۔ وقت کی گرد بھی ان کی چمک کم نہیں کر سکی ہے۔ ان کے مرکزی کردار، ہر فن میں طاق اور گلیمر سے بھرپور ہیں۔ ان میں بے پناہ طاقت اور غیر معمولی خوبیاں ہیں، لیکن ابن صفی نے انھیں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ کسی باہری دنیا کے نہیں لگتے۔ فریدی خفیہ پولیس کا بہت ذہین اور جیالا آفیسر ہے۔ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، جغرافیہ سے لے کر جدید سائنس تک، مختلف علوم میں اس کا دخل ہے۔ وہ سونپے گئے مشن کے لیے جان لگا دیتا ہے۔ وہ کہیں ہو، کچھ بھی کر رہا ہو لیکن اس کا ذہن ہمہ وقت کیس کی گتھیاں سلجھاتا رہتا ہے۔ سنجیدگی نے اس کی شخصیت میں بلا کا رعب پیدا کر دیا ہے۔ مجرم اس کے نام سے کانپتے ہیں۔ فریدی کا اسسٹنٹ، حمید کھلنڈرا، نوجوان ہے۔ مسخرہ پن اس کی شخصیت کا غالب جز ہے، حمید کام کے ساتھ ساتھ موج، مستی بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کی حرکتیں اور باتیں قہقہوں کی بارش کرتی ہیں۔ علی عمران، میں فریدی کی ذہانت اور حمید کا کھلنڈرا پن دونوں شامل ہے۔ وہ جاسوسی کے لیے ضروری ہر فن میں ماہر ہے، لیکن اس کے طور طریقے انوکھے ہیں۔ وہ احمق بن کر، مجرموں کی چالاکیاں روند دیتا ہے۔ اس کی بے وقوفیاں ہی اس کا حسن ہیں۔

ابن صفی کے ولن بھی خاصے جاندار ہیں۔ تھریسیا کو ہی دیکھیے، اس کے حسن اور چالباز ذہن کا جو دل فریب نقشہ ابن صفی نے کھینچا ہے، وہ سچا لگتا ہے۔ یا پھر تاتریہ، جو جنسی بے راہ روی کا شکار ہے اور درد میں بھی لذت محسوس کرتی ہے۔ سنگ ہی، ڈاکٹر نارنگ، جیرالڈ شاستری، لیو نارڈ، ہم برگ دی گریٹ، فنچ، جبر، لیونارڈ، قلندر بیابانی، حکیم ارسلالونی، ڈاکٹر ڈریڈا اپنے طور طریقوں سے قاری کو اٹریکٹ کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سر سلطان، جوزف، روشی، جولیانہ، ظفر الملک، جیمسن، جیسے کردار بھی خاص ہیں۔ ابن صفی ان خیالی کرداروں میں، جیسے روح پھونک دی ہے۔ وہ اصلی اور جیتے جاگتے لگتے ہیں۔

ابن صفی نے مقصدیت کے ڈھول تو نہیں پیٹے، لیکن ان کے ناولوں کو غور سے پڑھیے، اس میں ہم عصر سماج کا چہرہ بھی نظر آئے گا اور آتے وقت کی چاپ بھی سنائی دے گی۔ ابن صفی، جرم کو گلیمرائز نہیں کرتے۔ ان کے ناول جرم سے نفرت سکھاتے ہیں، مجرم کی سازشوں سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ بھروسا بھی دلاتے ہیں کہ جرم اور مجرم کا انجام، بہر حال شکست ہی ہے۔ جیت امن اور قانون کی ہی ہوتی ہے۔ دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ مگر افسوس کہ ان کے ناولوں پر پاپولر کا ٹیگ لگا کر ادب کے خاص دھارے سے الگ کر دیا گیا۔ انھیں 'فراری' اور نہ جانے کیا کیا نام دیے گئے۔ مگر ابن صفی اپنی راہ پر بڑھتے ہی گئے۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔:

''... میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں، اسے کسی بھی قسم کے بھی ادب سے کمتر نہیں سمجھتا۔ ہو سکتا ہے میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں، تکیوں کے نیچے ضرور ملیں گی۔ ہر کتاب بار بار پڑھی جاتی ہے۔ میں نے اپنے لیے ایسے میڈیم کا انتخاب کیا ہے کہ میرے افکار زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔ ہر طبقے میں پڑھا جاؤں اور بحمد اللہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔' (الف لیلہ ڈائجسٹ، جولائی 1972)

ابن صفی، پوری ایمانداری سے لکھتے رہے۔ انھیں معلوم تھا کہ اچھے، برے کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P30.jpg 1/1

3/21/2018 P31.jpg (1641×2360)

وقت فیصلہ کر بھی رہا ہے۔ محدود دائرے میں ہی سہی، ابن صفی کی ادبی قدر و قیمت کے تعین کے لیے از سر نو تجزیہ شروع ہو گیا ہے۔ ان کی خدمات پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ سیمینار ہو رہے ہیں۔ رسائل خصوصی نمبر نکال رہے ہیں۔ دوسری زبانوں میں ابن صفی کے ناولوں کا ترجمہ یوں تو ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن ادھر اس میں تیزی آئی ہے۔ بعض بڑے اشاعتی گھرانوں نے ابن صفی کی طرف رخ کیا ہے۔ 2009 میں 'ہارپر کالنس' نے ابن صفی کے 15 ناولوں کا ایک سٹ ہندی میں دوبارہ پیش کیا۔ 2009 میں ہی 'رینڈم ہاؤس' نے ابن صفی کے دو ناول (خوفناک عمارت، چٹانوں میں فائر) کے انگریزی تراجم شائع کیے۔ 2011 میں 'بلافٹ پبلی کیشنز' نے ابن صفی کے چار ناولوں (زہریلے تیر، پانی کا دھواں، لاش کا قہقہہ، ڈاکٹر ڈریڈ) کے انگریزی تراجم پیش کیے۔ ان ناولوں کو انگریزی کا جامہ ممتاز ناقد و ادیب شمس الرحمٰن فاروقی نے پہنایا ہے۔ ان چاروں ناولوں کو ہندوستان کے باہر 'ای۔ بکس' کے طور پر بھی فروخت کیا جا رہا ہے۔ ناشروں کے مطابق، مرزا غالب کے بعد، ابن صفی اردو کے دوسرے ادیب ہیں، جن کی کتابیں 'ای۔ بکس' کے تحت فروخت کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ابن صفی کی مقبولیت ہی نہیں، ان کی عظمتوں کی بھی دلیل ہے، جو جاسوسی ناول کبھی انگریزی سے اردو میں آیا تھا، ابن صفی نے اسے وہ فنی اور فکری بلندی دے دی، کہ اب وہ انگریزی ناولوں سے پوری شان سے آنکھ ملا سکتا ہے۔

جاسوسی ادب کے ساتھ ساتھ، ابن صفی نے کچھ اور دلچسپ ناول اور طویل کہانیاں یادگار چھوڑی ہیں، جو موضوع اور اسلوب، دونوں سطح پر اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں 'پرنس چلی'، 'تزک دو پیازی'، 'معزز کھوپڑی'، 'بلدران کی ملکہ' اور 'شمال کا فتنہ' خاص ہیں۔ 'پرنس چلی' اور 'تزک دو پیازی' دلچسپ ناول ہیں، جس میں ابن صفی نے، پرانے عوامی کرداروں اور استعاروں کو عصری تناظر میں بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ کہانی دلچسپ ہے اور زبان و بیان انتہائی شگفتہ۔ جزیات اور مکالموں کی مدد سے وہ جا بجا مزاح کے مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ایسا مزاح، جو طنز کی بنیاد پر کھڑا ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جبکہ 'معزز کھوپڑی' اور 'بلدران کی ملکہ اور 'شمال کا فتنہ' قبائلی ماحول کی تحیر انگیز کہانیاں ہیں، جہاں اچھے برے جذبوں کی کشمکش کے بیچ، زندگی اور انسانیت کے رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ اردو میں یہ انداز شاید ہی کہیں اور ملے۔ ان میں منظر نگاری کے خوبصورت نمونے ہیں تو جاسوسی ناولوں کی طرح کئی زندہ جاوید کردار بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کردار نگاری میں ابن صفی کو ملکہ حاصل تھا۔ ان کے قلم نے خیالی کرداروں کو زندگی بخشی تو، بعض اصل کرداروں کی دلکش تصویریں اتار کر، انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ چنے بیچنے والے ایک گمنام اور معمولی شخص کو، 'استاد محبوب نرالے عالم'، بنا دینا، ابن صفی کا ہی کارنامہ ہے۔

ابن صفی نے اس کے علاوہ، بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی وہ شاعر کے طور پر پہچانے جانے لگے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے بھی روایتی انداز کی غزلیں کہیں، لیکن جلد ہی راستہ بدلا۔ ان کے نمائندہ کلام میں زندگی کے کھٹے میٹھے تجربے سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب جنگ آزادی شباب پر تھی۔ ابن صفی نے اپنے اشعار میں قومی جذبوں کو زبان دی ہے۔ 1942 کے 'انگریز و بھارت چھوڑو آندولن' کے دوران، ان کی ایک نظم 'آخری التجا' کافی مقبول ہوئی تھی۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

وہ دیکھو افق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
پھر باندھے سروں سے اپنے کفن نکلے ہیں فرزندان وطن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہدا کا مدفن
ناموس وطن کی تم کو قسم، لللہ نہ روکو جانے دو
کیوں اشک بھر آئے آنکھوں میں کچھ ضبط کا بھی تو پاس کرو

ابن صفی بابائے قوم گاندھی جی سے بہت متاثر تھے۔ باپو کے قتل پر انھوں نے ایک پر درد مرثیہ بھی کہا تھا:

لویں اداس، چراغوں پہ سوگ طاری ہے
یہ رات آج کی، انسانیت پہ بھاری ہے

ابن صفی دردمند شاعر تھے تو صاحب طرز طنز و مزاح نگار بھی، لیکن افسوس کہ اس طرف ابھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ طنزیہ مضامین کے ایک، دو مجموعے تو شائع ہوئے ہیں، لیکن ان مجموعہ کلام 'متاع قلب و نظر' اب تک منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ ابن صفی نے ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔ دسمبر 1979 میں ان کے ناول 'بے باکوں کی تلاش' پر پاکستان میں 'دھماکہ' نام سے ایک فلم بھی بنی تھی۔ اس کا اسکرین پلے اور ڈائلاگ ابن صفی نے ہی لکھے تھے۔ 1977 میں ابن صفی نے پی ٹی وی کے لیے ایک جاسوسی سیریل بھی لکھا، لیکن سیاسی مصلحتیں، روڑا ابن گئیں اور یہ سیریل ٹیلی کاسٹ نہ ہو سکا۔

اردو پر ابن صفی کا بڑا احسان ہے۔ شاعری سے لے کر افسانوی ادب تک، مختلف اصناف پر ان کے دستخط نمایاں نظر آتے ہیں، لیکن ان کی بنیادی شناخت جاسوسی ناول نگار کی ہے۔ ان کی تحریروں نے، لوگوں میں لکھنے، پڑھنے کا شوق پیدا کیا، گفتگو کا سلیقہ بخشا۔ ان کی جادو بیانی کا اثر ہی تھا کہ بے شمار لوگوں نے ان کے ناول پڑھنے کے لیے اردو سیکھی۔ ساٹھ برس ہو گئے ان کا پہلا ناول منظر عام پر آئے ہوئے۔ 32 برس پہلے موت نے انھیں ہم سے چھین بھی لیا، لیکن وہ زندہ ہیں اپنی دلکش تحریروں میں۔ اپنے لازوال کرداروں میں۔ اپنے لاکھوں قاریوں کے دل میں، دماغ میں۔ نہ ان کی یادیں مدھم پڑیں ہیں اور نہ ان کے ناول باسی ہوئے ہیں۔ اردو کتاب بازار پر اب بھی ابن صفی کا دبدبہ ہے۔ انٹرنٹ پر بھی ابن صفی چھائے ہوئے ہیں۔ بس ابن صفی لکھیے اور پلک جھپکتے ہی ہزاروں صفحات سامنے آجائیں گے۔ مخصوص ویب سائٹس ہیں۔ درجنوں فینس کلب بھی ہیں۔ ناقدین ادب ابن صفی کی خدمات کا اعتراف نہ کریں یا نہ کریں قاری کے دلوں پر وہ کل بھی راج کر رہے تھے اور آج بھی راج کر رہے ہیں۔

◘

Layeeq Razvi, 96/B-3, ARAWLI, SEC.34,NOIDA (UP) 201301

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P31.jpg 1/1

ابن صفی

ابن صفی کی شگفتہ اور مزاحیہ تحریر

قواعد اردو

قواعد اردو

بچو! کبھی تم نے یہ سوچا کہ تم گھر میں پٹتے کیوں ہو؟ تمھارے بزرگ تمھارے مشوروں پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ تم آئے دن بیمار کیوں رہتے ہو؟ اکثر تمھارا معدہ کیوں خراب رہتا ہے؟

تم اگر سوچو تو یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ لہٰذا میں تمھیں بتاؤں گا۔ سنو! ان سب کی ایک ہی وجہ ہے، وہ یہ ہے کہ تم قواعد اردو سے ناواقف ہو۔ پس قواعد اردو وہ علم ہے جس کے نہ جاننے سے آدمی لولا، لنگڑا، گونگا، بہرا، اندھا غرضیکہ بالکل اپاہج ہوجاتا ہے۔

اگر ہم قواعد اردو کو بیچ سے پھاڑ دیں گے تو اس کے دو حصے ہوجائیں گے۔ تب ہم ایک حصے کو علم صرف کہیں گے اور دوسرے کو علم نحو۔

ابھی ہم تمھیں صرف علم صرف کے متعلق کچھ بتائیں گے۔ علم صرف میں سب سے پہلی چیز لفظ ہے۔ لفظ کے معنی لغت میں منہ سے کسی چیز کے پھینکنے کے ہیں مثلاً تھوک، بلغم اور قے وغیرہ۔ اگر کوئی تمھارے منہ پر گھونسہ مارے اور تمھارا ایک دانت ٹوٹ کر گر پڑے تو اسے بھی لفظ ہی کہیں گے۔ دانت ٹوٹنے کے ساتھ ہی اگر خون نکل پڑے اور درد بھی ہونے لگے تو خون اور درد کو معنی کہیں گے ... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دانت خود بخود ٹوٹ کر گر جاتے ہیں نہ خون نکلتا ہے اور نہ درد ہی ہوتا ہے۔ ایسے دانتوں کو مہمل کہتے ہیں جیسے بوڑھوں کے دانت۔

تعریف: پس ثابت ہوا کہ وہ الفاظ جو معنی نہیں رکھتے مہمل کہلاتے ہیں اور معنی دار الفاظ کو کلمہ بھی کہتے ہیں۔

فائدہ: اگر منہ میں ایک بھی لفظ نہ ہو تو حلوہ یا دودھ نصیب ہوتا ہے۔

تنبیہ: دانتوں کی حفاظت کرنا ہر ایک کا فرض ہے ورنہ وہ مہمل ہونے سے پہلے ہی لفظ بن جاتے ہیں اس لیے ہمیشہ کالی نوس منجن اور مسواک برش استعمال کرو۔

جملہ: تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جو بچے تم سے لڑائی میں جیت نہیں پاتے وہ تمھارے دانت کاٹ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بتیسیوں دانت استعمال کرتے ہیں۔ ایک دانت تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر جب بتیسیوں دانت استعمال کیے جاتے ہیں تو تم بلبلا اٹھتے ہو پس ثابت ہوا کہ الفاظ کا ایسا مجموعہ جس سے پوری پوری بات سمجھ میں آجائے جملہ کہلاتا ہے۔

کلمہ کی قسمیں: تم یہ پڑھ چکے ہو وہ لفظ جو معنی رکھتا ہے کلمہ کہلاتا ہے۔ اب ہم تمھیں کلمے کی پہلی پشت سے روشناس کراتے ہیں۔

شجرہ کلمہ، کلمہ، اسم، ضمیر، فعل، صفت، حرف

اسم اور اس کی قسمیں: اسم وہ کلمہ ہے جس کے بغیر زندگی تلخ ہوجائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں، اسم معرفہ اور اسم نکرہ۔

اگر تم کسی سے اس کا اسم شریف دریافت کرو اور وہ جواب دے دے تو ہم اسے اسم معرفہ کہیں گے جیسے رام کھلاون، محمد فاضل اور ایڈورڈ ہشتم وغیرہ۔

اگر تم کسی سے اس کا اسم شریف دریافت کرو اور وہ جواب نہ دے پائے تو وہ اسم نکرہ کہلائے گا جیسے بکرا، کتا، چمگادڑ، چھپر کھٹ، چرکٹ اور مونگ پھلی وغیرہ۔

فائدہ: اکثر اسم شریف دریافت کرنے پر لوگ رشتہ دار نکل آتے ہیں۔

تنبیہ: خبردار کبھی کسی ایسے کتے سے اسم شریف نہ پوچھنا جس سے تمھاری اچھی طرح جان پہچان نہ ہو ورنہ تمھیں معلوم کر کے بہت مایوسی ہوگی کہ جسے تم اسم نکرہ سمجھ رہے تھے وہ جملہ نکلا۔

اسم کی قسمیں گنتی کے لحاظ سے: گنتی کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں:

(1) واحد (2) جمع۔

واحد: وہ اسم ہے جو کسی تنہا چیز کے لیے بولا جائے، الو، ٹماٹر، اونٹ، اود بلاؤ وغیرہ۔

تنبیہ: یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ دنیا میں بہتیری ایسی چیزیں بھی ہیں جو بیک وقت واحد اور جمع دونوں ہوتی ہیں جیسے پائجامہ جو نیچے سے جمع اور اوپر سے واحد ہوتا ہے۔

اسم کی قسمیں بلحاظ جنس: اللہ پاک بڑا مسبب الاسباب ہے اس نے ہر نر کے لیے مادہ اور ہر مادہ کے لیے نر پیدا کیا ہے۔ جنس کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں: (1) مذکر (2) مونث۔

مذکر: ایسے اسموں کو مذکر کہتے ہیں جو نر کے لیے بولے جائیں جیسے حرامزادہ، الو کا پٹھا اور سور کا بچہ۔

مونث: ایسے اسموں کو مؤنث کہتے ہیں جو مادہ کے لیے بولے جائیں جیسے حرام زادی، الو کی پٹھی اور سور کی بچی۔

ضمیر اور اس کی قسمیں: ضمیر بہت فائدہ مند چیز ہے اگر تم خوف کی وجہ سے کسی کا اسم شریف نہ بتا سکو تو اس کی جگہ بے دھڑک ضمیر استعمال کر سکتے ہو مثلاً والد صاحب کی جگہ 'وہ' اور ڈنڈے کی جگہ 'یہ'

متکلم ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیت کو کہتے ہیں اور حاضر غائب سمجھنے کے لیے روزانہ اپنے کلاس کے رجسٹر کا مطالعہ کیا کرو۔

فعل اور اس کی قسمیں: فعل وہ کلمہ ہے جس کی جگہ مشینیں لے لیتیں تو زیادہ اچھا تھا۔

بلحاظ معنی فعل کی دو قسمیں ہیں: فعل لازم اور فعل متعدی۔

اگر تم کسی گدھے کو چھیڑو تو اسے لازم ہے کہ تمھارے ایک عدد لات رسید کردے۔ پس لات مارنے کے فعل کو فعل لازم کہتے ہیں۔ کلاس میں اگر تم سے فعل لازم کی تعریف پوچھی جائے تو فوراً ایک گدھا تلاش کرو۔ اگر گدھا نہ ملے تو تم خود ہی ماسٹر صاحب کو فعل لازم اچھی طرح سمجھا دو۔ اگر امتحان میں ایسا کرو گے تو ہمیشہ اول آؤ گے۔

فعل متعدی کو مرض متعدی بھی کہتے ہیں جیسے تپ دق ہو جانا، ہیضہ ہونا، طاعون آنا، گردن توڑ بخار آنا وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ: فعلوں میں زمانے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں (1) ماضی (2) حال (3) مستقبل

حال: قوالی سنتے سنتے بعض بزرگ اچھلنے کودنے لگتے ہیں یہی حال کہلاتا ہے اکثر بڑے کمرے کو بھی کہتے ہیں۔ مگر ایسی صورت میں جب اس میں ہائے خطی کی بجائے ہائے ہوز ہو۔

مستقبل: ہر وہ چیز جو قطعی لغو ہو مستقبل کہلاتی ہے۔ بلکہ بعض علما کی رائے تو یہ ہے کہ مستقبل کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس لیے جو چیز تمھاری سمجھ میں نہ آئے اسے مستقبل ہی سمجھو۔

ماضی: یہ ایک قسم کا نشہ ہے۔ مختلف قسم کی منشیات کی آمیزش سے کئی قسم کے ماضی بنتے ہیں۔

(1) ماضی قریب: ہلکا سا نشہ جو کسی سخت قسم کے تمباکو سے آجائے۔

(2) ماضی بعید: شراب میں افیون گھول کر پینے سے جو نشہ آجائے۔

(3) ماضی شکیہ: وہ شخص جو خود تو شراب پیتا ہو لیکن اپنی بیوی کے چال چلن پر شک ہونے کی بنا پر اسے قتل کر کے کہیں فرار ہو جائے ایسے فعل کو ہم ماضی شکیہ کہیں گے۔

ماضی استمراری: یہ کم از کم پندرہ قسم کی منشیات کی آمیزش سے تیار ہوتا ہے۔ بعض اوقات اسے استمراری بندوبست بھی کہتے ہیں۔

ماضی تمنائی: شراب کی تمنا دل میں لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جانا۔

ماضی شرطیہ: شرط باندھ کر شراب پینا۔

تنبیہ: خبردار کلاس میں ماضی و حال کی مشق ہرگز نہ کرنا ورنہ نتیجے کے تم خود ذمہ دار ہوگے۔

مضارع: یہ ایسا فعل ہے کہ اس سے حال اور مستقبل دونوں سمجھے جاتے ہیں یعنی ایسی اچھل کود جو قطعی سمجھ میں نہ آئے۔

تنبیہ: اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم کسی لیڈر کو تقریر کرتے دیکھ کر اس کے فعل کو مضارع سمجھ لو ممکن ہے کہ جس زبان میں وہ تقریر کر رہا ہو وہ تمھاری سمجھ سے بالاتر ہو...

فعل امر: یہ ایسا فعل ہے جسے تم ہرگز پسند نہ کرو گے اس لیے اس کی تعریف نہ کی جائے۔

فعل نہی: چھٹی ہونے سے قبل ہی اسکول سے کھسک لینے کو فعل نہی کہتے ہیں۔

تنبیہ: فعل نہی کی مشق روزانہ کرو ورنہ تمھارے پاس ہونے کی ذمے داری نہ لی جائے گی۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھو کہ فعل کے ساتھ فاعل کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم فاعل مہیا نہ کر سکو تو اسی وقت بری الذمہ ہو سکتے ہو جب فاعل کا میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کر دو اور ہاں دیکھو بعض اوقات فعل اور فاعل کے ساتھ ایک عدد مفعول بھی درکار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر گھبرانا نہ چاہیے ... ایسی صورت میں ہمیشہ فاعل کو رشوت دے کر منا لو... خدا نے چاہا تو وہ خود ہی اپنے مفعول ہونے کا بھی اعلان کر دے گا... اس لیے کہ رشوت بڑے بڑے دیش سیوکوں تک کو سیدھا کر دیتی ہے۔

صفت: (1) کلوٹی لڑکی (2) ولایتی الو (3) پانچویں بندریا۔

اوپر کی مثالوں میں لڑکی، الو اور بندریاں کے متعلق کچھ کہا گیا ہے جو کچھ کہا گیا ہے وہی ان تینوں کی صفت ہے۔ جس کی صفت بیان کی جاتی ہے اسے موصوف کہتے ہیں اس طرح لڑکی، الو اور بندریا موصوف ہوئے اور کلوٹی، ولایتی اور پانچویں صفت۔ پس ثابت ہوا کہ وہ کلمہ جو کسی کی چغلی کھائے اسے صفت کہتے ہیں اور جس کی چغلی کھائی جائے اسے موصوف کہتے ہیں۔

تنبیہ: ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ پاک چغلخور کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ لہٰذا جب کبھی کلاس میں صفت پڑھائی جانے لگے تو فوراً واک آؤٹ کر جاؤ اگر اس پر بھی ٹیچر باز نہ آئے تو اسکول میں اسٹرائک کرا دو۔

صفت کی تین قسمیں ہیں: (1) صفت مشتبہ (2) صفت نسبتی (3) صفت عددی ۔ وہ صفت ہمیشہ اپنے موصوف کی چغلی کھاتی رہے صفت مشتبہ کہلاتی ہے۔

وہ صفت جو صرف نسبت ہی نہیں بلکہ شادی بھی کرا دے صفت نسبتی کہلاتی ہے۔

صفت عددی وہ نامعقول صفت ہے جس میں اعداد اور ہند سے پائے جاتے ہیں۔ تم اس کے متعلق کچھ معلوم کرنا ہرگز پسند نہ کرو گے۔

حرف: حرف وہ کلمہ ہے جو اردو کی ابتدائی کتابوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

حرف کی قسمیں: حرف جار ... اس کو مرتبان بھی کہتے ہیں۔ یہ اچار چٹنی اور مربے وغیرہ رکھنے کے کام میں آتا ہے۔

حرف ندا: اس کو کوہ ندا بھی کہتے ہیں۔ اس کا پتہ طائی کے بیٹے حاتم نے لگایا تھا۔

حرف مندبہ: وہ کلمہ ہے جسے حاملہ عورتیں بکثرت استعمال کرتی ہیں۔ جیسے مٹی، لیموں، امچور وغیرہ۔ اس کلمے کو استعمال کرنے والے کو مندوب کہتے ہیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ مندوب نہیں مجذوب کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حرف عطف: وہ کلمہ ہے جسے کسی کا سایۂ عاطفت نہ نصیب ہو۔

حرف استثنا: بات کرتے وقت چھینک یا کھانسی آجائے تو اسے حرف استثنا کہیں گے۔

حرف علت: یہ دراصل حرف علالت تھا کثرت استعمال کی وجہ سے حرف علت رہ گیا۔ مراد اس سے وہ کلمہ ہے جو مرنے کے بعد بیماروں کو کھلایا جاتا ہے تاکہ قبر میں بھی کوئی بیماری نہ ہونے پائے۔

حرف شرط اور جزا: وہ کلمہ جو شرط بد کر دوڑنے پر گر پڑنے کے بعد منہ سے نکلے حرف جزا کہلاتا ہے۔ اگر گر پڑنے والے کے والدین آپس میں شرط بد کر اسے دوبارہ دوڑا دیں ہم اسے حرف شرط کہیں گے۔

بچو! علم صرف کا بیان ختم ہو گیا۔ اب تمھیں تحلیل صرفی کرنا سکھایا جائے گا۔

تحلیل صرفی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک جملہ لکھ لو پھر اس کے ٹکڑے کر دو۔ اگر ٹکڑے برابر کے نہ ہوں تو کسی بڑھئی سے مدد لو۔ اگر جملہ ملائم ہو تو ٹکڑے کرنے سے بہتر یہ ہوگا کہ اس کا قیمہ کر لو۔ ایسے قیمے کو تحلیل صرفی کہیں گے۔

قواعد اردو کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ دوسرے حصے میں تم علم نحو کا بیان پڑھو گے.. اسے پڑھ کر تم اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی توانائی محسوس کرو گے... تم نے حکیم اجمل خان مرحوم کا نام ضرور سنا ہوگا۔ ان کے دواخانہ کی ساری دوائیں ترکیب نحوی ہی سے تیار کی جاتی تھیں۔ اسٹیفن نے جو انجن تیار کیا تھا اس میں بھی ترکیب نحوی لگائی تھی۔ مشہور سائنسداں فرنکلن ٹوسٹ پر مکھن کی بجائے ترکیب نحوی لگا کر کھاتا تھا۔ اس لیے وہ آسمان پر چمکنے والی بجلی کو گرفتار کر کے تمھاری تاریک گلیوں کو چمکانے میں کامیاب ہوا۔ زیادہ تعریف خلاف قانون ہے۔ اگر اس کے آگے معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری لکھی ہوئی کتاب قواعد اردو کا دوسرا حصہ نکال کر پڑھو.. تمام پرائیویٹ حالات کھول کھول کر لکھ دیے گئے ہیں۔

ماخذ: شیطان صاحب ابن صفی مزاحیہ مضامین)، ناشر: ادارہ کتاب گھر

■

■ ابن صفی

ابن صفی کے نثری جواہر پارے

■ طنز و مزاح میرا فن نہیں بلکہ کمزوری ہے۔ کمزوری اس لیے کہ میں صاحب اقتدار نہیں ہوں۔ صاحب اقتدار و اختیار ہوتا تو میرے ہاتھ میں قلم کی بجائے ڈنڈا نظر آتا اور میں طنز کرنے یا مذاق اڑانے کی بجائے ہڈیاں توڑتا دکھائی دیتا۔ (الحمدللہ کہ میری یہ کمزوری قوم کی عافیت بن گئی اور قوم بلا سے واہ واہ نہ کرے، اسے ہائے ہائے تو نہیں کرنی پڑے گی۔ اس قلمدان کے لیے یہی بہت ہے)

■ اِدھر اُدھر کی باتوں میں آدمی ہمیشہ ننگا ہو جاتا ہے۔ یعنی تمھاری روح اور فرشتے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لازمی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔

تم اِدھر اُدھر کی باتوں میں غیر شعوری طور پر اپنے کردار کی جھلکیاں دکھاتے چلے جاؤ گے۔ (ناول: رائفل کا نغمہ)

■ ''ہر افواہ کے پیچھے کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے۔'' (ناول: شاہی نقارہ)

■ ''ایک بار کوئی نظریہ قائم کر لینے کے بعد اُس کا اس سے ہٹ جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ منہ میں پانی لے کر سیٹی بجانا۔'' (ناول: شاہی نقارہ)

■ ''اکثر محبت کرنے والے محبوب کی موت نہیں برداشت کر سکتے۔'' کہانیاں ہیں فرزند... جب ایک ماں جوان بیٹے کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتی ہے تو یہ سب قطعی بکواس ہے۔'' (ناول: خوفناک منصوبہ)

■ ''میں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم، جرائم نہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے۔'' (ناول: جونک کی واپسی)

■ ''جو عبادت آدمی کو آدمی نہیں بنا سکتی میں اس عبادت کے بارے میں اپنی رائے محفوظ کرنے پر مجبور ہوں۔'' (ناول: صحرائی دیوانہ حصہ دوم)

■ میں کہتا ہوں! اگر تم قانون کو ناقص سمجھتے ہو تو اجتماعی کوششوں سے اسے بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اگر اس کی ہمت نہیں ہے تو تمھیں اسی قانون کا پابند رہنا پڑے گا! اگر تم اجتماعی حیثیت سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے متفق ہو۔ اب اگر متفق ہونے کے باوجود بھی تم اس کی حدود سے نکلنے کی کوشش کرو تو تمھاری سزا موت ہی ہونی چاہیے۔ (ناول: لاش کا بلاوا)

■ ''ایک پرندے کو سنہرے قفس میں بند کر کے دنیا کی نعمتیں اس کے لیے مہیا کر دو لیکن کیا وہ پرندہ تمھیں دعائیں دے گا؟'' (ناول: دشمنوں کا شہر)

■ ''یہ آدمی کے چھچھورے پن کی کہانی ہے اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتیں جو اپنے اقتدار کے لیے رسہ کشی کر رہی ہیں، اس سے بھی زیادہ گر سکتی ہے۔ ان کے بلند بانگ نعرے جو انسانیت کا بول بالا کرنے والے کہلاتے ہیں زہر آلود ہیں۔'' (ناول: وبائی ہیجان)

■ ''تمھارے ذہن میں قناعت کا تصور بہت ہی گھٹیا قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ قناعت سے شاید تم یہ مراد لیتے ہو کہ آدمی تارک الدنیا ہو جائے۔ ملے تو کھائے ورنہ فاقے کرے۔ حالانکہ قناعت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ قناعت کا مطلب ہوس سے دامن بچانا ہے۔'' (ناول: ہولناک ویرانے)

■ ''چالاک بن کر کیا کروں گی۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ سیدھے سادے آدمیوں کی طرح زندہ رہو اور خوشیاں سمیٹتے رہو۔ دوسروں کی چالاکی ہمیں اسی لیے دل گرفتہ کر دیتی ہے کہ ہماری چالاکی مات کھا گئی ہے۔'' (ناول: خونریز تصادم)

■ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے تجربات ان کی سمجھ سے باہر تھے کہ ایک آدمی جب پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں؟ اور جب کوئی قوم پاگل ہو جاتی ہے تو 'طاقتور' کیوں کہلانے لگتی ہے؟ (ناول: انوکھے رقاص)

■ ''آدمی خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو، اگر معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہے تو کسی حقیر چیونٹی ہی کی طرح ایک نہ ایک دن خاک میں مل جائے گا۔'' (ناول: زہریلا آدمی)

■ ''آدمی کی حقیقت اس کا جسم نہیں بلکہ دماغ ہے۔ گوشت اور ہڈیوں کا ڈھیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ آدمی کا دماغ ہی اُسے سربلند کرتا ہے۔ دنیا اُس کے قدموں پر جھکتی ہے اور جب یہ دماغ ناکارہ ہو جاتا ہے تو قدموں پر جھکنے والے اُسی گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کو پکڑ کر کسی پاگل خانے میں بند کر دیتے ہیں اور دو پیسے کے آدمی اُس پر ڈنڈے برسایا کرتے ہیں۔'' (ناول: پانی کا دھواں)

■ ''میں عموماً بنجر زمینوں پر کاشت کرتا ہوں اور کچھ نہیں تو کانٹے دار پودے ہی اُگا لیتا ہوں اور وہ کانٹے میرے لیے خون کی بوندیں فراہم کر دیتے ہیں۔'' (ناول: مہکتے محافظ)

■ ''آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جب کہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اُسے اپنی سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا پڑے گا۔'' (ناول: کالی تصویر)

■ ''خدا کے وجود کا منکر ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تمھیں ہر کس و ناکس پر اپنے باپ ہونے کا شبہ ہوتا ہوگا۔'' (ناول: پاگلوں کی انجمن)

■ ''ایک نیکی ہزار نیکیوں کو جنم دیتی ہے اور نیکی کے لیے دل پر صبر کرنا پڑتا ہے اسی دانے کی طرح خاک میں ملنا پڑتا ہے۔'' (ناول: بلی چیختی ہے)

■ ''یہ ایٹم کا زمانہ ہے۔ وہ زمانہ لد گیا جب شہرت لوگوں کے پیچھے دوڑتی تھی اب شہرت کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔'' (ناول: ڈیڑھ متوالے)

■ ''اپنے وجود ہی کی مستی کیا کم ہے کہ کسی نشہ کا سہارا لیا جائے۔'' (ناول: صحرائی دیوانہ حصہ دوم)

- ''ذہین سے ذہین مرد بھی جنسیت کے معاملے میں معمولی آدمیوں سے مختلف نہیں ہوتا۔'' (ناول: پراسرار وصیت)
- ''آدمی جب درندگی پر اتر آتا ہے تو جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی کتے کو دوسرے کتے کا گوشت کھاتے دیکھا ہے۔'' (ناول: سانپوں کا مسیحا)
- ''پندرہ دن ہوئے پاگل خانے سے بھاگا ہوں۔ سیٹھ سے ملاقات نہ ہوگئی ہوتی تو سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیتا۔'' (ناول: بابا سگ پرست)
- ''میں شراب نہیں پیتا'' حمید نے کسی قدر ترشی سے کہا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے بغور دیکھتی رہی پھر پوچھا ''کیوں نہیں پیتے۔''
- ''اس لیے کہ مسلمان ہوں۔''، ''تو مذہبی آدمی——''، ''یقیناً'' (رلانے والی)
- "بیکار باتیں نہ کرو... یہ تو حسن و عشق ہی کی سرزمین ہے... میں نے تمھارے یہاں کی کہانیاں سنی ہیں... پڑھی ہیں! وہ کون تھے... ہیر اور رانجھا...!

ان کا تو نام ہی نہ لو...! عمران برا سا منھ بنا کر بولا۔

کیوں! ان کی داستان تو ساری دنیا میں مشہور ہے۔

بعد کے حالات سے تم واقف نہیں ہو۔ خبروں پر سنسر ہو گیا تھا اور بعد کے حالات دنیا کو نہیں معلوم ہو سکے تھے۔

کیسے حالات..!

''وہ دونوں راوی کے کنارے ملا کرتے تھے۔ عشق ہو گیا۔ ہیر دراصل وہاں کپڑے دھونے آیا کرتی تھی۔ رانجھا اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ہاتھ کیا بٹانے لگا ہیر کو تو الگ بٹھا دیتا اور خود ہی اس کے کپڑے دھو دھا کر ڈھیر لگا دیتا۔ اچانک ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اسے تقریباً ڈھائی سو کپڑے روزانہ دھونے پڑتے ہیں۔ تب اسے ہوش آیا اور بری طرح بوکھلا گیا... اس نے ہیر کی طرف دیکھا جو کچھ دور گھاس پر بیٹھی لسی پی چکنے کے بعد نسوار کی چٹکی چلانے جا رہی تھی... مگر وہ صرف دیکھ کر ہی رہ گیا کچھ بولا نہیں۔ لیکن اسے چونکہ تشویش ہو گئی تھی اس لیے وہ نچلا نہیں بیٹھا! کپڑے تو اسے بہرحال دھونے پڑتے تھے اس سے جو وقت بچتا تھا اس معمے کو حل کرنے میں صرف کر دیتا۔ اب اسے ہیر سے عشق جتانے کا بھی کم موقع ملتا تھا۔

ویسے وہ لسی کا گھڑا سامنے رکھے بیٹھی اس کا دل بڑھایا کرتی تھی آخر ایک دن یہ راز کھل ہی گیا۔ بیچارے رانجھے کو معلوم ہوا کہ ہیر کے بھائی نے مال روڈ پر ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔ بس وہ غریب وہیں پٹ سے گرا اور ختم ہو گیا یہ ہے اصلی داستان ہیر رانجھا کی۔ (ناول سوالیہ نشان)

- آدمی نے خود ہی اپنی زندگی میں زہر بھرا ہے اب خود ہی تریاق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے پڑوس تک بھی اس کی پہنچ نہیں ہے پڑوسی سے اس لیے متنفر ہے کہ وہ بدصورت ہے۔ حسن ازل سے ہی آنکھیں سینکنا چاہتا ہے لیکن وہ اندھا ہے اگر اسے بدصورتی ہی میں وہ جلوہ نہیں نظر آتا جس کی اسے تلاش ہے۔ یا خدا آدمی کو عقل دے۔ انسانیت کا مستقبل محفوظ کر۔ (ناول: لاشوں کا آبشار)
- ہمارے ملک کی پستی، خرابی اور تباہی کی سب سے بڑی وجہ دولت کی ہوس ہے۔ حصولِ زر کے لیے کسی بھی قسم کے ذرائع استعمال کرنے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کی جاتی۔ اسمگلنگ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور ہوس زر کی آخری حد وطن فروشی ہے۔ (ناول: اونچا شکار)
- عورت اور بے بس۔ دنیائے عورت کی تاریخ مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو جس کی زبان بس میں نہ ہو اُسے بے بس کہنا کسی طرح درست نہیں۔ ابن صفی (ناول: اپنوں کی یلغار)
- میں آدمی نہیں بن سکتا کیونکہ مجھے جانوروں کو ایک خوش خبری سنانی ہے۔ میں انھیں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ وہ آدمی سے افضل ہیں کیونکہ وہ صرف پیٹ بھرنے کی حد تک جانور ہیں لیکن آدمی ہر جذبے کی تسکین کے لیے جانور بن جاتا ہے۔ (ابن صفی)
- حماقتوں میں تو بہت زیادہ سوچ اور سمجھ کر دخل ہوتا ہے۔ ہر احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس نے افلاطون کی قبر پر لات مار دی ہے۔ لیکن اپنے افعال کی پرکھ اس کے ذمے نہیں ہوتی دوسرے اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ فعل دانشمندانہ تھا یا احمقانہ۔ (ناول: صحرائی دیوانہ)
- دفعتاً عمران چلتے چلتے رک گیا۔ صفدر بھی رُکا اور عمران کو سوالیہ نظروں سے دیکھا میرا دل چاہتا ہے کہ میں سڑک پر ناچنا شروع کروں۔ اگر آپ ایسا کر بیٹھے تو میں اسے دیوانگی کہوں گا، عمران صاحب، تم دیوانوں کی سی باتیں کر رہے ہو صفدر اگر تمھیں دنیا میں کبھی کوئی ہوش مند آدمی مل جائے تو بھی اس کے پتے ضرور آگاہ کرنا میں اُسے کسی عجائب گھر میں رکھوا دوں گا تاکہ دیوانے اُسے دیکھ کر محفوظ ہو سکیں اگر میں اس سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو تم مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے ہیں۔ انھیں اعزاز ملتے ہیں۔ ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں۔ بھاگو صفدر میں ناچنے جا رہا ہوں.... بھاگو ورنہ میرے ساتھ تم بھی بند کر دیے جاؤ گے۔ بھاگو... (اقتباس از گیند کی تباہ کاری)

یک سطری شہ پارے

- کوئی بھی فن معصومیت اور پاکیزگی کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا۔
- خدا جاہل والدین سے بچائے۔
- یہ زندگی الفاظ ہی کا تو کھیل ہے۔
- ہر آدمی اپنے ماحول سے اکتایا ہوا ہے۔
- آدمیت کی معراج صرف بانٹ کر کھانے میں مضمر ہے۔
- اصل چیز محنت ہے، دولت نہیں۔
- جو بھی اپنی حدود سے تجاوز کرے گا دشواری میں ضرور پڑے گا۔
- اپنی پسند کے لوگ تلاش کیے جاتے ہیں یونہی نہیں مل جایا کرتے۔
- اگر سب عقل مند ہو جائیں تو زندگی ریگستان بن کر رہ جائے گی۔
- فنکاروں کے یہاں تکلفات کو دخل نہ ہونا چاہیے۔
- میں خود کو بے بس سمجھنے کا عادی نہیں ہوں۔
- آدمی کتنا گر سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔
- تمھیں زیادہ سے زیادہ وقت کسی کام پر صرف کرنا چاہیے۔
- دنیا کی ہر عورت بحیثیت بیوی کریک ہوتی ہے۔
- شادی شاید اس چڑیا کو کہتے ہیں جو رات کو بولتی ہے اور دن کو کہیں نہیں دکھائی دیتی۔
- عورتوں کی ہم نشینی سے خدا ہر شریف آدمی کو محفوظ رکھے۔
- لڑکیوں کی موجودگی میں انتہائی سنجیدہ لوگ بھی شیخیاں بگھارنے لگتے ہیں۔
- اللہ ناٹے کو لمبی اور لمبے کو ناٹی عورت سے بچائے...
- ہر لڑکی کے معاملے میں خدا سے ڈرنا چاہیے۔
- موٹی محبوبائیں لاش کے سینے پر رکھا ہوا پتھر بن جاتی ہیں۔
- بوڑھی محبوبائیں لات مارنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔
- عورت بجائے خود ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ اتنی بڑی کہ مرد پیدا کرتی ہے۔
- حسن جہاں بھی نظر آئے اسے پوجنا ہی چاہیے۔ خواہ وہ کتے کے پلّے ہی میں کیوں نہ نظر آئے۔

ماخذ: ابن صفی بلاگ اسپاٹ، ان

3/21/2018 P36.jpg (1617×2253)

▪ ابن صفی

ابن صفی کے منتخب کلام

منتخب اشعار

جو کہہ گئے وہ ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ کیا چیز ہوتی

—

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا کسی روز یہ خورشیدِ انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

—

جانے کیسی یاد کا پتھر بیتے دنوں سے آیا تھا
شیش محل خوابوں کے سارے پل میں چکنا چور ہوئے
آس پڑوس کے لوگ بھی تم کو پہچانیں تو بات بھی ہے
جگ بیتی لکھ لکھ صفی جی یوں تو بہت مشہور ہوئے

نظمیں

ماں!

اک بچہ
اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے
اس میلے میں
اب کیا ہوگا؟
کون اسے گھر لے جائے گا
حیراں حیراں دیکھ رہا ہے
چاروں طرف چہرے ہی چہرے
دھندلے چہرے
کیا یہ، اس کو پہچانیں گے؟
کیا یہ، اسے گھر تک پہنچا دیں گے؟
کوئی نہیں
سب ان دیکھے انجانے ہیں
سہما سہما چیخ رہا ہے
ماں!
ماں!!
ماں!!!

آخری التجا

(یہ نظم اُن پاک روحوں کے نام معنون کرتا ہوں جنھوں نے وطن پر اپنا سب کچھ قربان کردیا)

وہ دیکھو اُفق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہدا کا دامن
پھر باندھے سروں سے اپنے کفن نکلے ہیں فرزندان وطن
ہے جان وطن کی تم کو قسم للہ نہ روکو جانے دو
دیکھو تو روانی دریا کی کس طرزِ الم سے بہتا ہے
بے تابی دل کا افسانہ موجوں کی زبانی کہتا ہے
ہر موج ہے رقصاں آنکھوں میں دل بستہ طوفاں رہتا ہے
موجوں کی قسم طوفاں کی قسم للہ نہ روکو جانے دو
ہے شمع فروزاں آہوں کی رقصاں غم کا پروانہ ہے
اشکوں کی برستی لڑیوں کا بکھرا ہوا دانہ دانہ ہے
شہدائے وطن کی روحوں تک پیغام وطن لے جانا ہے
یہ فرض بھی پورا ہونے دو للہ نہ روکو جانے دو
وہ دیکھ فضائیں چونک اٹھیں نعروں کی صدا لہراتی ہے
سفاکوں کا سینہ توڑ چکیں کہسار کا دل لرزاتی ہے
اس پار کھجوروں کے اوپر پرچم اپنا لہراتی ہے
اب دیر ہوئی جاتی ہے مجھے للہ نہ روکو جانے دو
کیوں اشک بھر آئے آنکھوں میں کچھ ضبط کا بھی تو پاس کرو
امید کے گہوارے دل کو للہ نہ وقف یاس کرو
تم بھی تو وطن کی بیٹی ہو کچھ فرض کا بھی احساس کرو
ہاں میں بھی تو ہوں فرزند وطن للہ نہ روکو جانے دو
گر راہِ وفا میں کام آؤں سیندور سے مانگ بھرے رہنا
بندی نہ مٹانا ماتھے کی تم سینے میں آس رکھے رہنا
میں خواب میں اکثر آؤں گا تم مری راہ تکے رہنا
اب چھوڑ بھی دو میرا دامن للہ نہ روکو جانے دو

غزلیں

راہِ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشکِ غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
تنہائی ہی تنہائی ہے کیسے کہیں کیسے سمجھائیں
چشم ولب و رخسار کہ تہ میں روحوں کے ویرانے ہیں
اُف یہ تلاشِ حسن وحقیقت کس جا ٹھہریں جائیں کہاں
صحنِ چمن میں پھول کھلے ہیں صحرا میں دیوانے ہیں
ہم کو سہارے کیا راس آئیں اپنا سہارا ہیں ہم آپ
خود ہی صحرا خود ہی دوانے شمع نفس پروانے ہیں
اپنے وجود کی مستی ہے ہم رندوں کے احوال نہ پوچھ
قدم قدم پہ چھیڑ خرد سے نفس نفس میخانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

گر وقت کڑی دھوپ ہی بن جائے تو کیا ہو
وہ پھول سا چہرہ بھی جو کمھلائے تو کیا ہو
موجِ مئے گلرنگ کی لرزش ہے کہ رفتار
اے بادہ وشو یوں جو چھلک جائے تو کیا ہو
ڈسنے کو چڑھی آتی ہے ناگن سی شبِ تار
صندل سا بدن بھی جو نہ یاد آئے تو کیا ہو
اس بت کی رگِ جاں کے قریں بھی تو وہی ہے
واعظ کی سمجھ میں جو یہ آجائے تو کیا ہو
انگڑائی ہے یا جام سے ابلی ہوئی صہبا
ایسے میں کوئی پی کے بہک جائے جو کیا ہو
توبہ بھی کروں اور گھٹائیں بھی نہ اٹھیں
پر زلفِ سیہ ابر سی لہرائے تو کیا ہو
اے ماہ وشو، گلبدنو، عشوہ طرازو
تم کو بھی کوئی گر یونہی ترسائے تو کیا ہو
▪

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P36.jpg 1/1

3/21/2018 P37.jpg (1622×2253)

محمد احسن

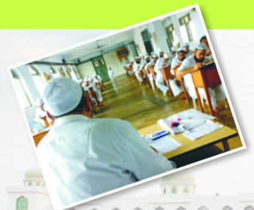

اردو میڈیم اور فاصلاتی تعلیم مسائل اور چنوتیاں

(اردو یونیورسٹی کے خصوصی حوالے سے)

تبدیلی ایک ناگزیر قدرتی عمل ہے۔ اس کی رفتار کا انحصار وقت اور مقام کی نوعیت پر ہے۔ کہیں یہ رفتار تیز ہوتی ہے اور کہیں سست۔ کسی بھی نظام کی افادیت اور بقا کا انحصار اس بات میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ نظام اپنے حالات کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق کس طرح کا ردِّ عمل ظاہر کرتا ہے۔ تعلیم کے شعبے میں یہ بات مزید اہمیت کی حامل ہے جہاں علم کی سرحدیں روز بروز وسیع ہوتی جارہی ہیں۔ نتیجتاً تبدیل شدہ منظر نامے میں ماضی کے طریقہ کار فرسودہ ہوتے جارہے ہیں۔ موجودہ دور میں حصولِ علم کے ذرائع اور وسائل اتنے متنوع اور وسیع ہوچکے ہیں کہ سیکھنے کا عمل اب کسی مخصوص ادارے کا محتاج نہیں۔ ہندوستانی پس منظر میں تعلیم کا طریقہ کار، اس کی ترسیل کا مکینزم، اعلیٰ تعلیم میں تبدیلی وغیرہ کی رفتار دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے سست رہی ہے۔ اس کی وجہ حصول تعلیم کا وہ نظام ہے جو اپنے نقطہ نظر کی رو سے Elitist ہے کیوں کہ یہ نظام طبقہ اشرافیہ اور حکمراں طبقے کو ذہن میں رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ اس وقت تعلیم کا دائرہ محدود تھا ،عوامی تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ خوش قسمت اور اونچی ذات سے تعلق رکھنے والے چند ہی لوگ تھے جو اس نظام تعلیم کا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی سطح پر اعلیٰ تعلیم کے طریقہ کار اور حصول و ترسیل میں بڑے پیمانے پر تبدیلی رونما ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا نظام، جہاں پہلے صرف طبقہ اشرافیہ کی رسائی تھی وہ عوام تک پہنچنے لگی۔ نتیجے کے طور پر تعلیم کے میدان میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ جمہوریت کا عمل دخل طرز حکومت کے ساتھ ساتھ طرز زندگی میں بھی بڑھا تو تعلیم کے حصول کے رجحان میں خاصی تیزی آئی۔ ہمارا روایتی تعلیمی نظام ضرورت کے لحاظ سے ناکافی ثابت ہونے لگا تو طلبا کی کثیر تعداد کے لیے ایک نیا فاصلاتی تعلیمی نظام متبادل کے طور پر ابھرا۔ نتیجے کے طور پر تعلیمی نظام میں اس بات کی گنجائش رکھی جانے لگی کہ ہر خاص و عام بغیر کسی رکاوٹ یا دشواری کے اپنی سہولتوں اور ضرورتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرسکے۔

> عالمی سطح پر اعلیٰ تعلیم جو پہلے بنیادی طور پر کالج / یونیورسٹی مرکوز ہدایتی نظام تھا اس کی جگہ طلبہ مرکوز مربوط نیٹ ورک ماڈل (Learner Centred Integrated Network Model) نے لے لی۔ جہاں طلبہ کے نصابی مسائل کا حل ممکن ہو نیز انھیں سیکھنے کے وسائل تک رسائی حاصل ہو۔ اور یہ تمام چیزیں طالب علموں کی پہل پر مبنی ہوں۔

اس طرح اوپن و فاصلاتی نظامِ تعلیم دھیرے دھیرے عالمی سطح پر رائج ہونے لگا۔ مزید صنعت کاری کے بعد پوری دنیا میں رسمی نظامِ تعلیم اقتصادی و سماجی ترقی کے لیے افرادی قوت کی تربیتی ضروریات پورا نہیں کر پارہا تھا۔ اس لیے تربیت کے لیے نئے اور سستے ذرائع و نظام کی تلاش کی جانے لگی۔ تعلیمی منصوبہ سازوں کے درمیان اس بات پر اتفاق ہے کہ فاصلاتی تعلیم ترقی پذیر ممالک کے بہت سے تعلیمی و تربیتی مسائل کا حل ہے۔ نیز فاصلاتی تعلیم میں ٹکنالوجی کے استعمال نے اسے پُرکشش و صارف دوست بنادیا ہے۔

ہندوستان میں اس وقت اوپن اور فاصلاتی نظام تعلیم کو اختیار کرنے والی 14 یونیورسٹیاں ہیں، جس میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ روایتی یونیورسٹیوں اور دوسرے مختلف اداروں کے تحت تقریباً 150 فاصلاتی تعلیم کے مراکز اور اسکول و ہائر سیکنڈری سطح کی تعلیم کے لیے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اوپن اسکول اور لینگویج ٹیچنگ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو، جیسے ادارے کام کررہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم و پیشہ ورانہ زبان اور غیر پیشہ ورانہ تعلیم کے فروغ میں فاصلاتی نظام طرز کے ان اداروں کا بہت اہم کردار ہے۔ لیکن یہ تمام ادارے اردو ذریعہ تعلیم کی سہولت فراہم نہیں کرتے البتہ ان میں سے کچھ ادارے اردو یا تو مضمون کی حیثیت سے یا کچھ چنندہ پروگرام/ کورس اردو میڈیم کے ذریعے فراہم کرتے ہیں۔

ہندستان میں فاصلاتی تعلیم کا آغاز باضابطہ طور پر کچھ برسوں پہلے شروع ہوا۔ دراصل اعلیٰ سطح پر فاصلاتی تعلیم جسے پہلے عام زبان میں مراسلاتی کورس کہا جاتا تھا، کا آغاز دہلی یونیورسٹی سے 1962 میں ہوا۔ اس کے بعد اوپن اور فاصلاتی نظام تعلیم (Open and Distance Learning) کا بتدریج فروغ ہوتا رہا۔ اس

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P37.jpg 1/1

3/21/2018 P38.jpg (1621×2261)

طرح 1980 کی دہائی میں ہی فاصلاتی تعلیم کے لیے مختص بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستان کے اس منفرد تعلیمی ادارے نے پہلی بار تعلیم آپ کے دروازے پر کا نعرہ دیا اور اسے اپنا نصب العین بنایا۔

فاصلاتی طرز پر اردو میڈیم میں تعلیم فراہم کرنے والے اہم اداروں میں امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اوپن اسکول اور لینگویج ٹیچنگ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نام سرفہرست ہیں۔ گذشتہ برس سے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی بھی اردو میڈیم میں گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ سطح کے کچھ مخصوص کورسیز فراہم کر رہی ہے جو ایک خوش آئند بات ہے کیوں کہ اگنو دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ 12-10 برسوں سے قومی اردو کونسل بھی اوپن اور فاصلاتی نظام کے تحت اردو اور عربی لینگویج ٹیچنگ سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس ملک بھر میں پھیلے اپنے کمپیوٹر مراکز کے ذریعے بخوبی چلا رہی ہے جس سے ہر برس ہزاروں لوگ مستفیض ہو رہے ہیں۔ غیر اردو داں کے درمیان اردو زبان کے فروغ میں کونسل کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

فاصلاتی طرز پر اردو یونیورسٹی کے ذریعے چلائے گئے تعلیمی پروگرام غیر رسمی تعلیم کے زمرے میں آتے ہیں جو اردو آبادی بالخصوص خواتین اور لڑکیوں کے درمیان بے حد مقبول ہیں کیوں کہ ان تمام کورسوں کا مقصد ان لوگوں کو تعلیمی سہولیات بہم پہنچانا ہے جو کسی رکاوٹ کے سبب اپنی تعلیم مکمل نہیں کر پا رہے ہیں یا اپنے روزگار کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں نیز اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو Upgrade اور Enrich کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم فاصلاتی طرز پر اردو میڈیم میں تعلیم فراہم کرنے والے اداروں کو اپنے مقصد ''تعلیم آپ کے مقام پر، آپ کی فرصت اور وقت کے مطابق'' حاصل کرنے میں کئی چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

فاصلاتی نظام کے تحت ملک گیر پیمانے پر تعلیم کے پھیلاو اور اپنے کورسوں کو معیار اور تعداد کے لحاظ سے مشتہر کرنے اور اس کی رسائی عوام الناس تک بنانے میں کسی بھی فاصلاتی نظام تعلیم کے طرز پر کام کرنے والے ادارے کو سب سے بڑی دشواری ترسیلی نظام (Delivery System) کی پیش آتی ہے۔؛ جو ایک توجہ طلب مسئلہ ہے۔ اس مضمون میں ایسی ہی کچھ مخصوص چنوتیوں اور مسائل پر گفتگو کی جا رہی ہے جنھیں موٹے طور پر دو حصوں یعنی (I) عملی اور انتظامی امور سے متعلق چنوتیوں اور (II) نصاب و پالیسی سے متعلق چنوتیوں کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔

(I) عملی اور انتظامی امور سے متعلق چنوتیاں:

(1) یونیورسٹی کے تمام تعلیمی مراکز میں نئے داخلوں کا اِضافہ یکساں طور پر نہیں ہو پاتا یا اضافہ داخلے کی شرح میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے۔ کچھ تعلیمی مراکز بہت کم تعداد میں داخلے کے سبب بہت حد تک غیر فعال ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ مختلف اکیڈمک پروگراموں میں طلبہ کی خاطر خواہ تعداد نہ ہونے کے سبب مشاورتی کلاس منعقد کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان مراکز پر امتحان میں بیٹھنے والے طلبہ مزید کم ہوتے جاتے ہیں نتیجتاً ایسے مراکز کو کچھ دنوں بعد بند کرنا پڑتا ہے۔

(2) موجودہ تعلیمی مراکز (اسٹڈی سنٹر) شہری علاقوں میں قائم ہیں۔ چھوٹے قصبوں خصوصاً دیہی علاقوں میں مناسب و معیاری تعلیمی اداروں کے فقدان کے سبب ان علاقوں میں تعلیمی مراکز قائم کرنے میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً دیہی علاقے کے طلبہ خصوصاً لڑکیوں کی نمائندگی کم ہوتی ہے۔

(3) اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دیہی یا قصباتی علاقے کے طلبہ تعلیمی مراکز کے دور ہونے کے سبب یا طلبہ کے گھروں سے مراکز تک آمد و رفت کا مناسب نظم نہ ہونے کی وجہ سے مشاورتی کلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت نہیں کر پاتے۔ نتیجتاً وہ نصاب و کورس سے متعلق اپنے مسائل کو حل کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا صرف تعلیمی مراکز کے بل بوتے پر ہم 'تعلیم آپ کے دروازے پر' مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

(4) ملک گیر پیمانے پر پھیلے ہوئے تعلیمی مراکز میں اور خصوصی طور پر شمالی ہند کی ریاستوں میں یونیورسٹی کے ذریعے فراہم کیے گئے کورسوں کے تئیں عوام میں بیداری کی کمی ہے جو توجہ طلب ہے۔ نیز ان پروگراموں اور مختلف کورسوں کی افادیت اور اہمیت کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔

(5) شہری علاقوں میں واقع مختلف تعلیمی مراکز کے نیٹ ورک کو ان مراکز سے مربوط کرنے کی ضرورت ہے جو نسبتاً بنیادی ڈھانچے کی سہولتوں اور طلبا کی تعداد کے لحاظ سے کمزور ہیں یا پھر دیہی یا قصباتی علاقوں میں قائم کیے گئے ہیں؛ تاکہ وہ بھی نئے تعلیمی مواصلاتی و اطلاعاتی وسائل سے فیض یاب ہو سکیں۔ یہ اطلاعاتی و مواصلاتی وسائل فاصلاتی تعلیم کے طلبہ کے لیے ایک اہم تعلیمی امدادی ذرائع کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے یونیورسٹی کے ان طلبا کو جو اعلیٰ تعلیم کے لیے کوشاں ہیں انھیں امداد بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔

(6) بجلی سپلائی کی خراب صورت حال بھی فاصلاتی نظامِ تعلیم کے پھیلاؤ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اردو یونیورسٹی کے طلبہ کی خاصی تعداد دیہی اور اقتصادی اعتبار سے کمزور علاقوں میں مقیم ہے۔ جب شہری علاقوں میں ہی بجلی کی صورت حال تشفی بخش نہیں تو ان علاقوں کی صورت حال کے بارے میں بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نتیجتاً ٹی۔ وی، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ رکھنے والے طلبہ بھی ان ابلاغیاتی وسائل کو اپنی تعلیم کے لیے استعمال نہیں کر پاتے۔ اس طرح صرف طبع شدہ مواد ہی ان کے مطالعے کا واحد ذریعہ رہ جاتا ہے۔

(7) ہندوستانی پس منظر میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی چنوتی اس کا نظام ترسیل و تقسیم (Delivery & Distribution System) ہے۔ اس چنوتی کو در اصل ہندوستانی تناظر میں دیکھنے اور حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں افرادی وسائل کی کمی نہیں، لہٰذا افرادی قوت کا استعمال طبع شدہ مواد کی تقسیم میں کیا جا سکتا ہے۔ طبع شدہ مواد کی صحیح ترسیل و تفہیم کے لیے فاصلاتی نظامِ تعلیم کی یونیورسٹیاں اپنی کوریئر سروس بھی شروع کر سکتی ہیں۔ اس طرح ایک کوریئر سروس سے کئی یونیورسٹیاں مستفیض ہو سکتی ہیں۔ مثال کے لیے آندھرا پردیش میں تین فاصلاتی نظامِ تعلیم کی یونیورسٹیاں یعنی امبیڈکر یونیورسٹی، اگنو اور اردو یونیورسٹی کام کر رہی ہیں۔ ایک کوریئر سروس سے ان تینوں یونیورسٹیوں کا کام چل سکتا ہے۔

(II) 4نصاب و پالیسی سے متعلق چنوتیاں:

(1) کسی یونیورسٹی کی تشکیل کا کام بلاشبہ مشکل مرحلہ ہے لیکن اس میں بھی دشوار گزار کام کسی زبان کی یونیورسٹی کی تشکیل ہے۔ وہ زبان خواہ اردو ہندی یا کوئی اور علاقائی زبان ہو، سبھی کے ساتھ نصابی مواد کی فراہمی اور ترجمے کے مسائل دامن گیر ہوتے ہیں۔ فاصلاتی طرز پر اردو میڈیم سے نئے کورسوں کے آغاز میں سب سے بڑی دشواری اردو میں درسی مواد کی عدم دستیابی ہے۔ اکثر مضامین کی کتابیں اردو میں دستیاب نہیں۔ اس لیے ان مضامین کو انگریزی یا ہندی سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ کرنے کے لیے لازمی ہے کہ مترجم اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی ماہر ہو۔ ترجمے کے لیے ایسے افراد کی بڑی کمی ہے جو مواد کی اصل زبان، اردو زبان اور متعلقہ مضمون پر بیک وقت دسترس رکھتے ہوں۔ سائنس، ٹکنالوجی، تحقیق، کمپیوٹر، ترسیل، زراعت، صنعت، سماجی

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P38.jpg 1/1

3/21/2018 P39.jpg (1616×2234)

علوم وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم کی درسی کتب کا فقدان ہے یا یہ سرے سے دستیاب ہی نہیں ہیں۔ان مضامین کے مترجمین خال خال ہیں۔ اس طرح درسی مواد کی تیاری میں برسوں لگ جاتے ہیں۔

(2) مواد کی تیاری سے منسلک ایک چنوتی یہ بھی ہے کہ مواد کی تیاری کے وقت ٹارگیٹ گروپ کی سہولتوں کا دھیان رکھنا بھی لازمی ہوتا ہے تاکہ مواد کو سہل اور آسان کیا جاسکے ۔اس طرح ترجمے کا کام اور بھی دشوار کن ہوجاتا ہے۔اردو میں درسی مواد کا مسئلہ ہماری سب سے بڑی چنوتی ہے۔

(3) اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدارس کا رخ کرتی ہے۔ مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچے ان سہولیات سے محروم رہتے ہیں جن کے توسط سے روزگار پرمبنی جدید تعلیم کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ یہی موقف عورتوں اور دیہی علاقوں کے بچوں کے لیے بھی صادق آتا ہے۔ متوسط اور پسماندہ طبقات کے بچوں کی تعلیمی ضروریات اعلیٰ طبقے کے بچوں کے مقابلے مختلف ہوتی ہیں۔متوسط اور پسماندہ سماج کے وہ طبقات ہیں جنھیں روزگار پرمبنی تعلیم کے لیے بطورخاص ہدف بنانے کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کے اکیڈمک پیکج / پروگرام اردو آبادی کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اور ان کی پیشہ ورانہ مہارتوں کو ذہن میں رکھ کر تشکیل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ٹارگیٹ گروپ کو بھرپور فائدہ مل سکے۔ نیز مستقبل میں اردو یونیورسٹی کو بدلتے ہوئے قومی وسماجی ضروریات کے پیشِ نظر ضروری نئے پروگرام بھی تشکیل دینے ہوں گے۔ نیز اوپن اور فاصلاتی تعلیم کے نتائج کا جائزہ لینے کے لیے (یعنی طلبہ کو ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں کس حد تک اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے)،اس کو پائیدار ترقیاتی عمل بنانے اور اس کے طریقہ کار کو وضع کرنے کے لیے ایک تحقیقی مطالعے کی بھی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

(4) اردو کی تہذیبی قدروقیمت ناقابل تردید ہے لیکن ذریعۂ تعلیم کے طور پر کچھ لوگ اس کی قدروقیمت اور عصری معنویت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بالخصوص روزگار کے تعلق سے اسے اکثر نکتہ چینی کا سامنا رہتا ہے۔ حتیٰ کے اردو والے بھی اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول میں داخل کرانے میں ہچکچاتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اردو ذریعۂ تعلیم تقاضے کو پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔ جبکہ یہ بات ایک سرے سے غلط ہے۔روزگار کا تعلق Excellence اور jobs کی دستیابی سے ہے؛ نہ کہ ذریعہ تعلیم سے۔ بہرکیف اردو ذریعۂ تعلیم میں فاصلاتی نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والوں کو برانڈ ایکوٹی کا مسئلہ درپیش ہے۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کو اپنے معیار وافضلیت کو بنائے رکھنے کے لیے کئی طرح کی چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اس پر نہ صرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے بلکہ اردو ذریعہ تعلیم کے سند یافتہ طلبہ کو عملی زندگی میں مسابقت کرنے کے لیے انگریزی زبان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، جس کا خیال اردو یونیورسٹی نے شروع سے ہی کر رکھا ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اردو یونیورسٹی کے مختلف کورسوں مثلاً بی ایڈ، ایم ایڈ، ایم بی اے، ایم سی جے اور ایم ایس ڈبلیو کے فارغین کو اچھی ملازمتیں حاصل ہوئی ہیں اور ان کی کارکردگی بھی اطمینان بخش ہے۔

(5) کتابوں کے علاوہ اردو میڈیم اساتذہ کی بھی شدید کمی

ہے۔ شمالی ہند میں یہ مسئلہ سنگین ہے کیونکہ جنوبی ہند اور مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کا ایک تشفّی بخش نیٹ ورک ہے جو اردو میڈیم ہائر سکنڈری اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کو اساتذہ فراہم کرتے ہیں۔ مزید اردو میڈیم اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام بہت کم ہے۔ اردو یونیورسٹی اردو میڈیم کے اساتذہ کو تربیت دینے کے لیے کئی جگہ ریگولر بی۔ایڈ ٹریننگ کالج کے ساتھ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے بھی تربیتی کورس فراہم کر رہی ہے۔اردو یونیورسٹی فاصلاتی نظامِ تعلیم میں اطلاعاتی وابلاغیاتی ٹکنالوجی کا بھرپور استعمال کر رہی ہے۔

(6) اردو میڈیم سے پڑھنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جدید ٹکنالوجی سے بخوبی فائدہ نہیں اٹھا پا رہی ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ان سہولیات سے محروم ہیں۔اس طرح ہمارے زیادہ تر طلبہ کو طبع شدہ مواد پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ انگریزی یا دوسری زبانوں کے طلبہ کا High tech media support اردو والوں سے مقابلتاً کئی گنا بہتر ہے۔فاصلاتی تعلیم کے اسباق مکالمے کی شکل میں انٹرا ایکٹو طریقہ اختیار کرتے ہوئے تیار کیے جاتے ہیں۔اردو یونیورسٹی نے بھی مواد کی تیاری میں یہی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ لیکن اردو یونیورسٹی کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے پاس چونکہ تکنیکی وسائل کی کمی ہے اس لیے انھیں اپنی تعلیم کے لیے تشفی بخش طریقے سے میڈیا سپورٹ حاصل نہیں ہے۔اس کمی پر قابو پانے کے لیے ہمیں اپنے درسی مواد کے اسباق کی تیاری زیادہ سے زیادہ مکالماتی انداز میں انٹرا ایکٹو طریقہ اختیار کرتے ہوئے کرنی ہوگی۔

(7) تفویضات فاصلاتی نظام تعلیم کا اہم جزو ہیں۔ عموماً 100 نمبروں کے پرچے میں سے 70 نمبر کا سالانہ امتحان باقاعدہ طور پر منعقد کیا جاتا ہے جب کہ 30 نمبر تفویضات کے لیے ہوتے ہیں۔ اس طرح تفویضات کے ذریعے نہ صرف طلبہ کا رشتہ کورس اور کتابوں سے متواتر مضبوط رکھا جاتا ہے بلکہ اس کی جانچ اور نمبر دینے کے بعد وہ تفویضات طالب علم کو واپس کردی جاتی ہیں۔ اس میں کونسلر کی جانب سے طلبہ کی رہنمائی بھی کی جاتی ہے تاکہ سالانہ امتحان میں طالب علم بہتر طریقے سے جواب دے سکے۔ لیکن ان دنوں ایک نئی پریکٹس سامنے آئی ہے جو تعلیم کے تئیں ہماری ایمانداری و دیانت داری سے وابستہ ہے۔ یہ صرف اردو یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ فاصلاتی طرز پر کام کرنے والی تمام یونیورسٹیوں کو درپیش ہے۔ان دنوں زیادہ تر طلبہ اپنی تفویضات خود نہیں لکھتے بلکہ ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں یا کسی پیشہ ور لکھنے والے سے تیار کراتے ہیں۔اس طرح سے تفویضات لکھنے اور لکھوانے کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ بعض پروفیشنل کورسوں میں یہ برائی جڑ پکڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاصلاتی نظام تعلیم کی کئی یونیورسٹیوں نے اپنے یہاں تفویضات کی تعداد کو کم کر دیا ہے یا سرے سے ختم ہی کردیا ہے۔

آج ٹکنالوجی کا دور ہے۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل میں ہر گھر میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہوگا ۔اردو یونیورسٹی طلبہ کی آسانی کے لیے درسی مواد پرمبنی ہر مضامین کی سی۔ڈی تیار کرسکتی ہے جسے طلبہ کو طبع شدہ مواد کے ساتھ فراہم کردیا جائے۔ اس طرح مواد کی سافٹ کاپی سے استاد کی کمی کو مزید کم کیا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اوپن اور فاصلاتی تعلیم اعلیٰ تعلیم کے حصول میں حائل دشواریوں کا ایک متبادل پیش کر رہا ہے۔ اس میں فاصلاتی طرز کی تمام یونیورسٹیاں مثبت رول ادا کر رہی ہیں۔اردو یونیورسٹی چونکہ ایک زبان کی یونیورسٹی کے طور پر قائم کی گئی ہے اور اس کا ایک خاص ٹارگٹ گروپ ہے اس لیے اس کے مخصوص مسائل بھی ہیں۔ لیکن ان تمام مسائل اور چنوتیوں کے باوجود اردو یونیورسٹی اردو آبادی کے درمیان اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔

◘

Dr. Mohd Ahsan Riginal Director, Riginal Centre, Bhopal (MP)

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P39.jpg 1/1

3/21/2018 P40.jpg (1740×2200)

اردو زبان ہمارے ملک اور معاشرے کا ایک اہم تہذیبی ورثہ ہے۔ ایک ایسا زندہ تہذیبی ورثہ جس نے اپنے اندر ملک کے متنوع تہذیبی وثقافتی رنگوں کو سمیٹ کر خود کو ایک ایسے قوسِ قزح کی شکل میں ڈھال لیا ہے کہ جس کے حسن و جاذبیت کا ہر کس و ناکس دیوانہ نظر آتا ہے۔ دراصل اردو کی جاذبیت اور کشش کے پیچھے وہ تہذیبی پس منظر اور عوامل اہم ہیں جو اردو زبان کی پیدائش اور اس کے فروغ میں کارفرما رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و کلچر اور اردو زبان و ادب دونوں ایک ہی تہذیبی و ثقافتی عوامل اور ضرورت کی پیداوار ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ملک کے مشترکہ تہذیب و کلچر سے اردو زبان کی یہ گہری وابستگی نہ صرف اسے اس کلچر کا ترجمان بناتی ہے بلکہ اس کی مقبولیت کا جواز بھی فراہم کرتی ہے۔ اپنی اسی وسیع تر قبولیت کی بنیاد پر اردو عہد وسطیٰ میں عوامی رابطے کی زبان یعنی Lingua Franca کی حیثیت سے فروغ پائی اور برطانوی عہد میں سرکاری اور عدالتی ضرورت کی زبان قرار پائی۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نووارد افسران کی تربیت کے عمل میں اس زبان سے واقفیت کو لازمی قرار دیا جانا اور 1825 میں دہلی کالج کے قیام کے ساتھ اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جانا اس زبان کی ہمہ گیریت اور اس میں مضمر امکانات کے وہ بیّن ثبوت ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بڑے پیمانے پر اردو اخبارات کا اجرا، ان کا سرکولیشن اور قومی سطح پر تحریکِ آزادی میں ان کے کردار سے بھی اردو زبان کے دائرہ اثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ آزادی کے بعد تقسیم کے سانحہ اور فرقہ وارانہ فضا کے باعث ملک میں اردو کے لیے زمین تنگ ہوتی چلی گئی اور اس حد تک تنگ ہوئی کہ وہ علاقے جو اردو کے گہوارے تھے اردو وہاں تعصب کا شکار ہوکر کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئی۔

آزادی کے بعد اردو کو جس صورت حال نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ تھی ملک کے وسیع تر خطے کے مرکزی یعنی Main Stream نظام تعلیم خاص کر سرکاری نظام تعلیم سے اردو کے رشتے کا منقطع ہوجانا۔ اس صورت حال نے ہندوستان میں اس کی بقا اور فروغ کے سامنے زبردست چیلنج پیدا کردیا۔ کیونکہ وہ زبان جو آزادی تک پورے ملک کی عوامی زبان تھی اور جسے بلا تفریق مذہب وملت ایک بڑے طبقے نے اپنے اظہار اور رابطے کا وسیلہ بنا رکھا تھا وہ اچانک بے گھر ہوکر اپنی بقا کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئی۔

ملک کے مرکزی نظامِ تعلیم سے اچانک اردو کا انخلا ایک ایسا واقعہ تھا جس نے اردو کی ریڑھ کی ہڈی ہی توڑ کر رکھ دی۔ کیونکہ کوئی بھی زبان تعلیمی نظام سے کٹ کر بہت دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ اردو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ تعلیمی نظام سے بے دخلی نے اردو زبان و ادب کے دائرے کو محدود کردیا اور اس کی بقا اور ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ وہ زبان جس کی تعلیم کا نظام آزادی تک پورے ملک میں رائج تھا اب وہی زبان سمٹ کر چند علاقوں تک محدود ہوگئی اور ملک کے وسیع تر علاقے میں اس کی تعلیم نہ تو لازمی رہ گئی اور نہ ہی سرکاری اسکولوں میں ابتدائی اور ثانوی سطح پر بطور اختیاری مضمون یا زبان اسے پڑھنے پڑھانے کا نظم ہی رکھا گیا۔ اس صورت حال نے اردو کو نہ صرف Main Stream تعلیمی نظام سے دور کردیا بلکہ اردو کے رشتے کو روزگار سے منقطع کرکے آنے والی نسلوں کے لیے اس زبان کی تعلیم کو معاشی طور پر غیرضروری اور بے سود بنا دیا۔ اردو کے ساتھ امتیازی رویے کا اثر یوں تو پورے ملک پر پڑا لیکن بالخصوص اترپردیش سمیت پورے شمالی ہند میں (جوکہ اردو کا مرکز اور گہوارہ تھا) اس نے اردو زبان کو کسمپرسی کی حالت سے دوچار کردیا۔ آزادی کی نعمتوں کے ساتھ آئی تقسیم کی بلا نے تعصب کی ایک ایسی فضا پروان چڑھائی جس میں اردو تعلیم کی گنجائشیں سرکاری سطح پر ناپید ہوگئیں۔ گرچہ بعد کی حکومتوں نے تھوڑی بہت کوششیں اس سمت میں کیں اور بعض ریاستوں میں اردو کو محدود سطح پر ہی سہی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ لیکن کوششیں بھی بہت زیادہ

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P40.jpg 1/1

3/21/2018 P41.jpg (1556×1970)

با آور ثابت نہیں ہوسکیں۔ کیونکہ دوسری سرکاری زبان بنانے کے باوجود اردو کو تعلیمی نظام سے جوڑنے اور اس کی تعلیم کو ہندی اور انگریزی کی طرح لازمی قرار دینے کی سمت میں کارگر اقدامات نہیں کیے گئے اور نہ ہی کشمیر کے علاوہ کسی بھی دوسری ریاست میں اسے ریاست کی علاقائی زبان کے طور پر تعلیمی نظام کا لازمی حصہ ہی بنایا گیا۔ حتیٰ کہ سہ لسانی فارمولے سے بھی اردو کو تقریباً خارج ہی کردیا گیا۔ حالانکہ بعض اعلیٰ تعلیمی اداروں، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو کے شعبے قائم رہے یا پھر بعد میں قائم کیے گئے لیکن اس کی حیثیت اردو کو تعلیمی نظام کا حصہ بنانے کے لحاظ سے بہت کارگر نہیں رہی ہے۔ کیونکہ اردو کی بقا اور فروغ کا مسئلہ بنیادی طور پر ابتدائی اور ثانوی سطح کے تعلیمی نظام سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اگر ابتدائی اور ثانوی درجات میں اردو تعلیمی نظام اور نصاب کا حصہ نہیں ہوگی تو ظاہر ہے کہ اعلیٰ سطح کا تعلیمی نظام بھی زیادہ مستحکم اور کارگر کردار ادا نہیں کرسکتا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی ملک کا تعلیمی نظام تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس ملک کی زبان یا زبانوں کو فروغ دینے اور انھیں معیار عطا کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارے ملک کے تعلیمی نظام کے دائرے میں ابتدائی و ثانوی سطحوں پر اردو کی تعلیم کا محدود ہوجانا اردو زبان کی بقا کے لیے سب سے اہم مسئلہ رہا ہے۔ ایسی صورت میں متبادل تعلیمی نظام ہی اس کی بقا کا واحد راستہ بچ جاتا ہے اور اس متبادل کو فراہم کرنے میں اردو میڈیم اسکولوں کے قیام کے علاوہ مدارس کے تعلیمی نظام کا کردار اہم ہوجاتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ گرچہ مدارس کے بنیادی مقاصد میں زبان کو فروغ دینا شامل نہیں ہے۔ کیونکہ مدارس کا قیام اور اس کا نظام تعلیم خاص مقصد کا تابع ہوتا ہے اور وہ مقصد بنیادی طور پر مذہبی تعلیم کو فروغ دینے کا رہا ہے۔ جدید ہندوستان میں مدارس کے قیام کے تاریخی پس منظر کو اگر سامنے رکھیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے قیام کا اصل مقصد برطانوی سامراجیت کے تہذیبی و مذہبی تسلط اور یلغار کے خلاف مزاحمت کی فضا تیار کرنا اور اپنی تہذیبی اور مذہبی شناخت کی بقا کے لیے زمین ہموار کرنا تھا۔ کیونکہ انگریز ہندوستان کو سیاسی طور پر مغلوب کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کو زیر کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ ایسے نا مساعد حالات میں اپنی تہذیبی و مذہبی شناخت کو قائم رکھنا ایک بڑا چیلنج تھا۔ مدارس کا قیام اسی مقصد کے تحت ہوا تھا کہ برطانوی تہذیبی و مذہبی یلغار سے قوم و ملک کی حفاظت کی جاسکے اور نئی نسلوں کو دینی تعلیم کے نظام سے جوڑ کر مستقبل میں اپنی تہذیبی شناخت کو تحفظ عطا کیا جاسکے۔ مدارس میں اردو کو ذریعہ تعلیم یا میڈیم بنانے کے پیچھے سبب یہ تھا کہ عصری ہندوستان میں اردو کو وسیع تر رابطے اور عوامی زبان کا درجہ حاصل تھا، لہٰذا اس زبان کے ذریعے مدارس کے نظام تعلیم کو عوامی اور ہمہ گیر نوعیت عطا کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہوسکتا تھا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ دینی نظام تعلیم ہو یا عصری و جدید علوم کا تعلیمی نظام، ہر نوع کے تعلیمی نظام میں زبان کی حیثیت کلیدی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کسی تعلیمی نظام کا تصور ممکن نہیں، کیونکہ ہر تعلیمی نظام میں وسیلے یا میڈیم کا کردار زبان ہی ادا کرتی ہے۔ لہٰذا مدارس نے اردو زبان کو بطور ذریعہ تعلیم یا میڈیم اختیار کرکے نہ صرف اپنے دائرے کو وسعت عطا کی بلکہ اردو کی بقا کو ایک حد تک ضمانت بھی بخش دی۔

حالانکہ دینی مدارس میں رائج نظام تعلیم کی اپنی حدیں ہیں اور یہ ہمارے ملک کے مرکزی تعلیمی دھارے یعنی Main Stream نظام تعلیم کا حصہ نہیں ہے۔ لہٰذا اردو بطور میڈیم مدارس تک محدود ہوکر اپنی اُس حیثیت کو نہیں پہنچ سکتی جو Main Stream نظامِ تعلیم کا حصہ ہونے والی زبان کو حاصل ہوتی ہے۔ گرچہ بول چال کی سطح پر آج بھی اردو اتر پردیش سمیت ملک کے دیگر خطوں کی عوامی زبان ہے اور اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر عوامی ذرائع ترسیل مسلسل اردو زبان کا استعمال کرکے اپنی بنیادوں کو توسیع دیتے رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بولی کی سطح پر عوامی مقبولیت حاصل کرکے اس زبان کو بقا کی ضمانت مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے جواب نفی میں ہوگا۔ کیونکہ کسی بھی زندہ زبان کے لیے لازم ہے کہ وہ تعلیمی نظام کا حصہ بنے اور اس کا رشتہ روزگار سے قائم ہو۔ لہٰذا یہ بات عین لازم ہے کہ تعلیم کی سطح پر جب تک اردو Main Stream تعلیمی نظام سے وابستہ نہیں ہوتی ملک گیر سطح پر اس کے فروغ کے امکانات محدود ہی رہیں گے۔

الغرض موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدارس کے نظام تعلیم سے بطور میڈیم ہی سہی اردو کی وابستگی، اردو کی بقا کے لحاظ سے بے حد اہمیت کی حامل ہے کیونکہ مدارس کے نظام تعلیم کے حوالے سے اردو آج ایک مخصوص طبقے کے تہذیبی تشخص کی زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔ حالانکہ اپنے تہذیبی کردار کے حوالے سے اردو سراپا مشترکہ کلچر کی ترجمان رہی ہے۔ اور یہ کسی ایک مذہب کی زبان ہونے یا کسی ایک مذہبی تشخص کی ترجمانی کرنے والی زبان کے تصور کی نفی کرتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ رہا ہے کہ اس زبان کے آغاز سے لے کر آزادی تک ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں نے اس کی آبیاری اور ارتقا میں یکساں کردار ادا کیا۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی میں جب مختلف اصلاحی تحریکوں کا آغاز ہوا تو بلا امتیاز مذہب و ملت ان تحریکوں کی تبلیغ و توسیع میں اردو زبان کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ برہمو سماج ہو یا آریہ سماج، شاہ ولی اللہ کی تحریک ہو یا سرسید کی علی گڑھ تحریک سبھوں نے اس زبان کا سہارا لیا اور اسی زبان میں اپنا بیشتر لٹریچر شائع کیا تاکہ عوام تک ان کی تحریکوں کے پیغامات پہنچ سکیں کیونکہ اس عصری ہندوستان میں اردو ہی سب سے بڑی اور مقبول زبان کا درجہ رکھتی تھی اور اسی زبان کے ذریعے عوام کے وسیع تر حلقے تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔

گرچہ آج یہ تلخ حقیقت ہے کہ اردو کی شناخت کافی حد تک مسلمانوں سے منسوب ہوکر رہ گئی ہے جو اس زبان کے بنیادی کردار اور مزاج کے عین منافی ہے بہرکیف یہ بات اس لحاظ سے اردو زبان کے حق میں ہی جاتی ہے کیونکہ اگر کوئی زبان کسی فرقے یا سماجی جماعت کے تہذیبی تشخص کا نشان بن جائے تو پھر محدود سطح پر ہی کیوں نہ سہی اس کی بقا کو ایک ضمانت حاصل ہوجاتی ہے۔ مدارس اسلامیہ آج بطور میڈیم اردو کو اختیار کرکے اس زبان کو بقا عطا کرنے میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔ مدارس کے نظام تعلیم اور نصابات میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کی موجودگی اردو کو اس نظام تعلیم کا لازمی جز بناتی ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بالواسطہ اور محدود سطح پر ہی سہی مدارس اردو زبان کی بقا اور فروغ میں ایک اہم کردار ادا کررہے ہیں۔

◘

Shama Kausar Yazdani, Warden Flat 3
Tapti Hostel, JNU, New Delhi-67

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P41.jpg 1/1

رؤف خیر

نئی اردو نظم

نئی اصناف نئی فکر نئی آوازیں

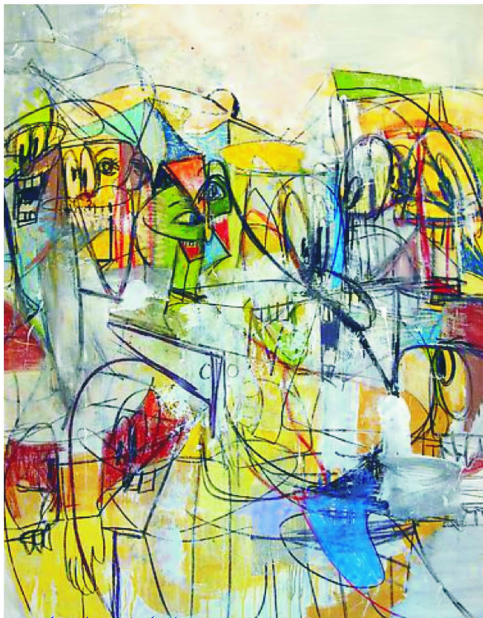

جارج کونڈو کی پینٹنگ، انٹرنل وائسیز (اندر کی آوازیں)

یہ طے ہے کہ غزل کے بالمقابل نظم میں وسعتِ اظہار زیادہ ہے۔ کسی موضوع یا کسی عنوان سے انصاف کرنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ شاعر صرف دو مصروں کا پابند ہو کے نہیں رہ جاتا بلکہ دو سے زیادہ مصرعوں میں وہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے آزاد رہتا ہے۔ اسی آزادی اظہار نے سیکڑوں ہزاروں اشعار پر مشتمل مثنویوں کا روپ دھارا تو کبھی سیرتِ رسول پاک کا منظر و پس منظر بیان کرنے کے لیے مسدس کی ہیئت استعمال کی گئی۔ مدو جزر اسلام (مسدس حالی) شاہ نامۂ اسلام (حفیظ جالندھری)، علامہ اقبال کے شکوہ و جوابِ شکوہ سے لے کر چندر بھان خیال کی 'لولاک' تک نظم نگاری کا ایک اسلوب مقبولِ خاص و عام ثابت ہوا۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف نے نظم کو پروان چڑھایا ان تمام اصنافِ سخن میں قافیہ و ردیف کی پابندی جہاں شاعر کی زبان و بیان پر دسترس کی غماز ہوا کرتی تھی وہیں خوش ذوق سامعین کے دل و دماغ کو متاثر بھی کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے اشعار ہی کی طرح مسدس حالی، شاہ نامۂ اسلام، شکوہ جوابِ شکوہ کے کچھ بند اصحابِ ذوق کو یاد بھی ہو جایا کرتے تھے۔

نظم میں تجربات ہونے لگے۔ دیگر زبانوں سے استفادہ کیا جانے لگا چودہ مصرعوں کی مخصوص ترتیب سے سانیٹ لکھا جانے لگا یا پھر آٹھ مصرعوں کی الٹ پھیر سے فرانسیسی صنفِ سخن ترائیلے کی اردو میں پذیرائی ہوئی۔ مگر یہ مذکورہ اصناف بہر حال بحر' قافیہ و ردیف کی پابندی ہی سے عبارت ہیں۔ آزاد نظم کے بانیوں میں شمار ہونے والے شاعر ن م راشد نے بھی ابتدا میں سانیٹ لکھے۔ اختر جونا گڈھی، اختر شیرانی، نریش کمار شاد، عزیز تمنائی سے لے کر علیم صبا نویدی اور رؤف خیر تک کئی شاعروں نے سانیٹ لکھے۔ اردو میں ترائیلے بھی لکھے گئے۔ نریش کمار شاد نے ابتدا میں کئی ترائیلے لکھے پھر فرحت کیفی کا مجموعۂ کلام 1977 میں 'پتہ پتہ بوٹا بوٹا' اور رؤف خیر کا مجموعۂ کلام 'ایلاف' 1982 میں منظر عام پر آیا جس میں ترائیلے تھے۔

پابند اصناف میں قطعات و رباعیات کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اختر انصاری، عبدالحمید عدم، نریش کمار شاد کے مجموعے شائع ہوئے جنھیں مقبولیت نصیب ہوئی۔ جنوبی ہند میں 'رباعی گوئی' کے نام سے سید مظفر الدین خاں صاحب نے ایک تذکرۃ الشعرا ہی ترتیب دیا۔ امجد حیدر آبادی، انیس، جوش ملیح آبادی، فراق، جاں نثار اختر وغیرہ کے ساتھ ساتھ ان دنوں رباعی گوئی کا احیا بھی ہوا ہے اور بعض شاعروں نے تو حروفِ تہجی کے اعتبار سے اپنے مجموعے تک ترتیب دے ڈالے۔ رباعی گو کو ایک سہولت یہ حاصل ہے کہ وہ اپنی ہر رباعی کے ہر مصرعے کو کسی نہ کسی بحر میں ثابت کر کے دکھا سکتا ہے بقول یاس

3/21/2018 P43.jpg (1621×2256)

یگانہ چنگیزی جوخود رباعی گو تھے:

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے میں
کہاں ہار ماننے والا

تین تین مصرعوں کے ہر بند کے ختم پر ایک ٹیپ کا مصرع 'اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں' کہہ کر مجاز نے نظم کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

فی الحال یہاں پابند نظموں کی بات ہوا ہی ہے۔ اختصار پسندوں نے ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر بجائے چار کے، اب صرف تین مصرعوں کی ثلاثی پر اکتفا کرلیا۔

ثلاثی میں تینوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔ البتہ قافیہ و ردیف کی پابندی صرف کہیں پہلے اور تیسرے مصرے میں برقرار رکھی جاتی ہے۔ بحر چھوٹی بڑی ہوسکتی ہے:

گزراتھا ابھی کون سڑک سے کہ ابھی تک
ہاتھوں میں ہے بنیئے کے اسی طرح ترازو
درزی کی سوئی پہلے جہاں تھی ہے وہیں پر

مخمور جالندھری

مساوی الاوزان مصرعوں پر مشتمل ثلاثی کے مجموعے حمایت علی شاعر نے 'مٹی کا قرض' کی صورت میں اور قمر اقبال نے 'تتلیاں' کے روپ میں اردو ادب کو دیے:

کوئی تازہ شعر اے ربِ جلیل/ ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے/ فکر محوِ انتظارِ جبرئیل ...

حمایت علی شاعر

یاد ہے وہ فساد کا منظر/ رو رہی تھی گلی میں اک بچی/ اپنی گڑیا کو گود میں لے کر ...

قمر اقبال

میرٹھ چھاؤنی کے دیپک قمر کا مجموعہ 'ہلّے ہلارے' 1991 میں اردو ماہیوں کے نام سے شائع ہوا مگر تقریباً پندرہ سو تخلیقات پر مشتمل یہ مجموعہ مساوی الاوزان مصرعوں پر مبنی ہے جو ثلاثی کا خاصہ ہے۔ پنجابی صنف ماہیے میں درمیانی مصرع اپنے پہلے اور دوسرے مصرعے کی بہ نسبت ایک سبب کم ہوا کرتا ہے۔ یہی اس کی پہچان بھی ہے۔

ماہیے دراصل پنجابی لوک گیت ہے۔ اسے فلموں کے ذریعے کافی مقبولیت ملی:

تم روٹھ کے مت جانا/
مجھ سے کیا شکوہ/ دیوانہ ہے دیوانہ

قمر جلال آبادی: فلم پھاگن

دل لے کے دغا دیں گے/
یار ہیں مطلب کے/ یہ دیں گے تو کیا دیں گے

ساحر لدھیانوی: فلم نیا دور

جرمنی سے 'جدید ادب' نکالنے والے حیدر قریشی نے اردو میں ماہیوں کو بہت بڑھاوا دیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق ہمت رائے شرما اردو میں ماہیا نگاری کے بانی ہیں۔ حیدر قریشی کی ایما پر کئی احباب نے ماہیا نگاری میں سنجیدگی دکھائی اور کئی مجموعے شائع ہوئے جیسے: موسم سبھی ایک جیسے ۔ (عاصی کاشمیری) 'محبت کے پھول' اور عمر گریزاں (حیدر قریشی)، چھیاں چھیاں (فراغ روہوی)، 'سوماہیے' (شاہد جمیل) ریگِ رواں (نذیر فتح پوری) رُتیں (طاہر رزاقی)۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے گیارہ ماہیا نگاروں کے ماہیوں پر مشتمل ایک مجموعہ 'رم جھم' ترتیب دیا تو شمیم انجم وارثی نے 'مغربی بنگال میں ماہیا نگاری کے نام سے چونتیس 34 ماہیا نگاروں کے فی کس بیس بیس ماہیے جمع کر کے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے علاوہ دو ماہی 'گلبن' (احمد آباد، اب لکھنؤ) اور سہ ماہی 'قرطاس' (ناگپور) نے ماہیا نمبر شائع کی:

گرچہ ہے یہ نادانی/ دل کی مگر میں نے/ ہر بات سدا مانی

عاصی کاشمیری

افسوس تو کیا کرنا/ زہر کا عادی تھا/
لازم تھا اسے مرنا

رؤف خیر

حیدرآباد دکن کے قمر ساحری برسوں پہلے ہجرت کر کے پاکستان جا بسے تھے انھوں نے حروفِ تہجی کو بنیاد بنا کر ماہیے کہے اور 'بادِ سبز' مجموعہ ادب کو دیا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ قمر ساحری نے الف بے تے ثے جیم سے ماہیے کے پہلے مصرعے کہے:

آواز کہاں تک دیں/ ساتھ تمھارے ہیں/ تم ساتھ جہاں تک دیں/ بانہوں میں نہیں نرمی/ سرد ہوئے جذبے/ بوسوں سے گئی گرمی

تین ہی مصرعوں پر مشتمل ہائیکو بھی جاپانی صنف سخن ہے جو اردو میں در آئی۔ اس میں سترہ سلیبلز Syllables میں پانچ سات پانچ کی ترتیب سے مصرعے کہے جاتے ہیں۔ ہائیکو کو بڑھاوا دینے میں ماہنامہ 'ساقی' (دہلی) کے جاپان نمبر جنوری 1936 کا بڑا دخل ہے۔ محسن بھوپالی نے جاپانی قونصل خانے کے تعاون سے کراچی میں ہائیکو کے کئی مشاعرے کروا ڈالے:

کیا بتلائیں حال/
ذہن و دل میں پھیلے ہیں/ اندیشوں کے جال

(سہیل غازی پوری)

باتیں خوابوں کی/ لکھے گا تو لکھنے پر/ پابندی ہوگی

(رؤف خیر)

عموماً یہ ہائیکو فعلن فعلن فع ، فعلن فعلن فعلن فع ، فعلن فعلن فع ، کے وزن پر لکھے جاتے ہیں۔

گلزار نے ابتدا میں پیش کردہ خیال کو آخری میں الٹ دینے کا انداز اختیار کرتے ہوئے ایک صنف تروینی کو فروغ دیا۔ ان کی تروینی ہے:

سانپ جتنا بھی خوب صورت ہو/ اپنی فطرت بدل نہیں سکتا/ اس لیے کینچلی بدلتا ہے

بہر حال مصرعوں کی ترتیب میں حذف واضافے سے تجربے کیے گئے ہیں۔

اردو میں دوہے بھی بہت لکھے جا رہے ہیں۔ ندا فاضلی، بھگوان داس اعجاز، فراز حامدی وغیرہ نے اس صنف کو اپنایا ہے۔ فراز حامدی نے تو دوہا گیت، دوہا حمد، دوہا نعت کے تجربے بھی کیے۔ پابند نظم کی یہ چند مختلف صورتیں ہیں۔

صرف یک مصرعی نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ راقم الحروف نے ایک ہی مصرعے میں مکمل ایک خیال کو بیان کردینے کا تجربہ کیا اور کئی یک مصرعی نظمیں لکھیں جو شعری مجموعہ 'شہداب' (1993) سے لے کر 'خیریات' (2010) تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو کئی رسالوں میں شائع بھی ہوئیں۔

سفارش: ہر سند سے بڑی سفارش ہے

ATM کا چوکیدار: بیٹھا ہوا ہے پیاسا کنویں کی منڈیر پر

کچھ شاعروں نے مزید سہولت برتتے ہوئے بحر کی قید سے عاری یک سطری نظمیں لکھیں جیسے مغنی تبسم، یوسف قادری، محسن جلگانوی علی، اعظم راہی وغیرہ۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قافیہ و ردیف کی پابندی کے ساتھ نظم پیش کرنے میں ہی شاعر کا کمال ہے۔ قافیے کو سلیقے سے برتنے ہی میں شاعر کی ہنر مندی بولتی ہے۔ انیس و دبیر کے مرثیے ۔ جوش، اختر شیرانی، مجاز کی نظمیں آج بھی لطف دیتی ہیں پوری نظم کسی ایک بحر ہی میں ہوتی ہے۔ شاعر کی خلاقانہ فکر اسے شاہ کار بناتی ہے جیسے علامہ

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P43.jpg 1/1

3/21/2018 P44.jpg (1626×2256)

اقبال کی مسجد قرطبہ' ذوق وشوق، والدہ مرحومہ کے نام نظم البتہ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم 'پر چھائیاں' میں بحر کی تبدیلی کا تجربہ کیا ہے۔

برطانیہ کے انور شیخ نے نظم میں کئی تجربے کیے۔ ان کی تکونیاں کافی مقبول ہوئیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ہندوپاک کے بعض شاعروں سے تکونیاں کہلوا کر پورا ایک مجموعہ ہی ترتیب دے ڈالا۔ تکونی قافیہ و ردیف کی پابندی سے کہی جاتی ہے۔ اس میں پہلے دو مختلف کردار پیش کیے جاتے ہیں اور تیسرا کردار بہ حیثیتِ مبصر ان دونوں کرداروں کا جائزہ لیتا ہے۔

کچھ آزاد خیال شاعروں کا یہ احساس تھا کہ قافیہ و ردیف کے چکر میں اصل موضوع پیش کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ 'جو قافیے پر بیت گئی وہ تو سنادی' والا معاملہ تھا۔ ابتدا میں ایک ہی بحر کا لزوم برقرار رکھا گیا یعنی ایک ہی آہنگ میں قافیہ و ردیف کی پابندی کے بغیر نظمیں کہی جانے لگیں۔ ن م راشد، میراجی وغیرہ نے اسے فروغ دیا۔ ان نظموں میں زبان و بیان ہی کی نہیں بلکہ ہر قسم کی چھوٹ برتی گئی۔ ن م راشد کا 'سفر نامہ' چونکاتا ہے کبھی ن م راشد نے کہا تھا 'فرشتے خدا کا جنازہ لیے جارہے ہیں۔

ماورا، لا=انسان، ایران میں اجنبی، گماں کا ممکن وغیرہ میں اسی طرح کی ماورائی نظمیں ن م راشد کی خاص شناخت بن کر سامنے آئیں۔

میراجی اپنے ہاتھوں میں لوہے کے گولوں کے بجائے کم سے کم ربر کے گولے رکھتے۔ آزاد نظم کے بنیاد گزاروں میں دوسرا بڑا اور اہم نام میراجی کا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم 'تکیے کا غلاف' کچھ یوں ہے:

یہاں سر تھا/ بکھرے ہوئے گیسو/ پریشاں سانپ
جو مندر کی بنیادوں سے نکلے تھے
ہوا کے نرم جھونکے ان کو لہراتے ہی جاتے تھے/
میں ان کو اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے سمٹنے کو تو کہتا تھا
مگر وہ بل پہ بل کھاتے ہی جاتے تھے/ وہ ضدی
تھے/ میں کہتا تھا اگر تم ایک لمحے کے لیے بیٹھے رہو چپکے
تو میں ان سرخ گالوں سے کہوں۔ پیاسا/ ہر اک
پیاسا ہمیشہ ایک ہی منزل پہ جاتا ہے
میں پیاسا ہوں/ گھنے جنگل میں سر ہے ایک سندر
باؤلی بھی پاس ہی ہوگی

آزاد نظم کا ایک روپ معرا نظم بھی ہے۔ خاص طور پر اختر الا ایمان نے کئی معرا نظمیں کہیں۔ 'ایک لڑکا' ان کی مشہور و مقبول نظم ہے۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مخدوم وغیرہ اور جدید شاعروں میں عادل منصوری، محمد علوی، افتخار جالب، وزیر آغا، مجید امجد حلقہ اربابِ ذوق کے قیوم نظر، یوسف ظفر، ظہیر کاشمیری، وغیرہ کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ ان کے بغیر یقیناً نظم کا باب ادھورا ہے۔ ہمارے مضمون نگار ندا فاضلی ساقی فاروقی تک آ کر رک جاتے ہیں جب کہ ستیہ پال آنند اور اردو نظم ایک جان دو قالب ہیں اور جینت پر مارنے جو کچھ 'پنسل' سے لکھا ہے وہ کسی ربر سے مٹنے والا نہیں ہے۔

1960 کے بعد ترقی پسندی کی مخالفت میں غزل اور نظم کے نام پر عجیب وغریب اوٹ پٹانگ تخلیقات خوش ذوق قاری کا مزاج پوچھنے لگی تھی۔ ان تخلیقات میں کسی کا الف نون سے ملنے جارہا تھا کوئی کالی بھینس کے تھنوں سے اپنی 'شہوت' پوری کر رہا تھا۔ کسی کو یہ فکر تھی کہ ان کے پیچھے کھڑے ''سرخ گوشت کی لمبی نوک جانے کہاں تلک جاتی ہے'' (یہ ایک نظم کا مصرع ہے)۔

اول تو اردو زبان سے نئی نسل کی دوری ہی غضب

ہے اوپر سے اس قسم کی معماتی تخلیقاتِ نظم ونثر نے قاری کو شعر و ادب سے کوسوں دور کردیا۔ تاہم ترقی پسندوں کی شاعری پر صرف 'نعرہ بازی' کی شاعری کا الزام بھی درست ثابت نہیں ہوسکا۔ مثلاً حیدرآباد کے شعرا کا ذکر کریں تو مخدوم محی الدین کو کمیونزم کا نقارچی یا ڈھنڈورچی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے مشرب و مسلک سے ہٹ کر بھی نظمیں کہی ہیں مثلاً ان کی نظم 'اپنا شہر'۔

یہ شہر/ اپنا عجب شہر ہے کہ/ راتوں میں/
سڑک پہ چلیے تو/ سرگوشیاں سی کرتا ہے/
وہ لا کے زخم دکھاتا ہے/ رازِ دل کی طرح/
دریچے بند/ گلی چپ/ نڈھال دیواریں/
کواڑ مہربلب/ گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں
برسوں سے/ کرائے پر۔

شاذ تمکنت نے خاص طور پر معرا نظمیں خوب کہی ہیں۔ اس دور کے مروجہ اسلوب میں انھوں نے اپنے الفاظ کا اثاثہ 'زرتاب ان نظموں میں جھونک دیا ہے۔ تراشیدہ، بیاضِ شام، نیم خواب، ورق انتخاب کی کئی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔ عزیز قیسی نے بھی 'آئینہ در آئینہ' اپنا احساس دلایا ہے۔

سکندر علی وجد نے اندرا گاندھی کا عمدہ قصیدہ نہ بھی لکھا ہوتا تو 'اجنتا' ایلورا، عبدالرزاق لاری، جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں کا گیت انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

سلیمان اریب کی شہرت محض ماہ نامہ 'صبا' کے مدیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ انھوں نے جدید اسلوب اپنا کر زندگی سے بھرپور نظمیں بھی کہیں۔ خاص طور پر زندگی و موت کی کشمکش سے گزرتے ہوئے انھوں نے جو نظم کہی وہ زہر کے ذائقے کے اظہار کے مماثل ہے:

زہر کی لہر ہے یا موت کی کڑوی خوشبو/ لمحہ لمحہ مرے
جی جاں سے گزر جاتی ہے/ پیتھیڈین لینے سے کچھ دیر کو
نیند آتی ہے (Pathadene)

ڈاکٹر وزیر آغا نئی نظم کا ایک اہم نام ہے۔ منیر نیازی، مجید امجد، سلیم احمد وغیرہ کی نظمیں اپنا خاص رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ فضا ابن فیضی نے پابند نظموں میں ایک خاص فکر پیش کی۔ ان کا ذکر کوئی نقاد نہیں کرتا۔ افتخار نسیم علی الاعلان اپنے Gay ہونے کا نہ صرف اظہار کرتے تھے بلکہ Gay Poetry کو اردو میں روشناس بھی کروایا۔ وہ اندھیرے سے ڈرتے ہیں' اور اپنے بابا سے سوال کرتے ہیں:

'میں جو بالکل آپ پہ ہوں/ تو پھر میری ترجیحِ جنس/
آپ سے کیوں اس درجہ الگ ہے'

شہریار، بلراج کومل، کمار پاشی، پرکاش فکری، وہاب دانش، عمیق حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی، سلیم شہزاد نے بھی جدید نظم میں اپنی پہچان بنائی۔ اردو کا ہر شاعر نظم ضرور لکھتا ہے۔

ان دنوں شکیل اعظمی گھریلو قسم کی علامتی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ سہیل اختر بھی غزل کے ساتھ ساتھ اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔ اڑیہ نظموں کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا ہے۔ ان کی ایک نظم 'اصول' کا اقتباس ہے:

'قبول کرنے تھے ہم کو سارے اصول اس کے/ یہ
کھیل شاید وہی تھا جس میں/ ہمیں بہر حال ہارنا تھا'

نئی نظم چونکہ اپنے گرد و پیش ہی سے اٹھائی جارہی ہے اس لیے اس کا محاورہ بھی یکسر نیا اور قدرے نثری ہوتا جارہا ہے۔ صلاح الدین پرویز کی نظم ان کا اپنا شناس نامہ 'Identity Card' ہوا کرتی ہے۔ ایک فلسطینی لڑکی کی پینٹنگز Paintings دیکھنے کے بعد پرویز نے جو نظم کہی وہ نثری سہی بہت متاثر کرتی ہے۔

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P44.jpg 1/1

’’میں ابابیلوں کی مدح سرائی کروں گا/ میرے اپنے ہی اونٹ/کھجور کی شراب پی کر/ پیرس کے نائٹ کلبوں میں/ فجور فجور گارہے ہیں/ یروشلم ان کے لیے صرف ایک ڈکشن بن کررہ گیا ہے/ اور وہ ایڈز کی ماری ہوئی عورتوں کی گود میں بیٹھے/ اسے مُسلسل ڈسکس کررہے ہیں/ ذرایاد کروسورۂ اسرائیل...

Mercy Killing آج کے دور کی ایک کڑوی حقیقت ہے۔ اس اچھوتے موضوع پر ایک سفاک نظم ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

تم اپنے حصے کی زندگی جی چکے ہو/ کب تک اب اپنے بچوں پہ بوجھ بن کر جیا کرو گے/تمھاری دولت پہ ان کا حق تھا/ جسے تم اپنی حماقتوں سے گنوا چکے ہو/ اب ان کی گاڑھی کمائی برباد کر رہے ہو/تمھیں اٹھانے بٹھانے والے بھی تھک گئے ہیں/ مروتاً کہہ نہیں رہے ہیں مگر یہ سچ ہے/تم اپنے رستے میں خود ہی دیوار بن گئے ہو...رؤف خیر

حیدرآباد ہی کے ایک فراموش کردہ شاعر تاج مہجور نے ٹی ایس ایلیٹ کی نظم Waste Land کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ان کا مجموعہ کلام ’لمس کا صحرا‘ اچھی نظموں سے بھرا پڑا ہے’سالِ نو‘ کے عنوان سے کہی ہوئی ان کی نظم شاہ کار کہی جاسکتی ہے:

زندگی بھوکی بھکارن/ کشمکش کی بھیڑ میں/ دم بدم سنگِ نفس کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی/ گرتی پڑتی دوڑتی ہے/ آس کا کاسہ لیے/آنے والی ساعتوں کی بند مٹھی کی طرف۔

سالِ نو

جس طرح کہانی بے ماجرا ہوکر غیر مقبول ہوگئی اسی طرح نظموں میں لایعنیت اور ابہام Absurdity نے نظم کو نقصان پہنچایا ہے۔کہانی کا آغاز وانجام اگر قاری پر واضح نہیں ہوتا ہے تو یہ ترسیل کی ناکامی دراصل کہانی کار کی بھی ناکامی ہے اسی طرح اگر کوئی نظم اپنے پڑھنے والے پر کھلتی نہیں ہے تو وہ نظم ہی کیا....؟ میرے خیال میں کہانی یا نظم محض قاری کا امتحان لینے کے لیے لکھی جائے تو پھر، یہ سوچنا چاہیے کہ قاری کا مبلغِ علم اب اس کا متحمل نہیں رہ گیا ہے۔ غالب و اقبال کی تخلیقات کی شرحیں لکھی جاتی رہی ہیں اسی طرح ان نظموں کی بھی شرح لکھنی پڑے گی۔اگر ہم کسی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا ہے تو کہنے سننے کا مطلب ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں استعارے اور علامات میں اپنی بات رکھنا ہی فن کاری ہے۔مگر یہ فن قاری کے دل و دماغ میں اترنا بھی چاہیے۔

حیدرآباد کے نظم نگاروں میں رؤف خلش، حسن فرخ، علی ظہیر، غیاث متین ، نوید، محسن جلگانوی، مصحف وغیرہ کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

ان دنوں سہولتوں کا دور دورہ ہے۔زبان و بیان پر دسترس کا فقدان بھی نثری نظم کی طرف راغب کرنے کا سبب سمجھا جاسکتا ہے۔مغنی تبسم نے یک سطری نظموں پر مشتمل پورا ایک مجموعہ ’پہلی کرن کا بوجھ‘ اردو ادب کو دیا۔ اعظم راہی کی نثری نظمیں ’ملبے میں دبا موسم‘ کے روپ میں منظر عام پر آئیں۔آج کے عالمی منظر نامے میں نظم نگاری کے حوالے سے حیدرآباد کے قلم کاروں کی خدمات کا اعتراف بھی کیا جانا چاہیے۔

کیا آج بھی کوئی دن ہے/کوئی تاریخ ہے/ یا خدا۔

مغنی تبسم

کچھ دیر خدا سے ہم کلامی/ پھر وہی من مانی/

یہی ہے زندگانی

اعظم راہی

راشد آزر نظم، غزل اور رباعی میں اپنی شناخت

رکھتے ہیں۔ انھوں نے نئے نئے موضوعات کو زبان دی ہے۔ان کی ایک طویل نظم ’پیوند کاری اور نئی امید‘ اچھوتے موضوع پر اچھوتی نظم ہے۔

نئے زمانے میں کیسی کیسی جراحتوں کے نقوش ابھرے/ یہ زخم کس کو دکھائیں جاکر/ مرا بدن کتنے اور جسموں کا ایک مجموعہ بن گیا ہے/ مرا خود اپنا بچا ہی کیا ہے/ میں جب بھی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں/ تو کوئی چپکے سے میرے شانے ہلا کے کہتا ہے/ راشد آزر/ تمھاری آنکھیں تمھاری آنکھیں کہاں رہی ہیں/ تمھاری آنکھوں کے دونوں حلقوں میں/ جس کے دیدے جڑے ہوئے ہیں/ وہ دیکھتا ہے....

علی ظہیر نظم کے شاعر ہی کی حیثیت سے معروف ہیں۔’رات کے ہزار ہاتھ‘ اور ’انگلیوں سے خون‘ ان کے مجموعے ہیں۔ ان کی فکر پر ایرانی اثرات بھی چھائے ہوئے ہیں۔ان کی نظم ہے:

رات بھر رگوں میں/ جیسے چیونٹیاں سی بھر گئیں/ آنکھیں سرخ ہوگئیں/ ہاتھ پھر ٹٹولنے لگا/ گولیوں کی نیند/ ہاتھ پھر ٹٹولنے لگا/ کالے جسم کا پرند/ کائیں کائیں کر کے کب کا جاچکا/ کوبلیوں سے گر رہے تھے/ خشک پتے نیم کے/ نبولیوں سے بھر گیا/ مرے مکاں کا صحن/ میں جا رہا تھا کام پر ٹکڑے ٹکڑے جسم کو سمیٹتا/ بھاری بھاری سر کو اپنے دوش پر سنبھالتا۔

ایک رات ایک صبح

غیاث متین نے بھی اپنی نظموں ہی کے ذریعے اپنی پہچان بنائی۔ان کی نظمیں زیادہ تر تلمیحاتی ہوتی تھیں ’زینہ زینہ راکھ‘ اور ’دھوپ دیواریں سمندر آئینہ‘ ان کی یادگار ہیں۔ان کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیے: ’کھل جاسم سم‘

لکڑ ہارے چلو اس شہر سے اور شہر کے لوگوں سے/

جتنی دور ممکن ہو نکل جائیں اسی جنگل کی جانب/

جہاں سے آئے تھے ہم تم...

لکڑ ہارے یہاں تو/ علی بابا اور اس کا بھائی قاسم/

وہ مرجینا ہو یا ہو مصطفٰے درزی/

کہ ہوں چالیس ڈاکو/ سبھی اس شہر کی دیوار میں محصور/سم سم بھول بیٹھے ہیں/لکڑ ہارے/

طلسم شہر میں ان کو/ یونہی حیراں پریشاں/

چھوڑ کر نکلیں/ اسی جنگل کی جانب/ جہاں پر

پرندے ہیں مگر ایسے نہیں ہیں/

درندے ہیں/مگر ایسے نہیں ہیں

مصحف اقبال توصیفی کے ہاں گھر آنگن کی کیفیت لفظوں میں ڈھل کر مزہ دیتی ہے۔ان کی نظم ’وہ لوگ‘ ایسی ہی کیفیت کی غماز ہے:

تم کو سانس بھی لینے پر ٹوکا کرتے تھے/ میں آؤں تو مجھ کو دروازے پر روکا کرتے تھے/ ہونٹ ہلانے سے پہلے/ آوازوں کا رخ/ بہتی ہوائیں دیکھنے والے/ رونے اور ہنسنے سے پہلے/ دائیں بائیں دیکھنے والے/ میں نے تو ان لوگوں سے کب کا ناتا توڑ لیا ہے/ اچھا ہے۔تم نے بھی ان کو اپنا کہنا چھوڑ دیا ہے۔

حمید الماس، حامد اکمل، جبار جمیل، خالد سعید، حمید سہروردی، ڈاکٹر راہی فدائی، عقیل جامد، ساغر جیدی، سلیمان خمار، علیم صبا نویدی، کاوش بدری، دانش فرازی وغیرہ وغیرہ نے بھی اپنی نظموں سے اپنے ہونے کا احساس دلایا ہے۔

◘

Raoof Khair,9-11-137/1, Moti Mahai, Golconda, Hyderabad - 500008 (A.P.)

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P45.jpg 1/1

3/21/2018 P46.jpg (1577×2200)

اہرام مصر کے اندر دیواروں پر پائی گئی مصور تحریروں کا ایک نمونہ

رئیس انور

نثری شاعری: رومانی تحریک کی پیداوار

رومانی تحریک اٹھارہویں صدی میں کن حالات میں شروع ہوئی اور اس میں روسو Rouseau نے کیا کردار ادا کیا، اسے دہرانا ضروری نہیں مگر اس سچائی کو ضرور دہرانا چاہیے کہ سماج اور تہذیب کے بے جا دباؤ سے جب انسانی ذہن اوب چکا تھا، کائنات شعر و ادب میں ایک نوع کا جمود چھانے لگا تھا تب تخیل اپنی پوری قوت کے ساتھ انگڑائی لیتا ہے۔ لاشعور کی نیرنگیاں اور بلند پروازیاں شعور کی کھری اور کھردری سچائیوں پر حاوی ہونے لگتی ہیں۔ حقائق سے فرار حاصل کرنے اور تخئیل کی حسین وادیوں میں کھوئے رہنے کا چلن عام ہونے لگتا ہے۔ اس میں وقتی آسودگی، بے خودی اور سرشاری ملتی ہے۔ یوں تو یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی کیفیت ہے مگر یہی کیفیت رومانی تحریک کی کلید ہے۔

جہاں تک اردو شعر و ادب کا تعلق ہے، اس میں انیسویں صدی کے درمیانی دہوں سے لگاتار سرسید اور ان کے رفقا کی شدید تعقل پسندی (Rationalism) کا دور دورہ رہا۔ بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے ادب میں اصلاح پسندی، افادیت، اخلاقیات اور اجتماعیت کی ترجمانی ان کی مجبوری تھی اور یہ سب کچھ ایک اعلیٰ مقصد کی براری کے لیے ہوا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اس طرح کی تعقل پسندی، مقصدیت ایک طرف اپنی انتہا پر پہنچ رہی تھی اور دوسری طرف محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر کے توسط سے جمالیات پسندی دبے پاؤں رومانیت کا روپ دھارتی ہوئی اردو ادب میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔

اس رجحان کو آگے بڑھاتے ہوئے بیسویں صدی کی ابتدا میں سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی شعریت آمیز نثر نگاری کی ایسی روایت بنانے لگے جسے آفاقی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے شعری مجموعے 'گیتا نجلی' کے نثری ترجمے سے مزید تقویت ملی۔ نیاز فتح پوری نے 1914 میں 'عرض نغمہ' کے نام سے اس کا نثری ترجمہ کیا، پھر انگریزی اور دوسری زبانوں کی نظموں کے نثری ترجموں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ رجحان اتنا عام ہونے لگا کہ اس طرز پر طبع زاد چیزیں بھی پیش کی جانے لگیں۔ ایسی تحریروں میں نثر کی خیال انگریزی شاعری کے شجر سایہ دار میں پناہ گزیں تھی۔ اودے اودے جذبوں کی تھرتھراہٹ تھی۔ چنے ہوئے لفظوں، ترکیبوں، اشاروں اور کنایوں کے اسلوبیاتی حسن کی دمک تھی جسے اس زمانے میں بہت پسند کیا گیا اور قارئین کا ایک حلقہ بن گیا۔

اس طرح کی طبع زاد تحریروں کو بعض قلم کاروں نے نثری شاعری تخئیل کی نثر اور شعرِ منثور کا نام دیا۔ اس حوالے سے جوش ملیح آبادی، ل احمد اکبرآبادی اور نیاز فتح پوری کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جوش کے پہلے مجموعہ کلام 'روح ادب' (مطبوعہ 1920) میں ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ ابتدائی حصے کا یہ نمونہ دیکھتے چلیں جس کا عنوان ہے 'حسن کیا ہے':

انسانی پیکر میں جلوۂ دوست کی جھلک،
فانی پنکھڑیوں پر سرمدی نقاشی،
تاریک کرہ پر قندیل حقیقت کی چھوٹ،
صحرائے ہستی کے ریشوں میں روحانی نغمہ،
پہاڑوں کو پگھلا دینے والی لو،
روحوں کو تڑپا دینے والا جذبہ،
فولاد کو پانی کر کے بہا دینے والی حرارت،
سکون کو اضطراب سے بدل دینے والا پرتو،
چلتی ہوئی تلوار،
لپکتا ہوا کوندا،
بھڑکتا ہو شعلہ،
تڑپتی ہوئی بجلی......!

'روح ادب' کے آخر میں 'تازہ پھول' کی سرخی لگا کر اسی طرح کی تحریریں شامل کی ہیں اور غالباً خود لکھا ہے:

> ''یہ وہ مضامین و اشعار ہیں جو آغاز موسم بہار یعنی مارچ میں لکھے گئے ہیں اور ایسے پھول ہیں جن کی پنکھڑی سے شبنم ابھی اڑی نہیں ہے۔''

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P46.jpg 1/1

3/21/2018 P47.jpg (1568×2200)

یہاں جوش بڑے محتاط نظر آتے ہیں۔ نہ صاف طور پر اسے نثر کہتے ہیں اور نہ شعر۔ لگتا ہے کہ وہ خود تذبذب میں مبتلا ہیں۔ پھر بھی انداز اظہار سے گمان ہوتا ہے کہ وہ اسے شاعری کے زمرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بحث کو آگے بڑھانے کے پہلے ایک اور نمونۂ کلام دیکھ لیں۔ عنوان ہے 'عجیب شراب':

میری آنکھیں تیری نشیلی آنکھوں سے
اور میرے لب تیرے سرخ لبوں سے
شراب پیتے ہیں
ایسی لطیف
کہ نظر نہیں آسکتی
اور ایسی عجیب
کہ اس کا نشہ عقل میں جان ڈال دیتا ہے!

پروفیسر رفیع احمد خاں مجموعے کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''حضرت جوش نے جس قدر مضامین لکھے ہیں، وہ سب فی الحقیقت نظمیں ہیں۔ فرق محض اس قدر ہے کہ یہ نظمیں بحر اور قوافی کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔'' (ص 37)

روح ادب کے علاوہ 'مقالات زریں'، 'اوراق سحر' اور 'اشارات' میں بھی کئی جگہ جوش نے ایسا ہی تخلیقی انداز اپنایا ہے۔

اس دور کے ایک اور نابغہ روزگار نیاز فتح پوری کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ عربی مصنفہ آنسہ می کی تخلیقات کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے شاید پہلی بار انھوں نے 'شعر منثور' کی اصطلاح استعمال کی ہے:

''شعر منثور سے مراد وہ افکار و خیالات ہیں جو اپنی لطافت و ندرت کے لحاظ سے ہیں تو نظم کیے جانے کے قابل لیکن ادا کیے جاتے ہیں نثر میں جیسا کہ خود لفظ 'شعر منثور' سے ظاہر ہے۔ اسی کو انگریزی میں (poetry in prose) کہتے ہیں۔'' (نگار، لکھنؤ، ستمبر 1924)

اس انداز شاعری کا جادو نیاز پر کچھ ایسا چلا کہ انھوں نے اپنے کئی مضامین کے منتخب جملے رسالہ 'نگار' میں 'درّ منثور' کے عنوان سے چھپوائے۔ اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

''کاش مجھے تمھاری آنکھوں کا افسوں چند ساعت کے لیے مل جاتا کہ میں بھی چند دن دنیا میں خدائی کرلیتا۔'' (نگار، لکھنؤ ستمبر 1926)

بیسویں صدی کی ابتدا میں سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی شعریت آمیز نثر نگاری کی ایسی روایت بنانے لگے جسے آفاقی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے شعری مجموعے 'گیتانجلی' کے نثری ترجمے سے مزید تقویت ملی

اس کے بعد ایسی تخلیقات پر وہ باضابطہ 'شعر منثور' کا عنوان لگانے لگے۔ اس میں 'شباب اور شاعر' ملاحظہ ہو:

وہ شبنم سے بھیگی ہوئی،
برگ پوش گلاب کی کلی،
جس کی سرخی پتیوں کے خط انفعال پر ایسی نظر آرہی ہے،
جیسے کسی کا محرم مسک جائے.... تم نے دیکھا؟
وہ قوس قزح جس کی رنگینیاں ایک والہانہ پاکیزگی،
ایک سماوی لحن کے ساتھ
بہار کی دیوی کو اپنے آغوش میں
لیے ہوئے نمودار ہوتی ہے... تم نے دیکھا؟
سمندر کا وہ جوش جیسے کسی کا سینہ انتہائی ہیجان کے عالم میں
تنفس کی شدت سے
بے قابو ہو کر سمٹ سمٹ کر پھیل رہا ہو... تم نے دیکھا؟
ماہ کامل کا وہ عروج نیم شبی،
جو دنیائے شباب کو اپنی آبشار سیمیں کے لطیف نغموں سے
مست و سرشار بنا کر
باغ کے کنجوں میں دعوت سرگوشی سے بیتاب بنا دیتا ہے... تم نے دیکھا؟

اس سلسلے کا تیسرا اہم نام ل۔ احمد اکبر آبادی کا ہے۔ احمد جمالیات اور رومانیت کے بڑے علمبردار تھے۔ ان کی بھی کئی ایسی تخلیقات رسالہ نگار میں چھپی ہیں، جن کا عنوان 'شعر منثور' ہوا کرتا تھا۔ 'صدائے بازگشت' کے تحت یہ نمونہ دیکھیے:

ہوا کی لطافت الہام آفریں تھی اور پانی کی روانی تخئیل زا،
سورج نے ساحل کی بلندیوں کو چادرِ زر اڑھادی تھی،
گاؤں کی شباب آغاز گوالن ایک بلندی پر بیٹھی تھی،
دفعتاً فضا کی رنگینیاں اس کے دل سے نغمہ کی صورت اختیار کر کے نکلیں،
مگر اس کا گیت گیت نہ تھا،
بلکہ ایک آرزو مند قلب کی تمنا تھی،
ایک شوق آگیں دل کا شق ہو جانا تھا۔

(نگار، لکھنؤ، دسمبر 1924)

اس نوع کی شعریت بداماں تحریروں میں والہانہ جذبہ ہے۔ خیال کی مصوری ہے۔ ایک وجدانی کیفیت ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں ان کی لطافت، نفاست، سلاست، موسیقیت اور سحر انگیزی کا لحاظ ہے۔ یہ تحریریں وزن و بحر سے عاری ضرور ہیں مگر قاری کے دل و دماغ میں ایک مسرت آمیز لہر بھی دوڑاتی ہیں اور دیر تک اسے اپنی گرفت میں لیے رہتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ رومانی تحریک کے خاتمے کے بعد بھی کئی قلم کاروں نے اسی نہج پر طبع آزمائی کی۔ ان میں خاص طور پر آصف علی (پرچھائیں اور اس کا دوسرا رخ، مطبوعہ 1950)، سجاد ظہیر (پگھلا نیلم مطبوعہ 1964) اور مظفر احمد لاری (میں اور تو، مطبوعہ 1965) کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ سجاد ظہیر نے 'پگھلا نیلم' کے دیباچے میں سکندر علی وجد اور سردار جعفری کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی تحریروں کو 'شعری نثر' اور 'نثری شعر' قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے یہ کہنا درست ہوگا کہ آج کی نثری شاعری، نثری نظم یا ڈائرکٹ پوئٹری رومانی تحریک کے زیر اثر شروع ہونے والی اسی روایت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

◘

Prof Rais Anwar, Director, Central Library, L N Mithla University, Darbhanga (Bihar)

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P47.jpg 1/1

ادارہ

تلوک چند محروم

تلوک چند محروم کی پیدائش 1 جولائی 1887 کو میانوالی، شمال مغربی سرحدی صوبے (پاکستان) کے گاؤں موسیٰ نور زماں شاہ میں ہوئی تھی۔ ان کا گاؤں دریائے سندھ کے کنارے آباد تھا جہاں ہر سال سیلاب کا خطرہ رہتا تھا۔ موسیٰ نور زماں شاہ کے باشندوں کو ہر برس اپنے مکانات سیلاب کے بعد دوبارہ تعمیر کرنے پڑتے تھے۔ اسی لیے تلوک چند کے والد نے اُس گاؤں کو خیر باد کہتے ہوئے عیسیٰ خیل میں سکونت اختیار کی۔ تلوک چند نے ورنا کولر مڈل اسکول سے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ 1907 میں انھوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور بعد میں لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مشن ہائی اسکول میں بطور انگریزی ٹیچر انھوں نے ملازمت کا آغاز کیا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں، عیسیٰ خیل اور بعد میں کلورکوٹ میں انھوں نے انگریزی استاد کی ذمے داری نبھائی۔ ان کے لائق فرزند جگن ناتھ آزاد جب 1933 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے راولپنڈی جانے لگے تو تلوک چند بھی بیٹے کے ساتھ وہاں آگئے اور کنٹونمنٹ بورڈ اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے طور پر کام کیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد گورڈن کالج میں انھیں اردو اور فارسی کے لکچرر بننے کا موقع حاصل ہوا۔ برصغیر کی تقسیم اور ہندوستان کی آزادی کے بعد انھیں راولپنڈی سے نقل مکانی کر کے دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں انھوں نے کچھ دنوں تک تیج ویکلی کی ادارت بھی کی۔ دہلی میں ہی 6 جنوری 1966 کو انھوں نے آخری سانس لی۔

تلوک چند محروم کا تعلق ایسے علاقے سے تھا جو ادبی طور پر بہت زیادہ زرخیز نہیں تھا لیکن تلوک چند بچپن سے ہی شعر و شاعری اور اردو ادب سے خاصی رغبت رکھتے تھے۔ انھیں مرزا غالب اور ذوق کی شاعری بے حد پسند تھی۔ جب وہ پرائمری اسکول میں تھے تبھی انھوں نے نظمیں لکھنی شروع کردیں۔ 12,13 سال کی عمر میں انھوں نے پہلی نظم خدمت والدین کے نام سے لکھی۔ اس نظم کو بہت پسند کیا گیا جس سے حوصلہ پاکر انھوں نے شاعری پر مزید توجہ دی اور ان کی نظمیں مخزن، اور زمانہ جیسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ ان کے راولپنڈی میں قیام کے دوران انھیں مختلف مشاعروں میں خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے خواجہ عبدالرحیم کے ذریعے منعقدہ سالانہ مشاعروں میں وہ ضرور شرکت کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں جگر مراد آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے شاعروں کے ساتھ تلوک چند محروم کا ادبی ذوق وشوق اور زیادہ پروان چڑھا۔ ان کے شعری مجموعوں میں گنج معانی، رباعیات محروم، نیرنگ معانی، کاروان وطن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

محروم کے کلام میں ادب و اخلاق اور زندگی کی بے سروسامانی کا کثرت سے تذکرہ ملتا ہے۔ زندگی کے مسائل اور پریشانیوں کو بڑے ہی عام فہم اسلوب میں پیش کرنے میں محروم کو قدرت حاصل تھی۔ کلام میں روانی، برجستگی، منظر نگاری اور سنجیدگی انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز بناتی ہے۔

انھوں نے شیکسپیئر، عمر خیام اور سعدی شیرازی کی نگارشات کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ بھگود گیتا کا سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کیا اور بچوں کے لیے بھی کافی نظمیں تحریر کیں۔

انھیں پنجاب سرکار نے 1962 میں اپنے سالانہ ادبی اجلاس میں اعزاز و اکرام سے نوازا۔

ان کے کلام میں بے جان چیزوں اور مختلف احساسات کو اس انداز و اسلوب میں برتا گیا ہے کہ کلام میں ایک نئی تازگی اور حسن پیدا ہوگیا ہے۔

وقت آنے پر چڑھے گا پھر یہ دریا ایک دن
پھر وہی جوش تلاطم اس میں ہوگا ایک دن
پھر چلی آئیں گی موجیں ناچتی گاتی ہوئی
سبزۂ ساحل کو رقصِ ناز سکھلاتی ہوئی

(نظم: 'اترا ہوا دریا' سے)

علامہ اقبال کے خیالات و افکار سے محروم حد درجہ متاثر تھے۔ لیکن ان کے نظریہ پاکستان سے انھوں نے ہمیشہ اختلاف کیا۔ ان کی کچھ نظموں پر اقبال کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں حب الوطنی اور قومیت کا جذبہ جابجا دکھائی دیتا ہے:

بگڑی ہوئی وطن کی بنالو بڑھے چلو
گرتے ہوئے نشاں کو اٹھالو بڑھے چلو
آزاد مثل سروِ چمن اور سربلند
ہندوستاں کے تازہ نہالو! بڑھے چلو
مردانہ خار زارِ غلامی کو طے کرو
کانٹا بھی پاؤں سے نہ نکالو، بڑھے چلو
(بڑھے چلو)

کچھ منتخب اشعار:

اب جہاں میں ان کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں
عمر بھر جو فکر تسخیر جہاں کرتے رہے

خلش نے دل کو میرے کچھ مزا دیا ایسا
کہ جمع کرتا ہوں میں خار آشیاں کے لیے

تلوک چند محروم کی شاعری میں غم واندوہ اور دنیا کی بے سروسامانی بڑے ہی اچھوتے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ انھوں نے عام فہم انداز اور نہایت شستہ اسلوب میں شاعری کی ہے اور زندگی کے بڑے بڑے مسائل کو دو مصرعوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ ان کی شاعری میں غم وخوشی، محبت واخلاق، بے ثباتی اور دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت، قومی جذبہ اور ملک کا احترام بھی نظر آتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی نظموں میں ان کا نصیحت آمیز انداز انھیں ایک نئے روپ میں پیش کرتا ہے۔ تلوک چند محروم نے اپنی محرومی اور زندگی کی پریشانیوں کو اپنی شاعری میں برتا تو ہے لیکن اردو شاعری خاص طور سے اردو رباعیات اور اردو نظم کو بہت کچھ دیا ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار اردو کے منفرد شعرا میں ہوتا ہے۔

ماخذ: وکیپڈیا اور 'فن وشخصیت' کوائف نمبر 1994

3/21/2018 P49.jpg (1583×2200)

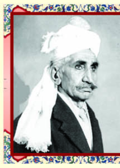

تلوک چند محروم

انتخاب کلام تلوک چند محروم

اس کا گلہ نہیں کہ دعا بے اثر گئی
اک آہ کی تھی وہ بھی کہیں جا کے مرگئی
اے ہم نفس، نہ پوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی
دامِ غمِ حیات میں الجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کرگئی
اس زندگی سے ہم کو نہ دنیا ملی نہ دین
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی
انجام حسن گل پہ نظر تھی وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیم سحر گئی
بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی
ہر موجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محروم جب وطن میں ہماری خبر گئی

آراستہ جن کے لیے گلزار و چمن تھے
جو نازکی میں داغِ دہِ برگِ سمن تھے
جو گل رخ و گل پیرہنِ غنچہ دہن تھے
شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار وخس و خاشاک کے نیچے
رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لیے روحِ رواں تھے
محبوب دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے
تھے یوسف ثانی، کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجرے سے پرے زیرِ زمیں ہیں
دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

نظمیں

زندۂ جاوید......اقبال

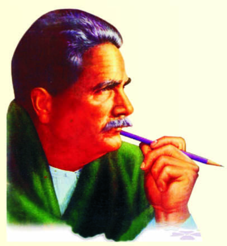

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہوگیا تو کیا
احساس میں سما گیا دل میں اُتر گیا
کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا
باغِ جہاں میں صورت گلہائے تر رہا
باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں
خورشیدِ جلوہ بار سے پوچھو، کدھر گیا
ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شُد بہ عشق
روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا
محروم! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہوگیا ہے کہ اقبال مرگیا

نور جہاں کے مزار پر

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شامِ تہِ خاک نہاں ہے
اٹھا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلوؤں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے حن کی شبِ دیجور کا عالم
اے حسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے 'عاشقِ دل' گیر کے دل کے
تجھ سے ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے
غلیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاج وری ہے
دن کو یہیں آرام، یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی
تعویذ لحد ہے زبر و زیر، یہ اندھیر!
یہ دور زمانے کا الٹ پھیر یہ اندھیر!
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر
اے گردشِ ایام! یہ اندھیر! یہ اندھیر
حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اٹھتے ہیں شرر آہِ شرربار سے کیا کیا
یہ عالمِ تنہائی، یہ دریا کا کنارہ
ہے تجھ سے حسینہ کے لیے ہو کا نظارہ
چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر
اڑ اڑ کے لگانے ہیں در و بام پہ چکر
معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

(ویب سائٹ سے)

سودیشی تحریک

وطن کے دردنہاں کی دوا سدیشی ہے
غریب قوم کی حاجت روا سدیشی ہے
تمام دہر کی روح رواں ہے یہ تحریک
شریک حسن عمل جابجا سدیشی ہے
قرار خاطر آشفتہ ہے فضا اس کی
نشان منزل صدق و صفا سدیشی ہے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P49.jpg 1/1

3/21/2018 P50.jpg (1577×2200)

وطن سے جن کو محبت نہیں وہ کیا جانیں
کہ چیز کون بدیشی ہے کیا سدیشی ہے
اسی کے سایہ میں پاتا ہے پرورش اقبال
مثال سایۂ بال ہما سدیشی ہے
اسی نے خاک کو سونا بنا دیا اکثر
جہاں میں گر ہے کوئی کیمیا سدیشی ہے
فنا کے ہاتھ میں ہے جان ناتوان وطن
بقا جو چاہو تو راز بقا سدیشی ہے
ہوا اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت
ہر ایک قوم کا جب مدعا سدیشی ہے

شہید بھگت سنگھ

زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا
شیدائے وطن، پیکر ایثار آیا
ہے دار و رسن کی سرفرازی کا دن
سردار بھگت سنگھ سردار آیا
تا دار و رسن شوق سے اٹھلا کے گیا
تو شان شہادت اپنی دکھلا کے گیا
ٹکڑے ہوتا ہے دل ترے ماتم میں
لاشے کا انگ انگ کٹوا کے گیا
پی کر مئے شوق جھومنا وہ تیرا
بے پروایانہ گھومنا وہ تیرا
ہے نقش ترے اہل وطن کے دل پر
پھانسی کی رسن کو چومنا وہ تیرا
جام حب وطن کے اے متوالے
اے پیکر ناموس، حمیت والے
ہو عالم ارواح میں شاداں کہ نہیں
اب تیرے وطن میں وہ حکومت والے

آزاد ہند فوج

اے جیش سرفروش جوانان خوش نہاد
سینے پہ تیرے کند ہوئی تیغ اشتداد
غربت میں دی ہے تونے شجاعت کی خوب داد
اقوام دہر کرتی ہیں جرأت پہ تیری صاد
تو کامگار ہو، ترے دشمن ہوں نامراد
''ہندوستاں کی فوج ظفر موج زندہ باد!''
دریا و دشت و کوہ میں تیرا بگل بجے
جس کی صدا سے گنبد گردوں بھی گونج اٹھے
میداں میں موت بھی ہو مجسم جو سامنے
تیرے دلاوروں کے نہ ہوں پست حوصلے
ہو بلکہ ان کا جوش عمل اور بھی زیاد
''ہندوستاں کی فوج ظفر موج زندہ باد!''
پردیس میں جو کھیت رہے ہیں جواں ترے
ہیں دفن زیر خاک خزانے وہاں ترے
برما کے جنگلوں میں لہو کے نشاں ترے
نقش دوام ہیں وہ تہ آسماں ترے
تا روز حشر اہل وطن کو رہیں گے یاد
''ہندوستاں کی فوج ظفر موج زندہ باد!''
غالب تھا بسکہ ساحر افرنگ کا فسوں
دو سو برس سے تھا علم ہند سرنگوں
تونے دیار غیر میں دکھلا دیا کہ یوں
مردان کار کرتے ہیں باطل کو غرق خوں
باطل ہو خواہ کوہ گراں خواہ گردباد
''ہندوستاں کی فوج ظفر موج زندہ باد!''

ماخذ: نغمات حریت، **منتخب کردہ:** خلیق انجم، **مزید انتخاب، ترتیب و دیباچہ:** شمس الرحمٰن فاروقی، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نسیم بہار

آسائشِ جگر ہے نسیم بہار تو
دلکش ہے دلفریب ہے اور خوشگوار تو
عیسیٰ نفس ہے دہر میں اے تازہ کار تو
ہے باعثِ شگفتگیِ روزگار تو
جاں تیرے دم سے تازہ ہے دل باغ باغ ہے
اور بوئے خوش سے تیری معطر دماغ ہے

وادیِ غم

خاموشی چھائی ہوئی ہے دامنِ کہسار میں
دم بخود بیٹھی ہے حیرت سایۂ اشجار میں
طائروں کو اس جگہ گانے کی عادت ہی نہیں
ندیوں کو شور کرنے کی اجازت ہی نہیں
پرتوِ خورشید کے منہ پر نقابِ سایہ ہے
صبح کا ملبوس جو ہے شام کا پیرایہ ہے
رنگ و بوئے گل میں اصلاً شوخی و تیزی نہیں
فصلِ گل میں دلکشی ہے پر جنوں خیزی نہیں
چاندنی راتوں میں میلی ہے ردائے ماہتاب
چپکے چپکے جارہا ہے سر جھکائے ماہتاب
سبزۂ دامن کشاں چاروں طرف خوابیدہ سا
ہر شجر حیرت زدہ دلگیر سا غم دیدہ سا
جلوہ گر تمکین خاموشی ہے اپنی شان میں
جس طرح بیٹھا ہوا کوئی ہو گہرے دھیان میں
سیر اس وادی کی اکثر آکے کر جاتا ہوں میں
میری نظروں میں یہ رہتی ہے جدھر جاتا ہوں میں

چند اشعار

وہ ادا جو دشمن صبر و قرار ہوش ہے
دل اسی پر ہے فدا کتنا اذیت کوش ہے
یہ فطرت کا تقاضا تھا کہ چاہا خوب رویوں کو
جو کرتے آئے ہیں انساں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بالائے بام تم ہو کہ ماہِ تمام ہے
کیسی یہ زیرِ بام نمایاں ہے چاندنی
کس منہ سے جا کے شکوۂ جور و جفا کریں
مرتے ہیں اور ان کی پشیمانیوں سے ہم
مصحفِ رخ کو تیرے شام و سحر چومتے ہیں
کس سیہ کار کے کہنے سے ہیں کافر گیسو
کیسے بادل ہیں کہ خورشید سے بھی اونچے ہیں
نیچے نیچے ہے جبیں اور ہیں اوپر گیسو
گیا دل سے اب خوفِ روزِ جزا
قیامت تری چال میں آگئی
یہی نظر ہے کہ ہم سے ابھی ہے بیگانہ
ابھی ہم اس کو کلیجہ کے پار دیکھیں گے
اس سحرِ فن کے پاس سناں تھی نہ تیر تھا
پھر ہوگیا الٰہی کلیجہ کے پار کیا؟
ہے روزِ ازل سے تیرہ قسمت
عاشق تری چشم سرگیں کا
یہ کس سے آج برہم ہوگئی ہے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P50.jpg 1/1

کہ زلفِ یار پُرخم ہوگئی ہے
بہار میں وہ نئی اک بہار دیکھیں گے
گلے میں تیرے جو پھولوں کا ہار دیکھیں گے
جہاں میں بلبلِ باغ خزاں نصیب ہوں میں
مری نواؤں میں رنگینیٔ بہار نہیں
فلک سے کیا ہو امیدِ مسرت باغِ عالم میں
گلِ شاداب کی جس سے ہنسی دیکھی نہیں جاتی
ریاضِ عالم میں تجھ کو اے دل جو آرزوئے شگفتگی ہے
کلی کو جیسے پسِ شگفتن ملی ہے پژمردگی ملے گی
اسی سے اختیار و صبر کا مفہوم کھلتا ہے
جو ہونا چاہتا ہے کوئی انساں ہو نہیں سکتا
برگ ہائے گلِ تر کا یہ پریشاں ہونا
جرم ہے گل کدۂ دہر میں خنداں ہونا
یہی انجامِ مسرت ہے کہ خنداں ہوکر
شاخساروں سے گرے پھول پریشاں ہوکر
انجامِ فصلِ گل پہ نظر تھی وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیم سحر گئی
گونجا کیے کبھی جو نواہائے عیش سے
کس حال میں ہیں وہ در و دیوار و بام دیکھ
فطرت نے داغدار رکھا اندرونِ گل
بھولے نہ داغِ غم کو بہارِ خوشی میں دل
خیالی دام ہے غافل یہ دامِ عالمِ سفلی
پرافشاں ہو فضائے قدس میں اس سے رہا ہوکر
سرِ منزلِ بقا کا نشاں موت نے دیا
رہزن جسے سمجھتے تھے وہ رہنما ہے اب
زیست کی دشواریوں نے یہ تو احساں کردیا
موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کردیا
رونے سے کیا ملے گا کہ سیلابِ گریہ سے
تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہ جائے گا
کس نے دیکھا نہیں ہے بعدِ عروج
سایۂ چرخ میں زوال اپنا
کل کی نہ ہو امید تو پھر کس امید پر
آباد آرزوؤں کی دنیا کرے کوئی
نہ فضائے ماتم ہے دیدنی نہ گلِ بہار ہے چیدنی
طلسم رنگ شکستنی ہے شمیمِ گل ہے پریدنی
کون مختار ہے دنیائے وفا میں اے دل
جو ہے مجبور ہے اک تو ہی تو مجبور نہیں
لائقِ تکیہ نہیں عالمِ فانی اے دل
دیکھتے دیکھتے جو نذرِ فنا ہوتا ہے
زندگی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان
موت کیا ہے زندگی کی داستاں کا خاتمہ

رباعیات

دنیا کے حق آگاہوں کا مذہب ہے ایک
تعلیمِ خدا رسی کا مکتب ہے ایک
تفریق کے ہیں بہت بہانے ورنہ
اللہ کہو کہ اوم مطلب ہے ایک

ہے منزلِ دوجہاں کا رہبر مذہب
دیتا ہے ہمیں مقامِ برتر مذہب
عقبیٰ میں امیدِ خیر اس سے کیا ہو
دنیا میں اگر ہے حامیٔ شر مذہب

مذہب ہے فقط حسنِ عمل کا حامی
ہرگز وہ نہیں اہل و عسل کا حامی
دنیا کو پیامِ امن پھر دے گا کون
مذہب ہو اگر جنگ و جدل کا حامی

اعمال کا اپنے ہو محاسب انساں
نفسِ امارہ پہ ہو غالب انساں
ہو دشمنِ رحم خود تو پھر کس منہ سے
اللہ سے رحم کا طالب ہو انساں

بہبود معاد کی کوئی بات کریں
تاوقتِ وداعِ جاں نہ ہیہات کریں
خدشہ ہے نفس دوں کا لیکن کب تک
جب تک خود اس کی ہم مدارات کریں

لازم ہے بشر کو خاکساری کا چلن
تن تن کے نہ چل کہ آخر کار یہ تن
ہر چند ہو پروردۂ انواعِ نعیم
ہوجائے گا لقمۂ دہانِ مدفن

یہ گوشت اور پوست کا پیراہن
صد حیف کہ ہو کبر و منی کا مسکن
نور دانش سے جن کے دل ہیں روشن
وہ اس کو سمجھتے ہیں چتا کا ایندھن

مضطر نہ مصیبتوں میں ہرگز ہو بشر
بڑھ جاتا ہے اس سے اور کلفت کا اثر
تڑپے گردام میں بہت مرغِ اسیر
الجھن پیش آئے گی اسے الجھن پر

رسم و راہ کرم سے غافل نہ رہے
آہِ دلِ پر الم سے غافل نہ رہے
احساسِ غم اس لیے ملا ہے اس کو
انساں انساں کے غم سے غافل نہ رہے

دنیا میں اک بلا ہے غیبت بھی
پیدا جھگڑے بھی کرتی ہے نفرت بھی
غیبت کو بنا لیا ہے جس نے ہمدم
بزدل انساں ہے اور بدنیت بھی

محفوظ رہے دل جو ہو قابو میں نظر
پھر کوئی ہو دلستاں نہ کوئی دلبر
دیکھا ہے کہ آتی ہے تباہی اکثر
آنکھوں کی راہ سے دلِ انساں پر

اس بزم میں روئے ہیں بہت ہنس ہنس کر
غفلت کی ہنسی نہ اس قدر ہنس بس کر
دیکھ ان کے کھنڈر بچشمِ عبرت غافل
اجڑی ہیں جو بستیاں یہاں بس بس کر

ہے وہ خوب طبع جس میں رنگینی ہے
سامانِ ستائش خرد آئینی ہے
سب سے ہشیار ہے مگر وہ انساں
جس کو سودائے عاقبت بینی ہے

گو ہاتھ میں لے کے آئیں دامنِ مہِ نو
بدلے گا نہ قانونِ عمل وقتِ درو
گندم بوتے تو کاٹ لیتے گندم
جو بوئے تھے کاٹنے پڑیں گے اب جو

اس شہر کے مانند دلِ انساں ہے
آباد کبھی ہے جو، کبھی ویراں ہے
بہتر ہے کسی شغل میں مصروف رہے
خالی ہو تو کارخانۂ شیطاں ہے

دنیا کو سمجھ نہ منزلِ امن و اماں
ہرگام پہ سامنا خطر کا ہے جہاں
سرخی جسے خطرے کا نشاں کہتے ہیں
ہر شام و سحر رنگِ شفق سے ہے عیاں

▪

ماخذ: تلوک چند محروم شخصیت اور فن، **مصنف:** ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، **سن اشاعت:** 1997، **ناشر:** محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی

3/21/2018 P52.jpg (1645×2200)

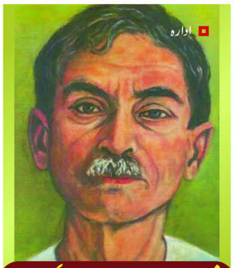

نواب دھنپت رائے پریم چند

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا لیکن قلمی نام پریم چند سے مشہور ہوئے۔ پریم چند کی پیدائش 31 جولائی 1880 کو مڈھوالمہی پانڈے پور، بنارس میں ہوئی تھی، والد کا نام عجائب لال تھا، جو محکمہ ڈاک میں کلرک تھے۔ پریم چند کو خاندان والے پیار سے نواب رائے کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ پریم چند جب آٹھ سال کے تھے تو ان کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ابھی کچھ ہی برس گزرے تھے کہ والد بھی چل بسے۔ پریم چند نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ سات، آٹھ، برس تک فارسی کی تعلیم حاصل کی اور بعد میں انگریزی تعلیم کا آغاز کیا۔ چھوٹی عمر میں ہی شادی ہوگئی۔ والد کے انتقال کے بعد پریم چند بالکل تنہا ہوگئے اور گھر کا سارا بوجھ ان پر آپڑا۔ انھوں نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔ بنارس سے ہی انٹرپاس کیا اور پرائمری اسکول میں بطور معلم ملازمت کا آغاز کیا۔ نوکری کے دوران ہی بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ پریم چند کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ انھوں نے پہلے پہل نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ بنارس کے ہی ایک ہفتہ وار آواز خلق میں ان کا پہلا ناول اسرار معابد شائع ہونا شروع ہوا۔

1905 میں منشی پریم چند کا تبادلہ کانپور کردیا گیا جہاں ان کی ملاقات منشی دیانرائن نگم سے ہوئی اور انھوں نے نگم کے رسالہ 'زمانہ' کے لیے کہانیاں اور مضامین لکھنے شروع کیے۔ زمانہ میں ہی ان کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن 1907 میں شائع ہوئی۔ 1907 میں ہی ان کا دوسرا ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' منظر عام پر آیا جسے انھوں نے بابو نواب رائے بنارسی کے نام سے قلم بند کیا تھا۔ اس ناول میں انھوں نے بیواؤں کی شادی جیسے سماجی مسئلے کو اٹھایا تھا۔ کانپور میں رہتے ہوئے ہی پریم چند نے مختلف سماجی، گھریلو مذہبی وقومی، معاملات پر کئی ناول اور کہانیاں لکھیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' بھی 1907 میں ہی شائع ہوا۔ اس مجموعے پر برٹش حکومت نے پابندی بھی عائد کردی تھی۔ اس پابندی کے بعد پریم چند کے گھر پر برٹش حکومت نے تلاشی لی اور اس مجموعے کی تقریباً 500 کاپیوں کو جلا دیا گیا۔ دھنپت رائے کو ایسی صورت حال میں اپنا نام تبدیل کرکے پریم چند کا قلمی نام اپنانا پڑا۔ 1914 میں انھوں نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی ہندی کہانی 'سوت سرسوتی' نامی رسالے میں شائع ہوئی۔ 1917 میں ان کی ہندی کہانیوں کا پہلا مجموعہ سیتا سروج شائع ہوا۔ 1916 میں پریم چند کا تبادلہ گورکھپور کردیا گیا تھا۔ 8 فروری 1921 کو انھوں نے گورکھپور میں مہاتما گاندھی کے ایک جلسے میں شرکت کی۔ اس میٹنگ میں مہاتما گاندھی نے تمام سرکاری ملازموں سے گزارش کی کہ وہ سرکاری ملازمتوں سے استعفیٰ دے کر عدم تعاون تحریک میں شامل ہوں۔ پریم چند بھی گاندھی جی کے خیالات اور فکر سے کافی متاثر ہوئے اور محض پانچ دنوں کے بعد انھوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور پھر ساری زندگی قلم ولوح کو ذریعہ معاش بنائے رکھا۔

1921 میں پریم چند گورکھپور سے واپس بنارس آگئے۔ 1923 میں انھوں نے ایک پرنٹنگ پریس اور پبلشنگ ہاؤس کا قیام کیا۔ بنارس میں دوبارہ قیام کے دوران انھوں نے رنگ بھومی، نرملا، غبن، پرتگیہ، کرم بھومی جیسے عظیم ناولوں کی تخلیق کی۔

بنارس میں ہی انھوں نے مریادا اور دوسرے رسالوں کے مدیر کی ذمے داری بھی نبھائی۔ 31 مئی 1934 کو پریم چند نے بمبئی میں قدم رکھا۔ وہاں انھوں نے فلم مزدور کے لیے اسکرپٹ لکھی۔ بمبئی کی فضا پریم چند جیسے خالص ادبی شخص کو راس نہیں آئی۔ وہ بمبئی کی ہندی فلم نگری کی خالص کمرشیل صورت حال سے بے حد دل برداشتہ ہوئے اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں انھوں نے بمبئی کو خیر باد کہہ دیا۔ بمبئی سے واپس آنے کے بعد وہ الہ آباد میں رہائش اختیار کرنا چاہتے تھے جہاں ان کے دونوں بیٹے سرپیت رائے اور امرت رائے زیر تعلیم تھے۔ لیکن معاشی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے انھیں بنارس میں ہی سکونت اختیار کرنی پڑی۔ لکھنؤ میں 1936 میں انھیں انجمن ترقی پسند مصنّفین کا صدر منتخب کیا گیا۔ 18 اکتوبر 1936 کو بنارس میں ہی غریبوں اور پسماندہ طبقوں کے لیے آواز بلند کرنے والا اردو اور ہندی کا یہ عظیم فکشن نگار خالق حقیقی سے جاملا۔ 1936 میں ہی ان کا مشہور ناول 'گودان' اور مشہور افسانہ 'کفن' شائع ہوا تھا اور ان کی موت کے بعد 1937 میں رسالہ زمانہ میں ان کی آخری کہانی کرکٹ میچ شائع ہوئی۔

پریم چند اردو ادب کی ان نابغہ روزگار ہستیوں میں سے تھے جن پر اردو ادب کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ انھوں نے اصلاح اور مقصدیت کو مرکزی خیال بناتے ہوئے افسانے اور ناول تخلیق کیے۔ پہلی دفعہ دیہی زندگی اور کسانوں کے حالات زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ غربت کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ پوری ادبی دنیا کا نظریہ تبدیل ہوگیا۔ حالانکہ جس دور میں انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی وہ دور رومانیت پسندی کا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری جیسے ستارے ادب کے افق پر چمک رہے تھے لیکن پریم چند کی اصلاح معاشرہ کی تحریک مقصدیت اور حب الوطنی کے جذبوں نے اردو افسانے میں ایک نئی روح پھونک دی اور ترقی پسندی کو جلا بخشتے ہوئے اردو افسانے کو نئی جہت سے روشناس کرایا۔

پریم چند کی کہانیوں، ناولوں میں موضوعات کا بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ انھوں نے ہندو تاریخ، مذہبیت، اصلاح معاشرہ، دیہی زندگی، غربت، سیاست، انسانی نفسیات، حقیقت، مقصدیت، گھریلو زندگی، معاشی مساوات جیسے موضوعات پر نادر و نایاب تحریریں چھوڑی ہیں۔ اردو افسانے پر اُن کے احسانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بقول مولوی عبدالحق:

''ہندوستانی ادب میں پریم چند کے بڑے احسانات ہیں۔ انھوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔ زندگی کو شہر کے گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جاکر دیکھا۔ انھوں نے بے زبانوں کو زبان دی۔ ان کی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔ پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک کھونٹی ہے، حقیقت کو لٹکانے کے لیے۔ سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ ان کا مشن ہوگیا تھا۔ پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں سے تھے۔ افسانہ نگاری میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں مولانا حالی کا''۔

پریم چند نے تین سو سے زیادہ افسانے اور 14 ناول، مختلف مضامین، ڈرامے اور بچوں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ انھوں نے ہندی اور اردو میں دوسری زبانوں سے کہانیاں، مضامین اور ناول ترجمے بھی کیے۔

ان کی اہم تصانیف میں پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، واردات، گودان، نرملا، میدان عمل،، گوشۂ عافیت، رنگ بھومی، کربلا، پردۂ مجاز، سوز وطن، چوگان ہستی، بازار حسن، سیوا سدن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ماخذ: وکیپڈیا اور 'فن و شخصیت' کوائف نمبر 1994

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P52.jpg 1/1

3/21/2018 P53.jpg (1587×2200)

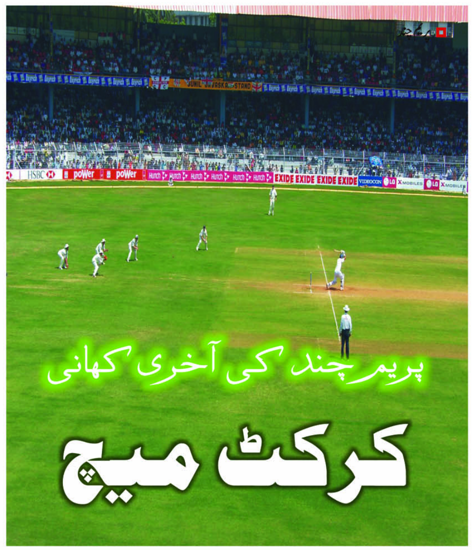

پریم چند کی آخری کہانی

کرکٹ میچ

یکم جنوری 1935

آج کرکٹ میچ میں مجھے مایوسی ہوئی اس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ ہماری ٹیم حریفوں سے کہیں زیادہ مستحکم تھی مگر ہمیں ہار ہوئی اور وہ لوگ فتح ونصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے ٹرافی اڑا لے گئے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ ہمارے یہاں قیادت کے لیے لیاقت شرط نہیں۔ ہم قیادت کے لیے ثروت اور دولت لازمی سمجھتے ہیں۔ ہز ہائنس کپتان منتخب ہوئے۔ کرکٹ بورڈ کا فیصلہ سب کو ماننا پڑا۔ مگر کتنے دلوں میں آگ لگی؟ کتنے لوگوں نے حکمِ حاکم سمجھ کر اس فیصلہ کو منظور کیا؟ وہ کھیلنے والوں سے پوچھیے اور جہاں محض منہ دیکھی ہے وہاں امنگ کہاں؟ ولولہ کہاں؟ عزم کہاں؟ آخری قطرۂ خون گرا دینے کا جوش کہاں؟ ہم کھیلے اور بظاہر دل سے کھیلے مگر یہ حق کے لیے جان دینے والے سرفروشوں کی فوج نہ تھی پیٹ اور لوٹ کے لیے لڑنے والی فوج نہ تھی۔ کھیل میں کسی کا دل نہ تھا۔

میں اسٹیشن پر کھڑا اپنا تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک نازنین نے جو ابھی کار سے اتری تھی، آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولی ’’آپ بھی تو اسی گاڑی سے چل رہے ہیں مسٹر ظفر؟‘‘

مجھے حیرت ہوئی! یہ کون نازنین ہے؟ اور اسے میرا نام کیونکر معلوم ہوگیا؟ مجھے ایک لمحہ کے لیے سکتہ سا ہوگیا۔ گویا سارے آداب اور اخلاق کی رسمیں دماغ سے محو ہوگئی ہوں۔ حسن میں ایک سطوت ہے۔ جو بڑوں بڑوں کے سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنے عجز کا ایسا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ میں نے نظام حیدرآباد سے۔ ہزایکسانی وائسرائے سے۔ مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا ہے۔ مگر یہ افتادگی اور یہ فروتنی مجھ پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی پلکوں سے اس کے قدموں کا بوسہ لے لوں۔ وہ ملاحت نہ تھی جس پر ہم جان دیتے ہیں۔ نہ وہ نزاکت جس کی شعرا قسمیں کھاتے ہیں۔ اس کی جگہ ذہانت تھی، متانت تھی، وقار تھا، زندہ دلی تھی اور شوق اظہار تھا۔ ’بے نقاب‘ میں نے پرسوال انداز سے کہا۔ ’جی ہاں‘

یہ کیسے پوچھوں کہ مجھے آپ سے کسب نیاز حاصل ہوا۔ اس کی بے تکلفی کہہ رہی تھی کہ وہ مجھ سے متعارف ہے۔ میں بیگانہ کیسے بنوں۔ اسی سلسلہ میں میں نے اپنی مروّت کا فرض بھی ادا کردیا۔ ’’میرے لیے کوئی خدمت۔‘‘

اُس نے مسکرا کر کہا ’’جی ہاں! آپ سے بہت سے کام لوں گی چلیے اندر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ لکھنؤ کا قصد ہوگا۔ میں بھی وہیں چل رہی ہوں۔‘‘

ویٹنگ روم میں آکر اس نے مجھے آرام کرسی پر بٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی ’’آج تو آپ کی بولنگ بڑی مہلک تھی۔ ورنہ ہم لوگ پوری اننگ سے ہارتے۔‘‘

میری حیرت اور زیادہ ہوئی۔ اس حسینہ کو کیا کرکٹ سے بھی شوق ہے۔ مجھے اس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ ایسی آداب شکن حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوئی تھی۔ توجہ اسی طرف تھی۔ طبیعت میں کچھ انقباض سا ہو رہا تھا۔ رگوں میں وہ سرعت اور طبیعت میں وہ گلابی بشاشت نہ تھی جو ایسے موقع پر فطرتاً مجھ سے ہونی چاہیے تھی۔

میں نے پوچھا ’’کیا آپ وہیں تشریف رکھتی ہیں؟‘‘

اس نے اپنا سگرٹ جلاتے ہوئے کہا۔ جی ہاں اوّل سے آخر تک۔ مجھے تو صرف آپ کا کھیل جنچا اور لوگ تو کچھ بیدل سے ہو رہے تھے اور میں اس کا راز سمجھ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں لوگوں میں صحیح مقام پرکھنے کا مادہ ہی نہیں۔ جسے اس سیاسی پستی نے ہمارے سبھی اوصاف کو کچل ڈالا ہو جس کے پاس ثروت ہے، وہ قادر بہ مطلق ہے۔ وہ کسی علمی، ادبی اور معاشرتی جلسے کا صدر ہوسکتا ہے۔ اہل ہو یا نہ ہو، نئی عمارتوں کا افتتاح اس کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے۔ بنیادیں اس کے ہاتھوں رکھوائی جاتی ہیں۔ تہذیبی تحریکوں کی قیادت اُسے دی جاتی ہے۔ وہ کانووکیشن کے خطبے پڑھے گا۔ لڑکوں کو انعام تقسیم کرے گا۔ یہ سب ہماری غلامانہ ذہنیت کی برکت ہے۔ کوئی تعجب نہیں ہم اس قدر ذلیل اور پست ہیں۔ جہاں حکم اور اختیار کا معاملہ وہاں تو خیر مجبوری ہے۔ ہمیں پابوسی کرنی ہی پڑتی ہے مگر جہاں ہم اپنی آزاد خیالی اور آزاد علمی سے کام لے سکتے ہیں، وہاں بھی ہماری رسوم طلبی اور منعم پرستی ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔ اس ٹیم کا کپتان آپ کو ہونا چاہیے تھا۔ تب دیکھتی حریف کیونکر بازی لے جاتا۔ مہاراجہ صاحب میں اس ٹیم کے کپتان بننے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی آپ میں اسمبلی کی صدارت کی۔ یا مجھ میں سنیما ایکٹنگ کی۔

بالکل وہی جذبات جو میرے دل میں تھے مگر اس کی زبان سے نکل کر کتنے پُر اثر اور کتنے بصیرت افروز ہوگئے تھے۔ میں نے کہا: ’’آپ بجا فرماتی ہیں۔ واقعی یہ ہماری کمزوری ہے۔‘‘

’’آپ کو اس ٹیم میں شریک نہ ہونا چاہیے تھا۔‘‘

’’میں مجبور تھا۔‘‘

اس حسینہ کا نام مس ہیلن مکر جی ہے۔ ابھی انگلینڈ

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P53.jpg 1/1

3/21/2018 P54.jpg (1586×2200)

سے آ رہی ہے۔ یہی کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے بمبئی ٹھہر گئی تھی۔ انگلینڈ میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے اور خدمت خلق اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہاں اس نے ایک اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی اور میرا ذکر بھی پڑھا تھا۔ تب سے اُسے میری جانب سے حسنِ ظن ہو گیا ہے۔ یہاں مجھے کھیلتے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کا ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ایک نئی ٹیم مرتب کی جائے اور اس میں وہی لوگ لیے جائیں جو قوم کی نیابت کرنے کے مستحق ہیں۔ اس کی تجویز ہے کہ میں اس ٹیم کا کپتان بنایا جاؤں۔ اسی ارادہ سے وہ سارے ہندوستان کا دورہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے والد مرحوم ڈاکٹر این مکرجی نے بہت کافی دولت چھوڑی ہے اور وہ اس کی بلاشرکت غیرے وارث ہے۔ اس کی تجویزیں سن کر میرا دماغ آسمان میں اُڑنے لگا۔ میری زندگی کا سنہرا خواب اس غیر متوقعہ انداز سے حقیقت بن سکے گا۔ اس کا کسے گمان تھا۔ مشیت غیب میں میرا اعتقاد نہیں مگر آج میرے وجود کا ایک ایک ذرّہ تشکر اور عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں نے مناسب اور منکسر الفاظ میں مس ہیلن کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کی گھنٹی ہوئی۔ مس مکرجی نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ منگوائے۔ میں احتجاج نہ کر سکا۔ اس نے میرا سامان اٹھوایا۔ میرا ہیٹ خود اٹھا لیا اور بیباکانہ انداز سے ایک کمرہ میں جا بیٹھی اور مجھے بھی اندر بلا لیا۔ اس کا خانساماں تیسرے درجے میں بیٹھا۔ میری قوتِ عمل جیسے سلب ہو گئی تھی۔ میں خدا جانے ان سب معاملات میں کیوں اسے پیش قدمی کرنے دیتا تھا۔ جو مرد کی حیثیت سے میرے فرائض میں شامل تھے۔ شاید اس کے حسن، اس کے ذہنی وقار اور اس کی علو ہمتی نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ گویا اس نے کامروپ کے جادو طرازوں کی طرح مجھے بھیڑ ا بنا لیا ہو اور مجھ میں قوت ارادہ غائب ہو گئی ہو۔ اتنی ہی دیر میں میری ہستی اس کی رضا میں جذب ہو گئی تھی۔ میری خودداری کا یہ تقاضا تھا کہ میں اسے اپنے لیے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ منگوانے دیتا اور تیسرے ہی درجہ میں آرام سے بیٹھتا اور اگر اول درجہ میں جا بیٹھنا تھا تو اتنی ہی فیاضی سے دونوں کے لیے خود اول درجہ کے ٹکٹ لاتا لیکن فی الواقع میری قوتِ عمل سلب ہو گئی تھی۔

2 جنوری: میں حیران ہوں ہیلن کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ اور یہ محض دوستانہ ہمدردی نہیں ہے۔ اس میں محبت کا خلوص ہے۔ رحم تو اتنا مہماں نواز نہیں ہوا کرتا اور میرے کمال کا اعتراف! میں اتنا عقل سے عاری نہیں ہوں کہ اس مغالطے میں پڑوں۔ کمال کا اعتراف زیادہ سے زیادہ ایک سگریٹ اور ایک پیالہ چائے پا سکتا ہے۔ یہ خاطر و مدارات تو وہیں پاتا ہوں جہاں کسی میچ میں کھیلنے کے لیے مدعو ہوتا ہوں۔ تاہم وہاں یہ دلنوازی نہیں ہوتی۔ محض رسمی خاطرداری برتی جاتی ہے۔ اس نے تو جیسے میری آسائش کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہو میں تو شاید اپنی معشوقہ کے سوا اور کسی کے ساتھ اس خلوص کا برتاؤ نہ کر سکتا۔ یاد رہے میں نے معشوقہ کہا ہے۔ بیوی نہیں کہا۔ بیوی کی ہم خاطرداری نہیں کرتے۔ اس سے تو خاطرداری کروانا ہی ہمارا وطیرہ ہی ہو گیا ہے۔ اور شاید حق بھی یہی ہے مگر فی الحال تو میں ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی بہرہ ور نہیں۔ اس کے ناشتے، ڈنر، لنچ میں تو میں شریک تھا ہی۔ ہر اسٹیشن پر (وہ ڈاک تھی اور خاص خاص اسٹیشنوں پر ہی رکتی تھی) میوے اور پھل نگواتی اور مجھے بہ اصرار کھلاتی۔ کہاں کی کیا چیز مشہور ہے۔ اس کا اسے خوب علم ہے۔ میرے عزیزوں کے لیے طرح طرح کے تحائف خریدے، مگر حیرت یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی اسے منع نہ کیا۔ منع کیوں کر کرتا۔ مجھ سے پوچھ کر تو لائی نہیں۔ جب وہ ایک چیز لا کر محبت کے ساتھ میری نذر کرتی ہے تو میں کیسے انکار کروں۔ خدا جانے کیوں میں مرد ہو کر بھی اس کے روبرو عورت کی طرح شرمیلا، کم گو، بستہ دہن ہو جاتا ہوں۔

دن کی تکان کی وجہ سے رات بھر مجھے بے چینی رہی۔ سر میں خفیف سا درد تھا مگر میں نے اس درد میں مبالغہ کیا۔ تنہا ہوتا تو اس درد کی شاید مطلق پروانہ کرتا۔ مگر آج اس کی موجودگی میں مجھے اس کے اظہار میں مزہ آ رہا تھا۔ وہ میرے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی اور میں خواہ مخواہ نڈھال ہوا جاتا تھا۔ میرے اضطراب کے ساتھ اس کی وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ سے بار بار پوچھتی اب درد کیسا ہے اور میں تو کلانہ انداز سے کہتا اچھا ہوں۔ اس کی نازک ہتھیلیوں کے احساس سے میری روح میں گدگدی ہوتی تھی۔ اس کا وہ دلکش چہرہ میرے سر پر جھکا ہوا ہے۔ اس کی گرم سانسیں میری پیشانی کے بوسے لے رہی ہیں اور میں گویا جنت کے مزے لے رہا ہوں۔ میرے دل میں اب اس پر فتح پانے کی خواہش چٹکیاں لے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ میری نازبرداری کرے۔ میری طرف سے کوئی ایسی پیش قدمی نہ ہونی چاہیے جس سے اس پر فریفتگی کا اظہار ہو۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میری ذہنیت میں کیونکر یہ انقلاب ہو جاتا ہے میں کیونکر طالب سے مطلوب بن جاتا ہوں۔ یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے نہ جانے کب نیند آ جاتی ہے مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں وہ بدستور اسی محویت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی ہے۔ تب مجھے اس پر رحم آ جاتا ہے اور میں کہتا ہوں آپ اب تکلیف نہ کریں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ عاشقی کا تھوڑا تجربہ کسے نہیں ہوتا۔ میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں مگر اس معشوقی میں آج جو لطف آیا اس پر عاشقی صدمے۔ عاشقی غلامی ہے۔ معشوقی بادشاہت۔

میں نے ترحم کے انداز سے کہا۔ آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔

''اس نے دلسوزی کی۔ مجھے کیا تکلیف ہوئی۔ آپ درد سے بے چین تھے اور میں بیٹھی رہتی۔ کاش یہ درد میرے ہوتا۔''

میں عرش معلیٰ پر اُڑا جا رہا تھا۔

5 جنوری: کل شام کو ہم لکھنؤ پہنچ گئے۔ راستے میں ہیلن سے تمدنی، سیاسی اور ادبی مسائل پر خوب باتیں ہوئیں۔ گریجویٹ تو خدا کے فضل سے میں بھی ہوں اور تب سے فرصت کے اوقات میں کتب بینی بھی کرتا رہا ہوں۔ علما کی صحبت میں بھی بیٹھا ہوں۔ لیکن اس کی وسعت معلومات کے سامنے قدم قدم پر مجھے اپنی بے بضاعتی کا علم ہوتا ہے۔ ہر ایک مسئلہ پر اس کی اپنی رائے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خوب تحقیق کے بعد وہ رائے قائم کی ہے۔ اس کے برعکس میں ان لوگوں میں ہوں جو ہوا کے ساتھ اڑتے ہیں جنھیں وقتی تحریکیں زیروزبر کر دیتی ہیں۔ میں کوشش کرتا تھا کہ کسی طرح اس پر اپنا ذہنی وقار قائم کر دوں۔ مگر اس کے نظریات مجھے بے زبان کر دیتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ علمی مسائل میں اس سے پیش نہ پاسکوں گا تو میں نے ابی سینیا اور اٹلی کے معرکے کا ذکر چھیڑ دیا جس پر میں نے اپنی دانست میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ انگلینڈ اور فرانس نے اٹلی پر جو دباؤ ڈالا ہے اس کی تعریف میں اپنا سارا زور بیان صرف کر ڈالا۔ اس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا ''اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ انگلینڈ اور فرانس محض انسانیت یا زبردست پروری کے جذبات سے متحرک ہو رہے ہیں تو آپ کی غلطی ہے۔ ان کی ملوکیت پرستی یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت پھلے اور سرسبز ہو۔ مسولینی وہی کر رہا ہے جو انگلینڈ نے بارہا کیا اور آج بھی کر رہا ہے۔ یہ سارا بہروپیاپن محض ابی سینیا سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اگر انگلینڈ کو اپنی تجارت کے لیے بازاروں کی ضرورت ہے۔ اپنی زائد آبادی کے لیے قطعات زمین کی ضرورت ہے۔ اپنے تعلیم یافتوں کے لیے موٹے منصوبوں کی ضرورت ہے تو اٹلی کو کیوں نہ ہو۔ اٹلی جو کچھ کر رہا ہے ایمانداری کے ساتھ اعلانیہ کر رہا ہے اس نے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P54.jpg 1/1

3/21/2018 P55.jpg (1596×2200)

کبھی عالمگیر اخوت کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ کبھی امن کا راگ نہیں الاپا۔ وہ تو صاف کہتا ہے جنگ و جدل ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسانیت کا ارتقا جنگ ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ انسان کے ملکوتی اوصاف میدان جنگ میں ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ مساوات کے نظریے کو وہ جنون کہتا ہے۔ وہ اپنا شمار بھی انھیں برگزیدہ اقوام میں کرتا ہے جنھیں رنگین آبادیوں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ اس لیے ہم اس کے طرزِ عمل کو سمجھ سکتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہمیشہ روباہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمیشہ ایک قوم کے مختلف عناصر میں تفرقے ڈال کر، یا ان کے احتلافات کو سیاسیات کا مدار بنا کر انھیں اپنا حلقہ بگوش بنایا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دنیا میں اٹلی جاپان اور جرمنی خوب فروغ حاصل کریں اور انگلینڈ کا تسلط ٹوٹے۔ تب ہی دنیا میں اصلی جمہوریت، اصلی امن پیدا ہوگا۔ موجودہ تہذیب جب تک مٹ نہ جائے گی دنیا میں امن کا رواج نہ ہوگا۔ کمزور قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اُسی طرح جس طرح کمزور پودوں کو۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان کا جوود انھیں کے لیے عذاب کا باعث ہے بلکہ اس لیے کہ وہی دنیا کی اس کشمکش اور خونریزیوں کی ذمہ دار ہیں۔

مجھے بھلا اس رائے سے کیوں اتفاق ہونے لگا۔ میں نے جواب تو دیا اور ان خیالات کی اتنی ہی زوردار الفاظ میں تردید بھی کی مگر میں نے دیکھا اس معاملہ میں وہ عقل سلیم سے کام نہیں لینا چاہتی یا نہیں لے سکتی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ہیلن کو اپنا مہمان کیسے بناؤں۔ اگر ہوٹل میں ٹھہراؤں تو خدا جانے اپنے دل میں کیا کہے۔ اگر اپنے گھر لے جاؤں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ وہاں ایسی خوش مذاق اور امیرانہ مزاج نازنین کے لیے آسائش کے کیا سامان ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میں کرکٹ اچھا کھیلنے لگا اور پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر اسی کا ہو رہا اور ایک اسکول میں ماسٹر ہوں۔ مگر گھر کی حالت بدستور ہے۔ وہی پرانا اندھیرا بوسیدہ مکان، تنگ گلی میں، وہی پرانی روش، وہی پرانا ڈھچر، اماں تو شاید ہیلن کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیں اور یہاں تک نوبت ہی کیوں آنے لگی۔ ہیلن خود دروازے ہی سے بھاگے گی۔ کاش آج اپنا مکان ہوتا۔ آراستہ پیراستہ۔ میں اس قابل ہوتا کہ ہیلن کی مہمانداری کر سکتا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی لیکن بے سرو سامانی کا برا ہو۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہیلن نے قلی سے اسباب اٹھوایا اور باہر آکر ایک ٹیکسی بلائی۔ میرے لیے اس ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے سوا دوسرا چارہ کیا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں اسے اپنے گھر لے جاتا تو اس بے سرو سامانی کے باوجود خوش ہوتی۔ ہیلن خوش مذاق ہے، مگر نازک دماغ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک قسم کی آزمائش اور تجربہ کے لیے تیار رہتی ہے۔ ہیلن شاید آزمائشوں اور ناگوار تجربوں کو بلاتی ہے مگر مجھ میں نہ یہ تخیل ہے، نہ وہ جرأت۔

اس نے اگر ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا اس پر کتنی ندامت اور کتنی بیکسی جھلک رہی تھی۔ مگر ظاہر داری نباہ تو ضروری تھا۔ میں نے احتجاج کیا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا۔ آپ الٹا مجھے ہوٹل لے جا رہی ہیں۔

اس نے شرارت کے انداز سے کہا ''اس لیے کہ آپ میرے قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوتی کہ آپ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤں لیکن محبت حاسد ہوتی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے۔ وہاں آپ کے احباب آپ کے وقت کا بڑا حصہ لے لیں گے۔ آپ کو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا اور مرد بالعموم کتنے بے مروت اور زود فراموش ہوتے ہیں اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی الگ نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر تم مجھے بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے۔

مجھے اپنی اس خوش نصیبی پر حیرت ہی نہیں خواب کا گمان ہونے لگا۔ جس حسینہ کی ایک نظر پر میں اپنے کو قربان کر دیتا وہ یوں مجھ سے اظہارِ محبت کرے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اسی بات پر اس کے قدموں کو پکڑ کر سینے سے لگا لوں اور آنسوؤں سے تر کر دوں۔

ہوٹل میں پہنچے میرا کمرہ الگ تھا۔ کھانا ہم نے ساتھ کھایا اور تھوڑی دیر تک وہیں ہری ہری گھاس پر ٹہلتے رہے۔ کھلاڑیوں کا کیسے انتخاب کیا جائے یہی مرحلہ تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ساری رات ٹہلتا رہوں۔ لیکن اس نے کہا آپ اب آرام کریں۔ صبح بہت کام کرنا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔ مگر ساری رات نیند نہیں آئی۔ ہیلن کا باطن ابھی تک میری نظر سے چھپا ہوا ہے۔ ہر لمحہ وہ میرے لیے معمہ ہوتی جا رہی ہے

12 جنوری: آج دن بھر لکھنؤ کے کرکٹروں کا مجمع رہا۔ ہیلن شمع تھی اور پروانے اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ یہاں سے میرے علاوہ دو صاحبوں کا کھیل ہیلن کو بہت پسند آیا۔ برجندر اور صادق۔ ہیلن انھیں آل انڈیا ٹیم میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں اس فن کے استاد ہیں۔ لیکن انھوں نے جس طرح آغاز کیا ہے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرکٹ کھیلنے نہیں اپنی قسمت کی بازی کھیلنے آئے ہیں۔ ہیلن کس مزاج کی عورت ہے۔ یہ سمجھنا دشوار ہے۔ برجندر مجھ سے زیادہ قبول صورت ہے۔ یہ مجھے تسلیم ہے۔ وضع قطع سے پورا صاحب ہے۔ لیکن پکا شہدا، لوفر، میں نہیں چاہتا کہ ہیلن اس سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ آداب تو اسے چھو نہیں گیا۔ بدزبان پرلے سرے کا۔ بیہودہ فحش مذاق۔ گفتگو کا سلیقہ نہیں۔ محل وقوع کی تمیز نہیں۔ بعض اوقات ہیلن سے ایسے پُر معنی کنائے کر جاتا ہے کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ لیکن ہیلن کو شاید اس کا بازاری پن اس کا ابتذال محسوس نہیں ہوتا۔ نہیں وہ شاید اس کے فحش کنایوں کا مزہ لیتی ہے۔ میں نے اسے کبھی چیں بہ جبیں نہیں دیکھا۔ یہ میں نہیں کہتا کہ شگفتہ طبعی کوئی بری چیز ہے، نہ زندہ دلی کا میں دشمن ہوں۔ لیکن ایک لیڈی کے ساتھ تو ادب قاعدے کا لحاظ رکھنا ہی چاہیے۔

صادق ایک معزز خاندان کا چراغ ہے۔ بہت ہی ثقہ بلکہ سرد مزاج، نہایت مغرور۔ بہ ظاہر ترش رو لیکن اب وہ بھی شہدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ کل آپ ہیلن کو اپنے اشعار سناتے رہے اور وہ خوش ہوتی رہی۔ مجھے تو ان اشعار میں کوئی مزہ نہ آیا۔ اس کے پہلے میں نے ان حضرت کو کبھی شاعری کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کیفیت کہاں سے پھٹ پڑی ہے؟ حسن میں اعجاز کی قوت ہے، اور کیا کہوں۔ اتنا بھی نہ سوجھا کہ اسے اشعار ہی سنانا ہے تو حسرت یا جگر یا جوش کے کلام سے دو چار شعر یاد کر لیتا۔ ہیلن سب کا کلام پڑھے تھوڑا ہی بیٹھی ہے۔ آپ کو شعر گفتن چہ ضرور۔ مگر یہی بات ان سے کہہ دوں تو بگڑ جائیں گے۔ سمجھیں گے مجھے رشک آ رہا ہے۔ مجھے کیوں رشک آنے لگا۔ ہیلن کے پرستاروں میں ایک میں بھی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے۔ ہر شخص سے بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔ مگر ہیلن کی نظروں میں سب برابر ہیں۔ وہ باری باری سے سب سے محترز رہے اور سب سے ملتفت۔ کس کی جانب زیادہ مائل ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ صادق کی دولت و ثروت سے وہ مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتی۔ کل شام کو ہم لوگ سنیما دیکھنے گئے تھے۔ صادق نے آج غیر معمولی فیاضی دکھائی۔ جیب سے روپے نکال کر سب کے لیے ٹکٹ لینے چلے۔ میاں صادق جو اس تمول کے باوجود بھی تنگ دل واقع ہوئے ہیں۔ میں تو خسیس کہوں گا۔ ہیلن نے ان کی فیاضی کو بیدار کر دیا ہے مگر ہیلن نے ان کو روک لیا اور خود اندر جا کر سب کے لیے ٹکٹ لائی اور یوں بھی وہ اتنی بے دردی سے روپے خرچ کرتی ہے کہ میاں صادق کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب ان کا ہاتھ جیب میں

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P55.jpg 1/1

3/21/2018 P56.jpg (1589×2200)

جاتا ہے۔ ہیلن کے روپے کاؤنٹر پر جا پہنچتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، میں تو ہیلن کی مزاج شناسی پر فدا ہوں۔ یسا معلوم ہوتا ہے وہ ہماری فرمائشوں کی منتظر رہتی ہے اور ان کی تعمیل میں اسے خاص لطف آتا ہے۔ صادق صاحب کو اس نے اپنا البم نذر کردیا۔ جو یورپ کی نایاب تصاویر کی نقلوں کا مجموعہ ہے اور جو اس نے یورپ کے سارے نگارخانوں میں جاکر خود مرتب کیا ہے۔ اس کی نظریں کتنی حسن پسند ہیں۔ برجندر جب شام کو اپنا نیا سوٹ پہن کر آیا جو اس نے ابھی سلایا ہے تو ہیلن نے مسکرا کر کہا۔ چشم بددور۔ آج تو تم یوسفِ ثانی بنے ہوئے ہو۔ برجندر باغ باغ ہوگیا۔ میں نے جب ذرالحن کے ساتھ اپنی تازہ غزل سنائی تو وہ ایک ایک شعر پر اچھل اُچھل پڑی۔ بلا کی سخن فہم ہے۔ مجھے اپنے ذوقِ سخن پر اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر تحسین جب صلائے عام ہوجاتی ہے تو اس کی کیا وقعت۔ میاں صادق کو کبھی اپنی وجاہت کا دعویٰ نہیں ہوا۔ معنوی حسن سے آپ جتنے ہی بہرہ ور ہیں۔ حسنِ ظاہر سے اتنے ہی بے فیض۔ مگر آج ساغر کے دور میں جوں ہی ان کی آنکھوں میں سرخی آئی ہیلن نے والہانہ انداز سے کہا بھئی تمھاری یہ آنکھیں تو جگر کے پار ہوئی جاتی ہیں، اور صادق صاحب اس وقت اس کے قدموں پہ جبہ سائی کرتے کرتے رک گئے شرم مانع ہوئی۔ ان کی آنکھوں کی اتنی قدر افزائی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مجھے کبھی اپنی وضع قطع کی تعریف سننے کی تمنا نہیں ہوئی۔ میں جو کچھ ہوں جانتا ہوں۔ مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں خوش رو ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہیلن کی یہ نوازشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں لیکن اب مجھے بھی یہ اضطراب ہونے لگا کہ دیکھوں مجھ پر کیا عنایت ہوتی ہے۔ کوئی بات نہ تھی مگر میں بے چین رہا۔ جب میں شام کو یونیورسٹی گراؤنڈ سے مشق کر کے آرہا تھا تو میرے یہ پریشان بال کچھ اور زیادہ پریشان ہوگئے تھے۔ اس نے گرویدہ نظروں سے دیکھ کر فوراً کہا "تمھاری اس زلفِ پریشان پر نثار ہوجانے کو جی چاہتا ہے۔" میں نہال ہوگیا۔ دل میں کیا کیا طوفان اٹھے کہہ نہیں سکتا۔

مگر خدا جانے کیوں ہم تینوں میں سے ایک بھی اس کی کسی ادا یا انداز یا حسن کی الفاظ میں داد نہیں دے۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں موزوں الفاظ نہیں ہیں ملتے جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

یکم فروری: ہم دہلی آگئے۔ اس اثنا میں مرادآباد، نینی تال، دہرہ دون وغیرہ مقامات کے دورے کیے مگر کہیں کوئی کھلاڑی نہ ملا۔ علی گڑھ اور دہلی سے کئی اچھے کھلاڑیوں کے ملنے کی امید ہے۔ اس لیے ہمارا قیام یہاں کئی دن رہے گا۔ الیون پوری ہوتے ہی سب لوگ بمبئی آجائیں گے اور وہاں ایک مہینہ مشق کریں گے۔ مارچ میں آسٹریلین ٹیم یہاں سے رخصت ہوگی۔ تب تک وہ ہندوستان میں سارے موعودہ میچز کھیل چکی ہوگی۔ ہم اس سے آخری میچ کھیلیں گے اور خدا نے چاہا تو ہندوستان کی ساری شکستوں کی تلافی کردیں گے۔ صادق اور برجندر بھی ہمارے ساتھ گھومتے رہے۔ میں تو نہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں مگر ہیلن کو شاید عشاق کے مجمع میں لطف آتا ہے۔ ہم سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہیں اور سب ہیلن کے مہمان ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچے تو صدہا آدمی ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔ کئی عورتیں بھی تھیں لیکن ہیلن کو نہ معلوم کیوں عورتوں سے احتراز ہے۔ ان کی صحبت سے بھاگتی ہے۔ خاص کر حسین عورتوں کے سائے سے بھی گریز کرتی ہے حالانکہ اسے کسی حسینہ سے بدظن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ حسن اس پر ختم نہیں ہوگیا ہے اس میں جاذبیت کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ کوئی حور بھی اس کے مقابلہ میں نہیں کھڑی ہوسکتی۔ نک سک ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ حسن مذاق، حسن گفتار، حسن ادا بھی تو کوئی چیز ہے۔ محبت اس کے دل میں ہے یا نہیں خدا جانے لیکن محبت کے اظہار میں اُسے ید طولیٰ ہے۔ دلجوئی اور ناز برداری کے فن میں ہم جیسے دلداروں کو بھی اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شام کو ہم لوگ نئی دہلی کی سیر کو گئے۔ پرفضا مقام ہے۔ کشادہ سڑکیں۔ خوبصورت مربعے دلفریب روشیں۔ اس کی تعمیر میں سرکار نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے اور بے ضرورت۔ یہ رقم رعایا کی فلاحی تجاویز میں صرف کی جاسکتی تھی مگر اس کو کیا کیجیے کہ عوام اس کی تعمیر سے جتنے متاثر ہیں اتنی کی فلاحی تجویز سے نہ ہوتے۔ آپ دس پانچ مدرسے زیادہ کھول دیتے یا سڑکوں کی مرمت میں یا زراعتی تحقیقاتوں میں اس روپیہ کو صرف کردیتے مگر عوام کو تزک و احتشام اور شان وشکوہ سے آج بھی جتنی رغبت ہے اتنی آپ کے تعمیری کاموں سے نہیں ہے۔ فرماں روا کا جو تخیل اس کے وجود کے ذرّے ذرّے میں سرایت کرگیا ہے۔ وہ ابھی صدیوں تک نہ مٹے گا۔ فرماں روا کے لیے شان وشکوہ ضروری ہے۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ کفایت شعار یا بخیل فرماں روا چاہے وہ ایک ایک پیسہ رعایا کے فلاح کے لیے خرچ کرے اتنا مقبول اور ہردلعزیز نہیں ہوسکتا۔ انگریز نفسیات کے ماہر ہیں۔ انگریز ہی کیوں۔ ہر ایک فرماں روا جس نے اپنے زور بازو اور قوتِ فکر سے یہ درجہ حاصل کیا ہے۔ فطرتاً نفسیات کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر عوام پر اُسے اقتدار کیونکر حاصل ہوتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے ایسا اندیشہ ہورہا ہے کہ شاید ہماری ٹیم خواب ہی بن جائے۔ ابھی سے ہم لوگوں میں چشمک رہنے لگی ہے۔ برجندر قدم قدم پر میری مخالفت کرتا ہے۔ میں آم کہوں تو وہ یقیناً املی کہے گا اور ہیلن اس کی جانب ملتفت ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے میٹھے خواب دیکھنے لگا تھا مگر برجندر احسان فراموش، خودغرض۔ برجندر میری زندگی تباہ کیے ڈالتا ہے۔ ہم دونوں ہیلن کے منظورِ نظر نہیں رہ سکتے۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ ایک کو میدان سے ہٹنا پڑے گا۔

7 فروری: شکر ہے دہلی میں ہماری کوشش بار آور ہوئی۔ ہماری ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کا اضافہ ہوا۔ جعفر، مہرا اور ارجن سنگھ۔ آج ان کے کمال دیکھ کر آسٹریلین کرکٹروں کی دھاک میرے دل سے جاتی رہی۔ تینوں گیند پھینکتے ہیں۔ جعفر قادر انداز ہے۔ مہرا صبر آزما اور ارجن شاطر۔ تینوں مستقل مزاج، نگاہ کے سچے اور اُتھک۔ اگر کوئی انصاف سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ ارجن مجھ سے بہتر کھیلتا ہے۔ وہ دوبار انگلینڈ ہو آیا ہے۔ انگریزی معاشرت سے واقف ہے اور مزاج شناس بھی اول درجہ کا، تہذیب اور اخلاق کا پتلا۔ برجندر کا رنگ پھیکا پڑ گیا اب ارجن پر خاص نظرِ عنایت ہے اور ارجن پر فتح پانا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ مجھے تو خوف ہے کہیں وہ میرا رقیب نہ بن جائے۔

25 فروری: ہماری ٹیم پوری ہوگئی۔ دو پلیئر ہمیں علی گڑھ سے ملے، تین لاہور سے اور ایک اجمیر سے، اور کل ہم بمبئی آگئے۔ ہم نے اجمیر، لاہور اور دہلی میں وہاں کی ٹیموں سے میچ کھیلے اور ان پر بڑی شاندار فتح پائی۔ آج بمبئی کی ہندو ٹیم سے ہمارا مقابلہ ہے اور مجھے یقین ہے میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ ارجن ہماری ٹیم کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے اور ہیلن اس کی اتنی خاطرداری کرتی ہے کہ مجھے رشک نہیں آتا۔ اتنی خاطرداری تو مہمان کی ہی کی جاسکتی ہے۔ مہمان سے کیا خوف۔ لطف یہ ہے کہ کہ ہر ایک شخص اپنے کو ہیلن کا منظور نظر سمجھتا ہے اور اس سے ناز برداریاں کرواتا ہے۔ اگر کسی کے سر میں درد ہے تو ہیلن کا فرض ہے کہ اس کی مزاج پرسی کرے۔ اس کے سر میں صندل تک گھس کر لگائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس کا رعب ہر ایک کے دل پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کوئی اُس کے کسی فعل کی تنقید کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ سب کے سب اُس کی مرضی کے غلام ہیں۔ وہ اگر سب کی ناز برداری کرتی ہے تو حکومت بھی ہر ایک پر کرتی ہے۔ شامیانہ میں ایک سے ایک حسین عورتوں کا جمگھٹ ہوتا

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P56.jpg 1/1

ہے مگر ہیلن کے قیدیوں کی مجال نہیں کہ کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی سکیں۔ ہر ایک کے دل پر ایسا خوف طاری رہتا ہے گویا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ارجن نے ایک مس پریوں ہی کچھ نظر ڈالی تھی ہیلن نے ایسی قہر کی آنکھ سے اُسے دیکھا کہ سردار صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ وہ اس کی تقدیر کی خالق ہے اور اُسے اپنی جانب سے بدظن کرکے وہ شاید زندہ نہ رہ سکے گا۔ اوروں کی تو میں کیا کہوں۔ میں نے بھی گویا اپنے کو اس کے ہاتھوں فروخت کردیا ہے۔ مجھے تو اب یہ احساس ہورہا ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز فنا ہوگئی ہے جو پہلے میرے دل میں حسد کی آگ سی جلا دیا کرتی تھی۔ ہیلن اب کسی سے بولے۔ کسی سے راز و نیاز کی باتیں کرے مجھے اشتعال نہیں آتا۔ دل پر چوٹ لگتی ضرور ہے مگر اس کا اظہار تخلیہ میں آنسو بہا کر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خودداری کہاں غائب ہوگئی نہیں کہہ سکتا ابھی اس کی خفگی سے دل کے ٹکڑے ہوگئے تھے کہ یکا یک اس کی ایک نگاہ غلط انداز نے یا ایک تبسم نے گدگدی پیدا کردی۔ معلوم نہیں اس میں وہ کون سی طاقت ہے جو اتنے حوصلہ مند نوجوان دلوں پر حکومت کر رہی ہے۔ اسے جسارت کہوں۔ مبادرت کہوں۔ یا کیا کہوں۔ ہم سب جیسے اُس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ ہم میں اپنی کوئی شخصیت، کوئی انفرادیت، کوئی ہستی نہیں ہے۔ اُس نے اپنے حسن سے، اپنی فراست سے، اپنی دولت سے اور سب سے زیادہ اپنی ہمہ گیری سے ہمارے دلوں پر تسلط قائم کرلیا ہے۔

یکم مارچ: کل آسٹریلین ٹیم سے ہمارا میچ ختم ہوگیا۔ پچاس ہزار سے کم تماشائیوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہم نے پورے اننگس سے شکست دی اور دیوتاؤں کی طرح پجے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دل و جان سے کام کیا اور سبھی یکساں طور پر پھولے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی اہلِ شہر کی جانب سے ہمیں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ ایسی پارٹی تو شاید وائسرائے کے اعزاز میں نہ دی جاتی ہوگی۔ میں تو تعریفوں اور مبارک بادوں کے بوجھ سے دب گیا۔ میں نے چوالیس رنوں میں پانچ کھلاڑیوں کا صفایا کردیا تھا مجھے خود اپنی ہلاکت آفرینی پر حیرت ہو رہی تھی۔ ضرور کوئی غیبی طاقت ہماری پشت پر تھی۔ اس مجمع میں بمبئی کا حسن اپنی پوری شان اور رنگینی کے ساتھ جلوہ افروز تھا اور مجھے دعویٰ ہے کہ حسن کے اعتبار سے یہ شہر جتنا خوش نصیب واقع ہوا ہے دنیا کا کوئی دوسرا شہر شاید ہی۔ مگر ہیلن اس مجمع میں بھی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ ظالم محض حسین نہیں ہے۔ شیریں بیان بھی ہے اور شیریں ادا بھی۔ سارے نوجوان پروانوں کی طرح اُس پر منڈلا رہے تھے۔ ایک سے ایک قبول صورت۔ منچلے۔ اور ہیلن ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اسی طرح جیسے وہ ہم لوگوں کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ مہاراجکمار جیسا شکیل جوان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ صورت سے رعب ٹپکتا ہے۔ اُن کے عشق نے کتنے حسینوں کو دلفگار کیا ہے۔ کون جانے مردانہ دل کشی کا جادو سا بکھیرتا چلتا ہے۔ ہیلن اُن سے بھی اُسی آزادانہ بے تکلفی سے ملی جیسے دوسرے ہزاروں نوجوانوں سے۔ اُن کے حسن کا، ان کی دولت کا، اس پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔ نہ جانے اتنا غرور، اتنی خودداری اس میں کہاں سے آگئی ہے۔ کبھی نہیں ڈگمگاتی۔ کہیں مرعوب نہیں ہوتی، کبھی مائل نہیں ہوتی۔ وہی بذلہ سنجی ہے۔ وہی اظہارِ محبت۔ کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ دلجوئی سب کی مگر اسی استغنا کی شان کے ساتھ۔

ہم لوگ سیر کرکے کوئی دس بجے رات کو ہوٹل پہنچے تو سبھی زندگی کے نئے خواب دیکھ رہے تھے۔ سبھی کے دلوں میں ایک دھک دھکی سی ہو رہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اُمید و بیم نے سبھی کے دلوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ گویا آج ہر ایک کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے۔ اب کیا پروگرام ہے۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ہر ایک نے اپنے دل میں سودائے خام پکا رکھا تھا۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ ہیلن کی خصوصی نگاہ اس پر ہے مگر یہ اندیشہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا کہ خدانخواستہ کہیں ہیلن نے بیوفائی کی تو یہ جان اس کے قدموں پر رکھ دے گا۔ یہاں سے زندہ گھر جانا قیامت تھا۔

اُسی وقت ہیلن نے مجھے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ جا کر دیکھتا ہوں تو سبھی کھلاڑی جمع ہیں۔ ہیلن اس وقت اپنی شربتی بیلدار ساڑی میں آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھی۔ مجھے اس پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس مجمع عام میں مجھے بلا کر قواعد کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو خاص برتاؤ کا مستحق تھا۔ میں بھول رہا تھا کہ شاید اسی طرح ان میں سے، ایک اپنے کو خاص برتاؤ کا مستحق سمجھتا ہو۔

ہیلن نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا ''دوستو! میں کہہ نہیں سکتی کہ میں آپ لوگوں کی کتنی مشکور ہوں۔ اور آپ نے میری زندگی کی کتنی بڑی آرزو پوری کردی۔ آپ میں سے کسی کو مسٹر رتن لال کی یاد آتی ہے؟''

رتن لال! اسے بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ وہ جس نے پہلی بار ہندوستان کی کرکٹ ٹیم کو انگلینڈ کی سرزمین پر اپنے کارہائے نمایاں دکھانے کا موقع عطا کیا۔ جس نے اپنے لاکھوں روپے اس مہم کی نذر کیے اور آخر متواتر شکستوں سے مایوس ہوکر وہیں انگلینڈ میں خودکشی کرلی۔ اس کی وہ صورت اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔''

سب نے کہا ''خوب اچھی طرح۔ ابھی بات ہی گئے دن کی ہے۔''

''آج اس شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ سال ہم انگلینڈ کا دورہ کریں گے۔ آپ لوگ ابھی سے اس مہم کے لیے تیاریاں کیجیے۔ لطف تو جب ہے کہ ہم وہاں ایک میچ بھی نہ ہاریں۔ متواتر ہمارے ہاتھ میدان رہے۔ دوستو! یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کا عمل ہی زندگی ہے۔ ہمیں کامیابی وہیں ہوتی ہے جہاں ہم اپنے پورے حوصلے سے سرگرم عمل ہوں۔ وہی مقصد ہمارا خواب ہو۔ ہمارا عشق ہو۔ ہمارا مرکزِ حیات ہو۔ ہم میں اور اس مقصد کے بیچ میں اور کوئی خواہش، کوئی آرزو حائل نہ ہو۔ معاف کیجیے گا۔ آپ نے اپنے مقصد کے لیے جینا نہیں سیکھا۔ آپ کے لیے کرکٹ محض ایک مشغلۂ تفریح ہے۔ آپ کو اس سے عشق نہیں۔ اسی طرح ہمارے صدہا دوست ہیں جن کا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ دماغ کہیں اور۔ اور وہ ساری زندگی ناکام رہتے ہیں۔ آپ کے لیے میں زیادہ دلچسپی کی چیز تھی۔ کرکٹ تو محض مجھے خوش کرنے کا ذریعہ تھا پھر بھی آپ کامیاب ہوئے۔ ملک میں آپ جیسے ہزارہا نوجوان ہیں جو اگر کسی مقصد کی تکمیل کے لیے جینا اور مرنا سیکھ جائیں تو معجزہ کر دکھائیں۔''

جایئے اور وہ کمال حاصل کیجیے۔ میرا حسن اور میری راتیں بازیچۂ نفس بننے کے لیے نہیں ہیں۔ نوجوانوں کی آنکھوں کو خوش کرنے اور ان کے دلوں میں سرور پیدا کرنے کے لیے جینا میں شرمناک سمجھتی ہوں۔ حیات کا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔ سچی زندگی وہی ہے جہاں ہم اپنے لیے نہیں سب کے لیے جیتے ہیں۔''

ہم سب سر جھکائے سنتے رہے اور جھٹلاتے رہے۔ اور ہیلن کمرہ سے نکل کر کار پر جا بیٹھی۔ اُس نے اپنی روانگی کا انتظام پہلے ہی کرلیا تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس صحیح ہوں اور ہم صورتِ حال سمجھیں وہ رخصت ہو چکی تھی۔

ہم سب ہفتے بھر تک بمبئی کی گلیوں، ہوٹلوں، بنگلوں کی خاک، چھانتے رہے۔ ہیلن کہیں نہ تھی اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس نے ہماری زندگی کا جو آئیڈیل رکھا وہ ہماری پہنچ سے اونچا ہے۔ ہیلن کے ساتھ ہماری زندگی کا سارا جوش اور ولولہ غائب ہوگیا ہے۔

(یہ افسانہ زمانہ جولائی 1937 میں شائع ہوا۔ 'گپت دھن' نمبر 2 میں شامل ہے۔)

■

ماخذ: کلیات پریم چند (14)، پچاس افسانے: مرتبہ: مدن گوپال، اشاعت: جون 2003، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

موریہ سلطنت

رماشنکر ترپاٹھی

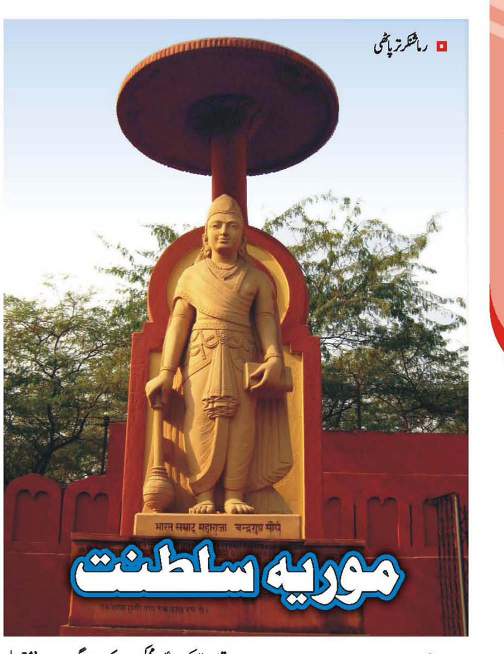

فصل(1): چندرگپت موریہ

خاندانی اصل: سکندر کے واپس چلے جانے کے بعد ہندوستان کے آسمان سیاست پر ایک نیا ستارہ ابھرا جس نے اپنی چمک دمک سے باقی سب ستاروں کو ماند کردیا۔ چندرگپت کے مالہ اور ماعلیہ کے بارے میں روایات میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ چندرگپت موریہ نند خاندان کے آخری راجا کی مورانامی شودر لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور اپنی ماں کے نام کی رعایت سے اس کا نام موریہ پڑگیا تھا دوسری روایت اس کو مشہور موریہ قبیلے کا چشم وچراغ بتاتی ہے جسے پالی کتابوں میں شاکیہ قبیلہ کی ایک شاخ ظاہر کیا گیا ہے اور اس جہت سے نام کا دوسرا جزو 'موریہ' قبیلہ کا لقب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عہد وسطیٰ کے بعض کتبے، نیز دِیا ودان ثابت کرتی ہے کہ چندرگپت موریہ چھتری تھا؛ حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ چندرگپت موریہ 'معمولی حیثیت' کا آدمی ہو، جیسا کہ یونانی مصنف جسٹن کا بیان ہے۔ روایت کے اس جزو کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ راجکمار نہیں تھا بلکہ ایک معمولی آدمی تھا اور مگدھ کے تخت وتاج پر اس کا براہِ راست کوئی حق نہیں تھا۔

عروج کے لیے حالات سازگار: چوتھی صدی ق م کے اواخر میں شمالی ہند پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ مگدھ میں نند خاندان اپنی نیچ اصل، مظالم، جمع اور دھند سے زبردستی روپیہ وصول کرنے کے باعث سسکیاں لے رہا تھا۔ اہل پنجاب جن میں نفاق ونفرت کی بو پھیلی ہوئی تھی سکندر اعظم کے حملوں کی ٹیس سے کراہ رہے تھے۔ اس لیے اس وقت کا سیاسی ماحول اہل ہمت کو دعوتِ عمل دے رہا تھا۔ بیزاری اور بے اطمینانی کی جو لہر اس وقت ملک میں پھیلی ہوئی تھی، چندرگپت موریہ نے اُس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ نند فوج میں سپہ سالار یا سیناپتی تھا۔ مگر کسی سبب سے راجا کے اُس کے درمیان اَن بَن ہوگئی اور اس نے وشنوگپت یا چانکیہ نامی 'شاطر برہمن' کے مشورے اور مدد سے جو راجا سے اس لیے کینہ رکھتا تھا کہ راجا نے حفظ مراتب میں اس کے ساتھ کبھی پہلے کوئی معمولی سی کوتاہی کردی تھی، راجا کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ لیکن یہ کوشش ناکام ہوگئی اور ان دونوں کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ مہاونش ٹیکا میں ایک حکایت نقل کی گئی ہے کہ چندرگپت ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں چھپا ہوا تھا۔ وہاں بڑھیا نے اپنے بچے کو جس نے گرم روٹی سے ہاتھ جلا لیے تھے ڈانٹا اور اسے فہمائش کی کہ روٹی کھانے کی ابتدا ہمیشہ درمیان کے بجائے کناروں سے کرنی چاہیے۔ چندرگپت نے بڑھیا کی بات سن کر اس سے سبق لیا اور مگدھ کی بجائے شمالی مغربی علاقے کو اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ جس زمانے میں سکندر پنجاب ہی میں تھا تو چندرگپت نے اس سے ملاقات کی درخواست کی، مقصد غالبًا یہ تھا کہ اسے نند راجا پر حملہ کرنے کے لے آمادہ کرے، لیکن چندرگپت کی بے باکانہ تقریر نے اس کی 'سکندری' کو برہم کردیا، اس لیے چندرگپت کو جان بچا کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ پنجاب کے قبیلوں نے یونانی اقتدار کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ سکندر کے ہندوستان چھوڑنے کے فوراً بعد اس کے شمالی مغربی صوبوں کے شترپ فلپ کو قتل کردیا گیا۔ چنانچہ حملہ آور کے چلے جانے کے بعد چندرگپت کا گمنامی کا دور ختم ہوگیا اور وہ پنجاب کے قبیلوں کو منظّم کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ یونانی اقتدار کے ڈانواڈول ہونے کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب سکندر کو فلپ کے قتل کا علم ہوا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکا کہ اس نے یوڈمس کی نگرانی میں انتظامِ حکومت اپنے ہندستانی حلیفوں پورس اور امبھی کے سپرد کردیا۔ 323 ق م کی جون میں سکندر کی ناوقت موت نے چندرگپت کے حوصلوں کے لیے مہمیز کا کام کیا اور یونانی چھاونیوں کو اس نے بہت جلد تہہ و بالا کرڈالا۔ 317 ق م تک یوڈِمس کسی نہ کسی طرح کار متعلقہ انجام دیتا رہا لیکن پومنیز اور اینٹی گونس کے درمیان لڑائی میں شرکت کے لیے اسی سال اُس نے بھی ہندستان کو خیرباد کہہ دیا۔

نندحکومت کی تباہی اور تاجپوشی کی تاریخ: یونوں کو دریائے سندھ کے اُس پار بھگانے کے بعد چندرگپت نے مگدھ کے نند راجا سے زور آزمائی کے لیے ایک طاقتور فوج جمع کی۔

3/21/2018 P59.jpg (1569×2200)

مدرا رَاکشس کی شہادت کے مطابق چندر گپت کا خاص حلیف پَروتک تھا جسے بعض عالموں نے پورس کے مماثل بتایا ہے۔ اس ناٹک سے مختلف فریقوں کی پیچیدہ سازشوں اور لڑائیوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن پرانوں، بدھوں، اور جینیوں کی تمام روایات کم ازکم اس بات پر متفق ہیں کہ چندرگپت نے نند فوج کو مکمل طور پر شکست دے دی تھی۔ یون طاقت کی تباہی اور نند راجا کی شکست، ان دونوں واقعات کا سکندر کی موت کے بعد تین سال کے اندر پیش آنا قرین قیاس ہے اور اس جہت سے ہم چندر گپت کی تاجپوشی کی تاریخ 321 ق م قرار دے سکتے ہیں۔

اس تاریخ کی تائید لنکا کی شہادتوں سے بھی ہوتی ہے جن کی رو سے، جیسا کہ اوپر بھی ظاہر کیا گیا، ششو ناگ خاندان کا خاتمہ 343 ق م میں ہوا اور نند خاندان کی حکومت 22 سال رہی۔

فتوحات: بدقسمتی سے چندرگپت کی مہموں کی تفصیلات ہمیں ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم۔ یونانی مصنّفین پلوٹارک اور جسٹن کے نزدیک چندر گپت نے تمام ملک کو تاراج کیا اور تمام ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مبالغہ ہے اور حرف بہ حرف درست نہیں ہے، لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کافی شہادتیں موجود ہیں کہ مگدھ اور پنجاب کے علاوہ چندر گپت کا حلقہ اثر ہندوستان کے دور دراز خطوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سوراشٹر کا اس میں شامل ہونا۔ رودردامن کے اس کتبہ سے ثابت ہے جو جونا گڑھ میں ایک چٹان پر پایا گیا ہے۔ اس میں چندرگپت کی آبپاشی کی اسکیموں اور پشیا گپت ویشیہ کے 'راشٹریہ' یا گورنر مقرر کیے جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تامل کے مصنّفین مائل نار اور پتر نار جنوب بعید میں ٹینویلی کے ضلع میں پودی یل کی پہاڑی تک موریہ حملہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ جین روایات اور آخری دور کے کتبے چندر گپت کا تعلق شمالی میسور سے ثابت کرتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ چندر گپت موریہ نے ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کو فتح کرلیا تھا۔

سلیوکس سے جنگ: سکندر کی موت کے چند سال کے اندر اُس کے سپہ سالاروں میں اقتدار کے لیے سخت مقابلہ ہوا جس میں آخرکار سلیوکس فتح یاب ہوا۔ 305 ق م تک اس کی طاقت مغربی ایشیا میں اتنی مضبوط ہوگئی کہ وہ سکندر کی ہمسری کرنے لگا اور ہندستانی مقبوضات کو جنھیں 321 ق م میں بڑی پیراڈی سس کی دوسری تقسیم میں عملاً چھوڑ دیا گیا تھا، ازسرنو حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ سکندر کے حملے کے بعد، بہرحال، ہندستان میں ایک ایسا بادشاہ حکومت کررہا تھا جس نے ایک زبردست سلطنت قائم کرلی تھی اور وہ یونانیوں کے طرزِ جنگ سے بھی ناواقف نہیں تھا۔ بدقسمتی سے قدیم دستاویزوں سے یہ بات صاف نہیں ہوئی کہ چندر گپت سے جنگ میں سلیوکس مغلوب ہوا یا نہیں، یا صرف اتنا ہی ہوا کہ فریقین نے میدان جنگ میں اپنے اپنے لشکروں کا مظاہرہ کرادیا اور واقعتاً جنگ کی نوبت نہ آئی۔ اس میں

چندرگپت موریہ کے دور حکومت کا سکہ

شک نہیں کہ جنگ کی عوت مغرب نے دی تھی، اس لیے حملہ آور اپنے حریف اینٹی گونس سے زور آزمائی کی غرض سے وطن لوٹنے کے لیے مضطرب ہوگیا۔ چندرگپت نے بڑی آسانی سے اپنے موافق شرائط صلح طے کرالیں۔ سلیوکس نے غالباً صرف 500 ہاتھوں کے عوض، جنھوں نے 301 ق م میں اِپ سَس کی جنگ میں نمایاں کام انجام دیا تھا، چندرگپت کو اریا (ہرات) آرا کوشیہ (قندھار) پَروپنی سدیٔ روادی کابل اور گِڈ روشیا (بلوچستان) دے دیا۔ اس طرح موریہ سلطنت کے حدود ٹھیک ہندوکش تک پھیل گئے جو "ہندوستان کی قدرتی سرحد ہے۔" اسی طرح دوستانہ تعلقات کو استوار بنانے کے لیے ہندوستانیوں اور یونانیوں میں شادی کے رشتے کیے گئے اور سلیوکس نے اپنا ایک سفیر جس کا نام میگستھنیز تھا، چندرگپت موریہ کے دربار میں تعینات کردیا۔

میگستھنیز اور کوٹلیہ: میگستھنیز اور کوٹلیہ دو اہم ترین مصنف ہیں جو چندرگپت موریہ کے زمانے میں ہندوستان کے عوام، حکومت اور اداروں کے بارے میں بڑی کارآمد معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ میگستھنیز کی اِنڈکا تو معدوم ہوگئی ہے، البتہ متاخرین نے جو اقتباسات اس کے قلم بند کردیے ہیں وہ ابھی تک محفوظ ہیں۔ کوٹلیہ یا چانکیہ چندرگپت کے وزیر کی حیثیت سے معروف ہے۔ اس کی تصنیف اُرتھ شاستر، سیاسی حکمت عملی اور آئینِ جہاں بانی پر ایک جامع تلخیص ہے اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، کہ اپنے نظریاتی مواد کے باوجود وہ قدیم ہندوستان کے ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

انتظامِ حکومت

فوجی نظام: چندرگپت کو اپنے پیش رو سے ایک عظیم فوج ورثے میں ملی تھی، لیکن اس نے اس میں مزید اضافہ کرکے اُسے 600,000 پیدل، 30,000 سوار اور 9,00 ہاتھیوں تک پہنچادیا۔ 8000 رتھ اس پر مستزاد تھے۔ اس عظیم الشان لشکر کا انتظام باقاعدہ ایک دفتر جنگ کے سپرد تھا جس کے 30 رکن تھے جو پانچ پانچ اراکین کے چھ بورڈوں میں منقسم تھے ان میں سے ہر ایک کے سپرد جو محکمے کیے گئے تھے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بورڈ نمبر (1)......دفتر امیر البحر

بورڈ نمبر 2 ......سواری اور باربرداری، محکمہ رسد، اور جنگی خدمات انجام دینے والے۔

بورڈ نمبر (3)...... پیدل

بورڈ نمبر (4)......سوار

بورڈ نمبر (5)......رتھ

بورڈ نمبر (6)...... ہاتھی

آخری چار شعبے ہندستانی فوج کی روایتی تقسیم کے مطابق تھے یعنی پتّی، پداتی، اشورتھ اور ہستی۔ کوٹلیہ کے بیان کے مطابق یہ سب محکمے اپنے اپنے ادھیکش یا سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔

مرکزی انتظام حکومت: نظامِ حکومت کا صدر راجا ہوتا تھا جس کا فیصلہ فوج، عدالت، عاملہ، اور قانون سازی سے متعلق تمام معاملات میں قطعی اور آخری مانا جاتا تھا۔ فوج کی سرداری وہی کرتا تھا، اور حملے یا دفاع کی اسکیموں پر اپنے سیناپتی، یا سپہ سالار اعظم سے مشورہ کرتا تھا۔ رعایا اپنے مقدمات براہِ راست اُس کے پاس لے جاتی تھی اور وہ فوراً ان کا فیصلہ کرتا تھا۔ تمام اعلیٰ عہدوں پر تقرر وہ خود کرتا تھا، سلطنت کی مالیات کی دیکھ بھال کرتا تھا اور سفیروں سے ملاقات کرتا تھا۔ سرکاری جاسوس خفیہ خبریں لاکر براہ راست اسی کو دیتے تھے۔ آخر میں وہ رعایا کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً 'شاسن' یا

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P59.jpg 1/1

3/21/2018 P60.jpg (1581×2200)

احکامات جاری کرتا تھا۔

ملکی انتظام میں راجا کو مدد دینے کے لے ایک منتری پری شد ہوتا تھا جو ایک مشاورتی مجلس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے اراکین کی فرض شناسی، ایمانداری، اور دانش وری کی آزمائش پہلے سے کرلی جاتی تھی۔ انتظام حکومت کے مختلف شعبوں کی نگرانی، جیسا کہ ارتھ شاستر میں مندرج ہے دوسرے اعلیٰ افسر کرتے تھے مثلاً اماتیہ، مہاماترا اور ادھیکش۔ اٹھارہ پروہتوں یا افسروں کی روایتی فہرست میں حسب ذیل عہدہ دار شامل تھے: منتری (وزیر) پروہت (پجاری) سیناپتی (سپہ سالار اعظم) یوراج (ولی عہد)، دَوواِرک (دربان) اَن ترِوک (حرم کا نگراں) پرشاتری (جیلوں کا بڑا انسپکٹر) سماہرتا (بڑا کلکٹر)، سی دھاتا (خازن)، پردیش ٹری (علاقائی کمشنر)، نایک (شہر کا پولس افسر) پوز (دارالسلطنت کا گورنر) ویوھارک (تجارتی کاروبار کا نگراں یا بڑا جج) کرنان تِک (کانوں اور صنعت و حرفت کا نگراں)، منتری پری شد آدھیکش (کونسل کا صدر)، ڈنڈ پال (پولس کا بڑا افسر)، ڈرگ پال (داخلی دفاع کا نگراں)، انت پال (سرحدی دفاع کا نگراں) اس کے علاوہ دوسرے ادھیکش یا سپرنٹنڈنٹ ہوتے تھے مثلاً کوش (خزانہ)، آکر (کان)، لوھا (دھات)، لکش (ٹکسال) لون (نمک)، سورن (سونا) کوشٹھا گار (مال گودام)، پانیہ (سرکاری تجارت)، کپیہ (جنگلات)، آیدھاگار (اسلحہ)، پولو (وزن اور پیانے)، مان (فضا اور وقت کی پیمائش)، شلک (چنگی)، سوتر (کتائی بنائی)، ستیا (شاہی زمینوں کی کاشت)، سورا (سکرات)، سونا (ذبح)، مُدرا (پاسپورٹ)، وِدیت (سبزہ زار)، دیوت (جوا)، بندھنا گار (جیل)، گئو (مویشی)، نو (جہازی مال)، پٹن (بندرگاہ)، گیکا (بیسوا) اور دوسرے فوج تجارت (سنستھا) اور مذہبی اداروں کی دیکھ بھال کرنے والے افسر (دیوتا)

صوبائی انتظام: چونکہ سلطنت کافی وسیع و عریض تھی اس لیے انتظامی سہولت کے لیے اُسے کئی صوبوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ اندرونی صوبے براہِ راست راجا کی اپنی نگرانی میں تھے، اور جیسا کہ ہمیں اشوک کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے، اہم صوبوں کا انتظام راجکماروں (کمار) کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ٹکسیلا، توشلی (دھولی)،

سورن گری (سون گیر) اور اُجین اسی قسم کے صوبے تھے۔ جن میں راجا کا نائب السلطنت (وائسرائے) حکومت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جاگیردار سردار تھے جو شہنشاہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اسے فوجی امداد بہم پہنچاتے تھے۔ حکومت کی مشین چلانے کی ذمے داری انھیں عمال پر تھی اور ان عمال کے اعمال و افعال کی کڑی نگرانی کے لیے ناظر اور جاسوس (چرہ) مقرر تھے۔ اس جاسوسی نظام اور نگرانی بالائے نگرانی کے طریقے نے دور و دراز کے علاقوں میں لوگوں کی تکلیف و پریشانی دور کرنے اور راجا کو تمام معاملات میں ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے میں یقیناً مدد دی ہوگی۔

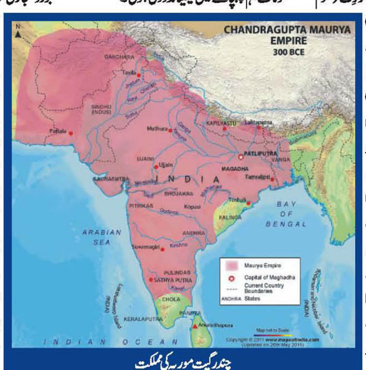

چندرگپت موریہ کی مملکت

میونسپل انتظام: میگستھنیز نے صرف پاٹلی پتر کے میونسپل انتظام کی تفصیلات قلم بند کی ہیں، لیکن اس سے ہم بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سلطنت کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں بھی اسی نمونے کا انتظام رائج ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہر کا انتظام چھ بورڈوں کے ایک کمیشن کے تحت رہتا تھا جن میں سے ہر ایک میں پانچ رکن ہوتے تھے۔ بقول ونسنٹ اسمتھ یہ بورڈ "ہماری عام غیر سرکاری پنچایتوں کی سرسری شکل تھے۔

پہلا بورڈ تمام ان چیزوں کی دیکھ بھال کرتا تھا جو صنعت و حرفت سے تعلق رکھتی تھیں۔ کاریگروں پر اس کی خاص توجہ تھی۔ یہ دیکھنا اس بورڈ کا کام تھا کہ کاریگر چیزیں بنانے میں اچھا مال لگاتے ہیں یا نہیں۔ کاریگروں کی مزدوری بھی یہی بورڈ مقرر کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی کاریگر کا ہاتھ پانو توڑ دیتا تو اُسے سزائے موت دی جاتی تھی۔

دوسرا بورڈ غیر ملکیوں کی ضروریات اور نقل و حرکت کی دیکھ بھال اور جانچ کرتا تھا۔ ان کے قیام کا انتظام سرکار کی جانب سے کیا جاتا تھا اور اس کا مال و اسباب دعوے داروں کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ اس بورڈ کا وجود ظاہر کرتا ہے کہ راجدھانی میں کافی بڑی تعداد غیر ملکیوں کی پائی جاتی تھی۔

تیسرا بورڈ فوتی ولادت کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار محصول اور ٹیکس وغیرہ لگانے کے سلسلے میں صحیح اعداد و شمار فراہم کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

چوتھے بورڈ کے سپرد تجارت کی نگرانی کا کام تھا۔ یہ بورڈ تجارتی اشیا اور اجناس کی قیمتیں مقرر کرتا تھا اور جھوٹے باٹوں اور پیانوں کی جانچ کرتا تھا۔ جو لوگ کئی قسم کی چیزوں کی تجارت کرتے تھے انھیں محصول یا ٹیکس زیادہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

پانچواں بورڈ صنعتوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ کارخانے داروں کے لیے قانون یہ تھا کہ اگر وہ نئی چیزوں میں پرانی چیزیں ملا کر فروخت کریں گے تو انھیں جرمانے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

چھٹے بورڈ کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ تجارتی مال پر دسویں حصہ کا محصول وصول کرے۔ اس ٹیکس کی ادائیگی میں غفلت یا ٹال مٹول پر، خاص کر جب رقم زیادہ بڑی ہوتی، سنگین سزا دی جاتی تھی۔ لیکن اگر کوئی نیک نیتی کے ساتھ ادائیگی سے قاصر رہتا تو اس کے ساتھ یقیناً رعایت برتی جاتی تھی۔

مجموعی طور پر ان میونسپل کمشنروں سے توقع کی جاتی تھی کہ مندروں، بندرگاہوں اور دوسرے پبلک اداروں کا انتظام کریں۔

کوٹلیہ نے ان بورڈوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس نے شہر کے ایک عہدہ دار کا ذکر کیا ہے جسے ناگرک یا نگرادھیکش کہتے تھے۔ اس افسر کے ماتحت اِستھانک اور گوپ ہوتے تھے۔ استھانک کے حلقہ میں شہر کا چوتھائی حصہ اور گوپ کے حلقہ میں شہر کے چند کنبے ہوتے تھے۔

پاٹلی پتر: بے محل نہ ہوگا اگر اس مقام پر مختصراً دارالسلطنت کا تذکرہ کیا جائے۔ پاٹلی پتر (میگستھنیز نے اُسے پالم بوتھرا لکھا ہے) جو پریشیوں کے ملک میں واقع تھا "ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا اس کی لمبائی 9½ (1/80ٹ اسٹیڈیا) اور چوڑائی 1/3/4 میل

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P60.jpg 1/1

3/21/2018 P61.jpg (1579×2200)

(پندرہ اسٹیڈیا) تھی اور یہ دریائے ارنابوآس (سون) اور گنگا کے درمیانی گاؤدُم خطۂ زمین پر واقع تھا۔ شہر کے دفاع کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے چاروں طرف ایک خندق کھودی گئی تھی جو چھ سوفٹ (چھ پلیتھرا) چوڑی اور تیس ہاتھ گہری تھی۔ ایک اور دفاعی رکاوٹ بیرونی دیوار تھی جسم میں 570 مینار اور 64 پھاٹک تھے۔ اسی قسم کی قلعہ بندی سلطنت کے دوسرے شہروں میں بھی ہوگی۔

دیہاتی انتظام: نظامِ حکومت کی سب سے چھوٹی اکائی گانو (گرام) تھا۔ اس کا انتظام گرام ورِدّھاؤں یا گانو کے بزرگوں کی مدد سے گرامک (مکھیا) کرتا تھا۔ پانچ یا دس گاوؤں کا عامل گوپ کہلاتا تھا اور اس کے اوپر استھانک ہوتا تھا جس کے ماتحت ایک چوتھائی ضلع (جن پد) ہوتا تھا یہ افسر پردیش ٹری اور سماہرتا کی نگرانی میں رہتے تھے۔

ضابطۂ فوجداری: میگستھنیز اور کوٹلیہ دونوں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ضابطۂ فوجداری سنگین تھا۔ عام طور پر ملزمین کو جرمانے کی سزا دی جاتی تھی جس میں جرم کے لحاظ سے کمی بیشی ہوسکتی تھی، لیکن خوفناک سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر کاریگروں کو گزند پہنچانے اور تجارت کے مال پر دسواں حصہ ادا نہ کرنے کی سزا نہایت درجہ سنگین تھی۔ دروغ حلفی پر ہاتھ پیر کاٹنے کی سزا تجویز کی ہے۔ مزید براں ملزمین و مجرمین سے اقبال جرم کرانے کے لیے انھیں منظر عام پر جسمانی اذیت پہنچانا مثلاً کوڑے وغیرہ لگانا جائز تھا۔ اس قدر شدید و سنگین طریقوں نے انسدادِ جرم میں کافی مدد دی ہوگی۔

آبپاشی: چندرگپت نے آبپاشی کے مسئلہ پر خاص توجہ کی۔ میگستھنیز ایسے افسروں کا ذکر کرتا ہے جن کا فرض تھا کہ زمین کی پیائش کریں اور کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے نہروں کی شاخوں پر جو بند بنائے گئے تھے ان کا معائنہ کریں۔ تاکہ سب لوگ مساوی طور پر اس سہولت سے فائدہ اٹھاسکیں۔

چندرگپت کو اپنی رعایا کے راحت و آرام کا اتنا خیال تھا کہ دور دراز سوراشٹر میں اس نے اپنے گورنر پشیا گپت کو ایک پہاڑی چشمہ پر ڈام بنانے کا حکم دیا اور اس طرح ایک باقاعدہ تالاب وجود میں آگیا جس کا نام سدرشن رکھا گیا۔ اس تالاب سے آب پاشی میں بڑی آسانیاں ہوگئیں۔

آمدنی اور خرچ کے ذرائع: آمدنی کا خاص ذریعہ مال گزاری تھی۔ عام طور سے پیداوار کا چھٹا حصہ بطور لگان (بھاگ) سرکار وصول کرتی تھی۔ لیکن یہ شرح غالباً مخصوص مقامات و حالات کے مطابق تبدیل ہوجاتی تھی۔ آمدنی کی مدں میں کانوں، جنگلات، سرحدوں پر وصول ہونے والے محصول چنگی، کشتیوں کا محصول، ماہرین فن سے وصول ہونے والی فیس، ٹیکس، دسویں حصہ کا محصول، جرمانے اور اتفاقی حادثات کے موقعے پر وصول ہونے والی خیراتی رقمیں شامل تھیں۔ مالیات کا ذمے دار اور سرکاری مالگذاری وصول کرنے والا افسر سماہرتا کہلاتا تھا۔

ان تمام مدات سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ زیادہ تر راجا اور اس کے درباری اخراجات پر صرف ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ خرچ کی دوسری مدیں تھیں، مثلاً فوج، دفاعی انتظامات، عمالِ حکومت کی تنخواہیں، کاریگروں اور دوسری پیشہ ور جماعتوں کے بھتے، خیرات، مذہبی اور رفاہ عام کے دوسرے کام جیسے سڑکیں، آبپاشی، تعمیرات وغیرہ۔

میگستھنیز کا بیان ہندوستانی ذاتوں کے بارے میں: یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میگستھنیز نے ہندوستانی سماج کو سات طبقوں یا 'ذاتوں' میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا طبقہ 'فلسفیوں' کا تھا اور اگرچہ تعداد میں کم تھا لیکن عزت و احترام سب سے زیادہ اسی کا کیا جاتا تھا۔ عام طور پر اس میں برہمن اور سنیاسی لوگ شامل تھے۔ دوسرا طبقہ کاشتکاروں کا تھا جو تعداد میں سب سے زیادہ تھا۔ تیسرا طبقہ شکاریوں اور چرواہوں پر مشتمل تھا۔ چوتھے طبقے میں بیوپاری، کاریگر، اور کاشتکار شامل تھے۔ پانچواں طبقہ فوجیوں کا گویا چھتریوں کا تھا۔ چھٹے اور ساتویں طبقوں میں علی الترتیب جاسوس اور مشیر تھے۔ آخرالذکر دو طبقے ظاہر ہے سماجی طبقوں میں شامل نہیں تھے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سلیوکس کے سفیر سے بھول ہوئی ہے۔

شاهی محل: چندرگپت بڑی شان و شوکت کے ساتھ زندگی گزارتا تھا اس نے اپنے رہنے کے لیے ایک عالی شان محل تعمیر کرایا جو ایک وسیع و عریض سبزہ زار میں واقع تھا اس کی زیبائش کے لیے طلائی ستون، مچھلیوں کے لیے تالاب اور سایہ دار روشیں بنائی گئی تھیں۔ لوگ اُسے دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ 'سوسا' اور 'ایک بتانا' کے محل بھی اس کی برابری نہیں کرسکتے تھے۔

چونکہ اس تعمیر میں بیشتر لکڑی استعمال کی گئی تھی اس لیے یہ زمانے کے خشک و تر کا مقابلہ زیادہ عرصے نہ کرسکا، لیکن پٹنہ کے قریب 'کمرہار' میں جو کھنڈر ڈاکٹر اسپونر نے دریافت کیے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ چندرگپت کے محل میں سو ستون پائے جاتے تھے۔

چندرگپت کی نجی زندگی: محل کے اندر چندرگپت زنانہ باڈی گارڈ کی حفاظت میں رہتا تھا۔ اسے مستقل اپنے قتل کا خطرہ رہتا تھا، اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لگاتار دو راتیں ایک کمرے میں سوکر نہیں گزارتا تھا۔ یہ دراصل مبالغہ ہے، لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ راجا کی حفاظت کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ راجا چار موقعوں پر محل سے باہر نکلتا تھا۔ جب وہ کسی فوجی مہم کے لیے کوچ کرتا، قربانیوں کی رسم ادا کرتا، کسی مقدمہ میں انصاف کرتا، یا شکار کے لیے باہر جاتا وہ بڑا فرض شناس تھا اور جب اس کے جسم پر آبنوس کے بیلنوں سے مالش ہورہی ہوتی اس وقت بھی وہ دادخواہوں کی فریاد سنتا تھا۔ جب راجا شکار کے لیے نکلتا تو تمام راستہ میں امتیاز کے لیے رسیاں باندھ دی جاتی تھیں۔ ان رسیوں کو پار کرنا موت کے مترادف تھا۔ راجا منظر عام میں سونے کی پالکی میں سوار ہوکر آتا تھا اور اپنے شوخ اور زرق برق لباس میں سب سے ممتاز نظر آتا تھا۔ سفر میں وہ گھوڑے اور ہاتھی بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ کھیل کود کا بہت شوقین تھا۔ سپہ گری کے مقابلوں، مینڈھوں اور گینڈوں کی لڑائیوں کا وہ بہت شوقین تھا۔ بیلوں کی دوڑ بھی تفریح کا ایک مقبول ذریعہ تھی جس میں بازی لگانے کا موقع بھی خوب مل جاتا تھا۔

چندرگپت کا انجام: بعض جین روایات کی رو سے چندرگپت جین مذہب کا پیرو تھا اور اس کے دور حکومت کے آخری زمانے میں جب مگدھ میں قحط پڑا تو وہ جین سردار قبیلہ بھدر یا ہو کی ہمراہی میں میسور چلا گیا۔ مزید برآں کہتے ہیں چندرگپت نے جین قاعدے کے مطابق فاقے کرکے اپنی زندگی کو ختم کردیا۔ معلوم نہیں یہ روایات کہاں تک قابل اعتماد ہیں، لیکن متوسط دور کے کچھ کتبے میسور سے اس کی وابستگی ظاہر کرتے ہیں۔ ممکن ہے آخر عمر میں چندرگپت نے جین اثرات قبول کرلیے ہوں اور عبادت و ریاضت کی نیت سے اپنے لڑکے کے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہوگیا ہو۔ 24 سال حکومت کرنے کے بعد 297 ق م میں اس کا انتقال ہوگیا۔

■

ماخذ: قدیم ہندوستان کی تاریخ، مصنف: رماشنکر ترپاٹھی، مترجم: سید یحیٰ حسن نقوی، تیسری طباعت: 2011، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P61.jpg 1/1

3/21/2018 P62.jpg (1570×2200)

ہندی ادب میں فیض احمد فیض

قاسم خورشید

ہندی میں فیض کی شخصیت شاعری اور سماجی سروکاروں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ان کی دربدری کو لے کر جتنی گمبھیرتا ہندی میں ملتی ہے شاید کسی اور زبان میں ایسی شدت کا فقدان ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہندی میں اگر بہار تندو ریش چندر کی ادبی وراثت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زبان میں عوامی سروکاروں کے مسائل شروع سے ہی دیانتداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لیے فیض کی دربدری یا نرواسن کے درد کو ہندی ادیبوں نے اپنا درد بنا کر پیش کیا ہے۔

مکتی بودھ، نرالا، شمشیر بہادر سنگھ، اگیئے کی طرح ہندی ادب میں بھی فیض احمد فیض قابل صداحترام تصور کیے جاتے ہیں۔ ہندی کا وسیع تر حلقہ فیض کی شعری کائنات کا قائل ہے۔ ان کے یہاں درد کا جو رشتہ ہے وہ بہت مستحکم و گہرا ہے۔ فیض سرحدوں کی فصیل کے کبھی قائل نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں آفاقیت نصیب ہوئی۔ دنیا کا کوئی بھی ایسا ملک نہیں ہے جہاں فیض موجود نہ ہوں۔ ہندوستان نے انھیں مکمل طور پر اپنی ادبی وراثت کا امین تسلیم کیا ہے۔ ہندی کے محققین نے بارہا یہ اعتراف کیا ہے کہ پاکستان میں جب بھی فیض کی کوئی کتاب شائع ہوتی فوراً اسے ہندی میں منتقل کردیا جاتا اس طرح بہ یک وقت دونوں زبانوں کے وسیلے سے فیض کی تخلیقات قارئین تک پہنچتیں۔ اصغر وجاہت معترف ہیں کہ:

''ہندی کی یہ بھری پری دنیا فیض احمد فیض کو اپنا اور بالکل اپنا شاعر مانتی ہے۔ یہ صرف اتفاق نہیں کہا جائے گا فیض کی کتابیں جیسے جیسے پاکستان میں آتی رہیں ویسے ویسے وہ ہندوستان میں بھی چھپتی رہیں۔ صرف راج کمل پرکاشن نے 'شیشوں کا مسیحا، میرے دل مرے مسافر، اور پرتی ندھی یعنی نمائندہ کویتاؤں میں فیض کو بھی چھاپا ہے۔''

ہندی میں فیض کی شاعری کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہندی کے رسائل میں جہاں فیض شائع ہوتے رہے محققین نے انھیں یکجا کیا اور بعض ایسا انتخاب بھی شائع کیا ہے جس میں فیض کا وہ کلام بھی مل جاتا ہے جو پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوا۔ جیسے ہندی کے معروف فکشن نگار شاعر عبدل بسم اللہ نے 'سارے سخن ہمارے' میں ایسی تخلیقات بھی ترتیب دی ہیں جو مکمل طور پر کسی اور مجموعے میں نہیں ہیں۔

ہندی میں فیض احمد فیض کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے خصوصی طور پر ناقدین اور تخلیق کاروں نے تین پہلوؤں کو اپنے موضوعات بنائے ہیں، فیض کی ترقی پسندی، فیض کی دربدری اور فیض کی رومانی شاعری۔

ہندی ادب میں فیض کی ترقی پسندی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ صرف اپنے ملک کو بیدار کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دنیا میں جہاں بھی نابرابری، استحصال یا بے راہ روی کے درد کو محسوس کیا اسے اپنا موضوع بنایا۔ اسی لیے فیض کے وژن کو دنیا کی بڑی آبادی نے نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا ہے بلکہ اس روشنی میں مستقبل کے خوبصورت خواب کی تعبیر کے لیے جدوجہد بھی کی ہے۔ فیض کے ادب کی معنویت کو پیش نظر رکھ کر انھیں ناگزیر تصور کیے جانے کے عمل میں معروف تخلیق کار پروفیسر کھیا نے اعتراف کیا ہے کہ:

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P62.jpg 1/1

3/21/2018 P63.jpg (1589×2200)

''دراصل فیض ہمارے یگ کے لیے جو کئی معنوں میں بہت بدلا ہوا نظر آتا ہے Relevant ہیں۔ وہ ماضی کے دور کی یاد دلاتے ہوئے بھی اکیسویں صدی میں زندہ ہیں۔ کچھ ایسے اقدار ہوتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت رہتی ہے۔ انسان کو معلوم نہیں کتنی صدیوں تک رہنا پڑے اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے وہی چیز ہمیشہ موثر رہے گی جو اس کے انسانی جذبات کو طاقت دیتی رہے اور اس کے لیے ایک اچھے، صحت مند ماحول بنائے رکھنے میں مددگار ثابت ہو۔ فیض کی شاعری میں اسی طرح کی چیزیں ہیں۔''

تگ ودو کے دوران حوصلے اکثر پست ہوجاتے ہیں لیکن فیض تو مایوسی میں بھی قندیلیں اس طرح روشن کردیتے ہیں کہ منزل کی جستجو آسان ہوجاتی ہے:

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

فیض کو بخوبی اندازہ تھا کہ ظلم کی سیاہ رات کی صعوبتیں بہت دیر اور بہت دور تک ساتھ ہوں گی یہ کوئی آسان مرحلہ تو نہیں ہوتا۔ اسی لیے جب پیمانہ لبریز ہوتا ہے تو مایوسی کسی انقلاب کی مستحکم آواز بن جاتی ہے:

کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگا
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

یا پھر یہ کہ:

ہر محنت کش جگ والوں سے جب اپنا حصہ مانگیں گے
اک کھیت نہیں اک دیش نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے

ہندی کے بیشتر نقادوں نے فیض احمد فیض کی اشتراکیت کو ایک ایسا لائحہ عمل بھی تصور کیا ہے، جسے اپنائے بغیر دنیا کی بڑی آبادی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی:

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہوسکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

اسی عمل میں وہ زنجیر کی جھنکار سے بھی قوموں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں:

متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ہندی میں فیض احمد کی اشتراکیت کے پیش نظر بہت تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور یہاں محض 1936 یا اس کے بعد ترقی پسند تحریک سے ابھرنے والے ادب کے یک رخی پہلو کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ فیض کو تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کی آواز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ فیض پاکستان میں ہونے کے باوجود کبھی محض اس ملک کے عوام کی آواز بن کر نہیں رہے بلکہ ان کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

ایک مشہور واقعہ گوش گزار کرتا چلوں کہ 1967 میں سویت ادیبوں کی چوتھی کانگریس میں پاکستان کی طرف سے فیض احمد فیض اور ہندوستان کی طرف سے کرشن چندر نمائندگی کررہے تھے۔ ہوٹل ماسکو کے وسیع ہال میں اس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ کرشن چندر پہلے ہی ہال میں پہنچ چکے تھے۔ جب فیض احمد فیض کچھ دیر بعد آگئے تو دونوں کی آنکھیں ہم کلام ہوئیں۔ کرشن چندر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور پھر ہندوستان کا فلیگ لے کر کرشن چندر اور پاکستان کا فلیگ لے کر فیض احمد فیض ایک دوسرے کی طرف بڑھے دونوں کچھ دیر بعد ہال کے بیچوں بیچ آگئے اور ایک ساتھ ہندوستان اور پاکستان کا جھنڈا لہرا دیا۔ ہال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

یہ ذکر اس لیے ناگزیر تھا کہ فیض یا کرشن چندر کا ادب کبھی کسی سرحد کی حدود میں نہیں رہا اور زندہ ادب کبھی محدود ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ وہ ترقی پسندی ہے جو انسان کے وجود کو معنی کے نئے پیکر عطا کرتی ہے۔ ہندی میں اسی جہت فیض پر گفتگو کی گئی ہے۔ چاہے وہ دوارکا پرساد، چارومتر ہوں اصغر وجاہت، چنچل چوہان، سیما اوجھا، مرلی منوہر پرساد، کانتی موہن، ظہور صدیقی یا من موہن ان سبھوں نے فیض کے مقام کے تعین میں عالمی ادبیات کی صحت مند روایتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

ہندی میں فیض کی شخصیت شاعری اور سماجی سروکاروں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ان کی دربدری کو لے کر جتنی گمبھیرتا ہندی میں ملتی ہے شاید کسی اور زبان میں ایسی شدت کا فقدان ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہندی میں اگر بھارتندو ریش چندر کی ادبی وراثت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زبان میں عوامی سروکاروں کے مسائل شروع سے ہی دیانتداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لیے فیض کی دربدری یا نرواسن کے درد کو ہندی ادیبوں نے اپنا درد بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں سے اکثر فیض کو نئے سرے سے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنچل چوہان اور دوسرے ادیبوں نے خصوصی طور پر پاکستان میں ضیاء الحق کی فوجی تانا شاہی کے دوران فیض کی دربدری اور صعوبتوں کو بہت ہی پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے اس مضمون کا بھی حوالہ دیا ہے جو 'نرواسن پر کچھ چنتن' عنوان کے تحت لکھا گیا تھا۔ خصوصی طور پر انھوں نے ذکر کیا ہے کہ:

''کئی برس پہلے میں نے اپنے زمانے کے اُردو کے عظیم تر شاعر فیض احمد فیض کے ساتھ کچھ وقت بتایا تھا۔ وہ اپنے وطن پاکستان میں ضیا کی فوجی سرکار کے چلتے جلاوطن ہوکر بیروت آگئے تھے جہاں ان کا ایک طرح سے استقبال ہوا۔ فلسطینی ان کے قدرتی طور پر جگری دوست تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں آپس میں بڑی گہری اپنائیت تھی جبکہ زبان یا شعری روایت یا زندگی کی تاریخ ان سے نہیں ملتی، جلتی تھی۔ صرف ایک بار میں نے فیض کو اپنے نرواسن (دربدری) کے درد سے نجات پاتے ہوئے دیکھا تھا جب ان کے ایک پاکستانی دوست اقبال احمد بیروت آئے تھے جو خود بھی دربدر تھے۔ ہم تینوں ایک گندے سے ریسٹورنٹ میں دیر رات تک جمے رہے، فیض اپنی نظمیں سناتے رہے۔ ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جو میں دیکھ رہا تھا، اس کے لیے کسی ترجمے کی ضرورت درکار نہیں تھی۔ یہ تاثرات ایک طرح سے مزاحمت (پرتی رودھ) کی لے سے بھری گھر واپسی جیسا تھا، مانو وہ کہہ رہے ہوں ''اے ضیا لو ہم آگئے، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔'' ضیا تو اصلیت میں اپنے ملک میں ہی تھا، وہ ان کی مزاحمت کی آواز نہیں سن رہا تھا۔''

اپنے وطن اپنی مٹی اپنی آماجگاہ، اپنی زبان، اپنی فضا سے دور ہونے کا درد لازوال ہوتا ہے۔ زندان سے نکلنے یا زنجیروں سے پاؤں کے آزاد ہونے کے باوجود تمام عمر انسان اسی حصار میں رہتا ہے۔ حلقۂ زنجیر میں زبان رکھنے والے تخلیق کار فیض احمد فیض کی زندگی کا طویل حصہ دہشت کے حصار میں گزرا۔ ہجرت کے دوران بھی غموں نے قاتلوں کی طرح تعاقب کیا۔ وقت ایسا بھی آیا جب انھیں یہ احساس ہوا کہ:

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آلگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

یہ انداز بھی ہے کہ:

جن پہ آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P63.jpg 1/1

اپنی آنکھ ان کے غم میں برستی رہی
سب سے اوجھل ہوئے حکم حاکم پہ ہم
قید خانے سہے تازیانے سہے
لوگ سنتے رہے سازِ دل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے

ہندی میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ فیض کی تخلیقیت اسی درد سے ابھر کر ادب کا بیش قیمت اثاثہ بن گئی:

مرے دل مرے مسافر/ ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم/ دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا/ کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا/ ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

گہری تاریکیوں میں جب کہیں سے کسی روشنی کی کوئی امید نہیں ہوتی تو عزم رکھنے والے اپنی تلاش میں سرگرداں ہوجاتے ہیں۔ کوئی سبیل نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم نوا کوئی نہیں ہوتا۔ راستے مسدود ہوتے ہیں اور ان بند راستوں میں صرف کوچۂ قاتل میں اماں ملنے کی امید ہوتی ہے۔ فیض نے ایسے لمحوں کو بھی نئی معنویت عطا کرنے کی کوشش کی ہے:

میرے قاتل میرے دلدار
میرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہم مشک لیے نشتر الماس چلے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی نکلے
درد کا کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبتے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی راہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقل مے
بحرِ ناآسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی سنسان سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو

دربدری ہو، اسیری ہو تنہائی ہو تو تصورات کا سرمایہ انتہائی وقیع ہوجاتا ہے اپنے حصار میں سمٹا ہوا شخص زمانے کا درد لے کر جیتا ہے۔ غم جاناں اور غم دوراں کی بہت شکلیں ابھرتی ہیں۔ رومان کا مقدس اور غیر مشروط لہجہ پتھروں کو بھی موسیقیت عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے اکثر حقیقی اور مجازی عشق کے تصور میں تفریق آسان نہیں ہو پاتی۔ فیض کی رومانیت کا بھی اپنا منفرد لہجہ رہا ہے۔ عہد آفریں شاعر اروِن کمل نے واضح کیا ہے کہ: 'فیض کی رومانیت میں ہلکی 'آوارگی' بھی ہے، دوستوں کی سی نزدیکی بھی ہے اور اردو شاعری کا وہ خاص مزاج بھی ہے، جس کے چلتے بہت ہی سنگین موقعوں پر بھی

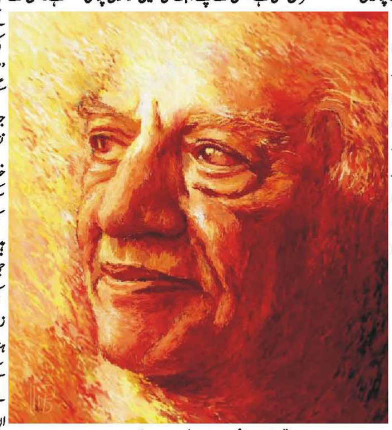

وہ ساقی، میکدہ، عشق، معرفت کی ہی بات کرتے ہیں۔ 'لاؤ تو قتل نامہ میرا' میں عشق، ساقی، مے، اور میکدہ سب موجود ہیں، لیکن یہ سب اصلی معنی کو چھوڑ کر فوری تقاضے میں ڈھل جاتے ہیں۔ عجیب الجبرا ہے فیض کی شاعری کا:

تہمت تمھارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ میرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

رومانیت میں اگر فطری آوارگی نہ ہو تو مصلحتیں حاوی ہونے لگتی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر شاعری ذہن اور دل کے درمیان دیوار بن کر حائل ہوجائے گی۔ فیض تو غم جہاں کا بھی حساب کرتے ہیں تو حدیث دل میں محبوب کی شبیہ ہی جابجا نظر آتی ہے:

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

اسی طرح ہندی میں فیض کے اشعار رومان کی معیار سازی کے طور پر جابجا پیش کیے گئے ہیں۔

مشہور ہندی ادیب مرلی منوہر پرساد سنگھ نے فیض کی شاعری کے مختلف نکات پیش کرتے ہوئے انھیں ایک ایسا شاعر تصور کیا ہے جو اردو کے ساتھ ہندی اور پنجابی میں بھی یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے آہنگ سے بھی اشعار کے معنی واضح ہونے لگے ہیں۔ ان کے حوصلے کو مرکزیت عطا کی گئی ہے:

"ٹوٹی ہوئی تمناؤں کی ٹیس اور آگے آگے سنگھرش جاری رکھنے کا حوصلہ۔ یہ دونوں جز فیض کی شاعری کے ستون ہیں۔ ایسی نظموں یا غزلوں کو سن کر یا پڑھ کر کوئی خاموش، لاتعلق اور غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ فوراً ہی یہ مصرعے دھیمی گونج پیدا کرتے ہیں، لوگ انھیں گنگنانے لگتے ہیں اور وہ ایک مجموعی لے کی تال پر جھومنے لگتے ہیں۔ بیگانہ کوئی رہ نہیں سکتا کیونکہ ان کے احساس کو یہ شاعری ایک نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔"

ہندی ادب میں فیض کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے جو تحریریں روشن ہیں ان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری تخلیق ان موجوں کی طرح ہے جو اپنے لیے خود ہی راہوں کا تعین کرلیتی ہے۔ احساس کی زمین دیر تک اور دور تک بنجر نہیں رہ سکتی۔ آنکھوں کے نم ہونے کا کوئی موسم نہیں ہوتا اور کبھی کبھی آنسوؤں کے بہنے کی وجہ بھی دھند میں کھوئی ہوتی ہے۔

اور ایسے میں اگر کوئی ہمارے جذبات کی ترجمانی کردیا کرتا ہے تو پھر وہ ہماری ذات کا اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔ فیض احمد فیض کی تخلیقات ان کے ڈکشن اور جگر سوزی نے ایسی ہی دنیا کی تعمیر کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ عزم حساس آبادیوں میں اب بھی منتقل ہورہا ہے۔

■

Dr. Qasim Khursheed, Head Dept of Languages, SCERT, Patna, (Bihar)

دیوپرساد داس

اڑیا کہانی

پھیرا

بھیڑ سے بھری سڑک پر دوڑتا ہوا ہجوم، یہ اس کی جانی پہچانی سڑک ہے۔ گزشتہ بارہ برسوں سے اس سڑک کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہے۔ روز اسی سڑک سے وہ گھر سے دفتر آتی ہے۔ پھر لوٹتی ہے۔

رخسانہ جلدی جلدی دفتر سے نکل کر سامنے والی سڑک کو دیکھنے لگی۔ پھر آسمان، پھر افق۔ آہستہ آہستہ نظر گھما کر اس نے بھیڑ پر نگاہ ڈالی۔ کسی کو پہچاننا ممکن نہیں تھا۔

آسمان کو چیرتی ہوئی اوپر اٹھی ہوئی مکیش کاٹن مل کی بند پڑی چمنی، سڑک کے ایک طرف والا رنگین ہورڈنگ، موڑ کے بائیں طرف لوکل اسٹیشن کی چھت پر چہچہاتے پرندوں اور سڑک پر تیزی سے دوڑتی ہوئی بھیڑ.. کچھ بھی، اسے کوئی بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر وہ محسوس کرتی ہے کہ دنیا ٹھیک اسی طرح ہے، جیسے کہ کل تھی، پرسوں تھی اور اس سے پہلے والے دن تھی، مگر آج وہ کسی کو بھی پہچان نہیں پا رہی ہے۔

اس نے چہرے سے نقاب ہٹا لیا۔ وہ اندر سے بالکل پریشان ہو چکی تھی۔ ایک طرح سے سانس رک جانے والا تجربہ۔ روز دفتر سے گھر وہ ذرا دیر سے لوٹتی ہے مگر آج وقت سے پہلے لوٹ رہی ہے۔ پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہے۔ رخسانہ کو تجربہ ہوا، دفتر سے گھر تک پہنچنے کی اس کی یہ کوشش زندگی کا سب سے بڑا سفر جیسا ہے۔

اس نے گلے میں لٹکے تعویذ کو ہاتھ سے پکڑ کر دونوں آنکھوں اور پیشانی تک لے گئی۔ جس تعویذ کو وہ آج تک بیکار چیز سمجھتی آئی تھی، ایک عقیدے میں بدل گئی۔

ایک دن امی نے اس کی حفاظت کے لیے یہ تعویذ دیا تھا۔ رخسانہ کو ان سب چیزوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ تعویذ ویسے ہی پڑھنے والی میز کی دراز میں پڑا رہا۔ امی نے کتنی بار منتیں کی تھیں، اپنے لیے نہ صحیح کم سے کم میرے لیے پہن لے۔ ماں کی ضد کے سامنے رخسانہ کی ایک نہ چلی۔ آج اچانک اسی تعویذ کی موجودگی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ شاید اعتماد اور عقیدہ یہی ہے۔ اچانک خود کو ظاہر کر دیتا ہے۔

وہ تیزی سے چلنے لگی۔ آج کچھ زیادہ ہی بھیڑ ہے، دوسرے دنوں کے مقابلے۔

اس بھیڑ میں سے کوئی زور سے چلایا۔ "انھیں لوگوں نے کیا ہے یہ سب، یہی ہیں بدمعاش.. " رخسانہ چونک گئی۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بھیڑ کی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ بھیڑ کی کوئی خاص آواز نہیں ہوتی۔ اس طرح کی باتیں سننا عام تھا۔ وہ لوگ تو ہمیشہ شک کے گھیرے میں رہتے ہیں۔ پھر سے اسی موبائل میسج کی یاد آ گئی۔ بامب بلاسٹ ان داستی۔ شہر میں دھماکا۔

اس کے اپنے شہر میں پھر ایک دھماکا۔ بے نیاز بھیڑ پھر اچانک رخ بدل سکتی ہے۔ شک کی چنگاری پھر سے آگ لگا سکتی ہے۔ پچھلی بار تو ایسا ہی ہوا تھا۔ بے اعتمادی اور نفرت نے برسوں کے رشتوں اور بھائی چارے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

خون کی پیاسی بھیڑ بغیر کچھ سمجھے سب کچھ برباد کر دینے پر تلی تھی۔

پورا علاقہ آگ کی لپٹوں میں آ گیا۔ جانے پہچانے لوگ بے گانے لگتے تھے۔ رخسانہ نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہی جلتے گھر کو دیکھا تھا۔ باہر کی دنیا گھر سے زیادہ محفوظ بن سکتی ہے۔ کیا؟ وہ لوگ پھر لوٹ آئے تھے، لیکن تب ان کے ماضی کا جیسے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

گھر کی یادیں بچپن اور رشتے سب جل چکے تھے۔ پھر سب ہنسنا بھول گئے تھے۔ زندگی پھر اپنی رفتار میں آگئی لیکن سینے میں، یادوں میں، دل میں کبھی نہ مٹنے والے داغ اور گرداب بھی انہیں ڈراتے ہیں۔ کیسے بدل گئی یہ دنیا؟ کچھ خاموشیوں کی گونج لوٹا کر لے آتی ہے، جہاں کاغذ کا پرزہ اڑتا ہے تو طوفان سا سنائی پڑتا ہے۔

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P65.jpg 1/1

بھیڑ کا نشانہ وہ بھی ہوسکتی ہے، وہ اور اس کے جیسے کئی لوگ شک کے گھیرے میں ہیں۔ سچائی کو ڈھونڈھا جاسکتا ہے، تھوڑے ہی لوگوں کے لیے پوری قوم کو مورد الزام بنا کر سوال پوچھے جاسکتے ہیں۔

بغل میں ایک تنگ گلی، اندھیارے اور اجیارے کا لکا چھپی کا کھیل! یہ جگہ صحیح ثابت ہوسکتی ہے۔ بڑے ہی احتیاط سے گلی میں جا کر اس نے برقعے کو نکال کر بیگ میں رکھ لیا۔

پھر وہ سڑک پر چلی آئی، سامنے لوگوں کا سیلاب! اس نے اس بھیڑ میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ اتنا بڑا شہر جو رات میں کبھی نہیں سوتا ہے حالانکہ آج جیسے دنوں میں بند کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ٹھہر جانا چاہتا ہے۔ کچھ خاموشیوں کو سڑک اور بازاروں کی طرف پھینک کر ایسی راتیں دل میں خوف پیدا کرتی ہیں، اندیشے جگاتی ہیں، سانس کی آواز بھی دہلا دیتی ہے، کچھ پھس پھساہٹ اور کچھ رُکی رُکی سانسوں کے اندر ہی رات لمبی ہوجاتی ہے۔

بھیڑ کی دوڑ اپنے اپنے گھر کی طرف... اندر ہی اندر ڈھیروں سوال.. کہاں ہوا ہے دھماکا، کتنے لوگوں کی موت ہوئی ہے، شہر میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں؟ سارے سوالات، ساری دلیلوں کا ایک ہی مطلب ہے، وہ مطلب اچانک طوفان پیدا کرسکتا ہے، رخسانہ تیز قدموں سے چلنے لگی، اسے جلدی سے جلدی گھر پہنچنا ہے۔

خوف اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ شام خوفناک سیاہ رات بن جائے، اسے پہنچنا ہوگا، وہ ٹیکسی بھی لے سکتی ہے!

"ٹیکسی، محبوب نگر چلنا ہے؟"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ ڈرائیور 40-35 کی عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی، سستے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ ذرا سا سکون محسوس ہوا، سڑک پر ویسی ہی بھگدڑ مچی تھی، کم سے کم اب وہ ذرا جلدی گھر پہنچ جائے گی۔

مہانگر میں رات نہیں ہوتی، پھر بھی کسی واردات کے اندیشے سے دوکانوں کے شٹر گرنے شروع ہوگئے تھے... اس شہر کی تاریخ میں ایسی ہی کتنی راتوں نے لوگوں کی زندگی بدل دی ہے، گھر اجڑ گیا، خاندان چھوٹ گیا، کام دھندا چوپٹ ہوگیا، محنت مزدوری چلی گئی، خواب بکھر گئے۔ جینے کی خواہش تو نہیں بلکہ کچھ لوگ صرف وقت گزارنے کی کوشش کرتے آئے ہیں، شہر کی لوکل ٹرینوں کی طرح، وہ لوگ روز ٹھیک وقت پر آتے ہیں، جاتے ہیں، پیٹھ پر لاد کر لے جاتے ہیں کچھ کھونے کا درد۔

ٹیکسی کے دونوں طرف بھیڑ، بے چین اور پریشان، اچانک ایک آدمی ہاتھ میں ڈنڈا لیے بھیڑ کو کھدیڑتا ہوا آگیا۔ رخسانہ چونک گئی۔ شہر میں دنگا شروع ہوگیا کیا؟ وہ آدمی ٹیکسی مالک کے قریب تھا۔ رخسانہ نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔ سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح کتنے لمحے بیت گئے۔ آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ آدمی ہوا میں کھو گیا کہیں، شاید تیز رفتار بھیڑ کے اندر۔

اچانک موبائل بجنے لگا۔ اس کی آواز بھی اسے چونکانے کے لیے کافی تھی۔ امی کا فون، اسے تھوڑی راحت ملی، ماں کی باتیں سن کر اسے یقین نہیں ہوا، جو تعویذ انھوں نے ضد کرکے پہنایا تھا، آج اسے نکال کر بیگ میں رکھنے کے لیے بڑے ہی خوف زدہ ڈھنگ سے بول رہی تھی، لیکن کیوں؟ تعویذ کیا اس کی حفاظت کے لیے نہیں ہے؟ نا، نا، تعویذ سے وہ پہچانی جائے گی۔ اس اپنے شہر میں آج رات کے لیے بے گانہ بن جانا ہی اچھا ہے۔ وہ صرف بھیڑ کا ایک حصہ ہے، اس کی اپنی کوئی خاص پہچان نہیں ہے، کوئی ماضی نہیں ہے، کوئی مذہب، کوئی گھر خاندان نہیں ہے، وہ اس بھیڑ میں ایک انجان ایک اجنبی ہے بس۔

تعویذ کو گلے سے نکال کر کچھ لمحے ہاتھ میں رکھنے کے بعد پھر اس نے بیگ میں رکھ دیا۔ تو کیا اس نے اپنی پہچان کو مٹا دیا؟ خوف شک میں بدل گیا اور اس نے رخسانہ کو اپنی آغوش میں لیا۔

بھیڑ کو چیرتی ہوئی ٹیکسی آگے بڑھ رہی تھی۔ رخسانہ یہ جان گئی کہ وہ ٹیکسی سے زیادہ دور تک نہیں جاپائے گی۔ اچانک کہیں پر یہ بھیڑ دیوار بن جائے گی اور اسے ٹیکسی کی پرواہ کیے بغیر اس دیوار میں سے راستہ نکالنا ہوگا۔

یہ شہر پھر کون جانے کتنے دنوں تک شک اور اندیشے کے گھیرے میں رہے گا؟ پھر کتنے دنوں تک لوگ گھر سے باہر نکلنے سے ڈریں گے؟ دنیا میں کہیں بھی کچھ ہوتا ہے تو پہلے اس کے شہر میں بے اعتمادی کا دھواں بھر جاتا ہے۔ برسوں سے ساتھ رہنے والے پڑوسی رہ چکے لوگ منھ پھیر لیتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا ہے لیکن دوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔

ٹیکسی کے ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی۔ رخسانہ آگے کی طرف پھسلی، پھر سنبھل گئی۔ کچھ لوگ ان کے سامنے سے دوڑتے بھاگتے چلے گئے۔ ڈرائیور دل ہی دل میں ناراضگی میں کچھ بڑبڑایا۔

"آج سارے لوگ جلدی میں ہیں، ہوا کیا ہے، دیدی؟"

ٹیکسی ڈرائیور کے اس معصوم سوال نے رخسانہ کو جیسے لمحے بھر کے لیے خاموش کردیا۔ اسے اب تک خبر بھی نہیں ہے کہ شہر میں کیا ہوا ہے؟

سچ میں ڈرائیور کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ اس نے کہا "تب تو زیادہ دور تک آپ کو لے جانا ممکن نہیں ہے۔"

زیادہ دور تک وہ ٹیکسی میں جا نہیں سکے گی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا اس لیے ڈرائیور کی بات پر اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔

ٹیکسی اب موڑ مڑتی ہوئی ایک اندھیری تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ چہرے سے وہ آدمی جانا پہچانا سا لگتا تھا، پھر بھی وہ ایسے راستے کی طرف کیوں آیا؟

"ہوسکتا ہے ہم ادھر سے گھنٹہ گھر تک پہنچ جائیں"

ڈرائیور بھی دل کی بات پڑھتا ہوا بولا۔ چاروں طرف دیکھتا ہوا وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ کے دونوں طرف کے شیشے اوپر اٹھانے کے لیے رخسانہ سے کہا۔

اچانک کچھ ہی دوری پر آگ کا گولہ دکھائی دیا۔ ٹیکسی روک کر ڈرائیور نے لائٹ بجھا دی۔ ایک طرف گاڑی کو اندھیرے میں ہی گم ہوجانے دیا۔ گاڑی اور گاڑی کے اندر جیسے کوئی ہو ہی نہیں۔ کچھ لوگ قریب سے بھاگ دوڑ کے چلے گئے۔ لمحے بھر کے بعد سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔

ڈرائیور تیز رفتار سے گاڑی چلانے لگا جیسے اس کے اوپر کوئی ذمہ داری لاد دی گئی ہو اور اسے وہ بخوبی نبھانے چلا ہو۔ گھنٹہ گھر اب نزدیک تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اب مین روڈ پر ہی گاڑی روک دی۔ رخسانہ کے اترنے سے پہلے کچھ لوگ گاڑی کے اوپر جیسے کود پڑے۔ انھیں قدم رسول تک جانا ہے۔ ڈرائیور نے پختہ لہجے میں منع کردیا۔ وہ لوگ چلے گئے۔ سامنے لوگوں کا ہجوم...

رخسانہ ڈرائیور سے ناراض ہوئی "ایسے وقت پر لوگوں کی مدد کرنی چاہیے، مشکل میں پھنسے لوگوں کو منع کرتے ہیں!"

"ادھر خطرہ ہے۔" بہت ہی ٹھنڈے لہجے میں ڈرائیور بولا۔ اس کی آواز میں موت کی سی سرد مہری تھی۔ اچانک رخسانہ نے غور کیا کہ ڈرائیور کے گلے میں درگا ماں کا ایک لاکٹ ہے۔

اب تک وہ جسے مسلمان سمجھتی آئی تھی، وہ ہندو ہے اور اسی کی طرح دہشت زدہ ہے۔

اس شہر میں ہندو مسلمان کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس ایک ہی سچائی ہے۔ سب کے سب انسان ہیں اور سب ڈرے ہوئے ہیں۔ صرف مایوس لوگوں کا شہر۔ محنتی اور معصوم، عام لوگوں کے لیے تو زندہ رہنا ہی ایک ایمان ہے۔ وہ چھوٹا یا بڑا نہیں سمجھتا، بھید بھاؤ نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو شہر نے دہشت دی ہے۔

پھر رخسانہ بھیڑ میں کھوگئی۔ گھر پہنچ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کردے گی۔ اپنی ماں کے دوپٹے میں اپنے آپ کو چھپالے گی۔ اپنے سب سے بھروسے والی پناہ گاہ میں۔

وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شہر کبھی تھکتا نہیں ہے لیکن آج جیسا اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ گھبرائے ہوئے چہرے، کالے بادل سی گہری آنکھیں، پریشانی میں ڈوبے سر، سب کے سب خاموش ...

اتنے بڑے ہجوم کو کسی نے شاید جادوٹونے سے چپ کرادیا ہو۔ چاروں طرف اپنی تیز نظروں سے دیکھتی رخسانہ آگے بڑھ رہی تھی۔ براوقت کب آجائے، کون کہہ سکتا ہے؟

سائرن بجاتی ہوئی دو ایمبولینس انھیں اچانک پار کرگئیں۔ ایسے حالات میں ایمبولینس یا دمکل کی آوازیں عام ہوجاتی ہیں اور دہشت پھیلاتی ہیں۔ بڑی ہی دردناک اور ڈراؤنی لگتی ہیں۔ سائرن کی آواز، بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک ہلکے سے شوروغل نے خاموشی کی جگہ لے لی۔

کسی نے کہا ''دوسو کی موتیں ہوئی ہیں۔''

رخسانہ کے قدم تیز ہوگئے، بارود نے آگ پکڑلی، کبھی بھی دھماکہ ہوسکتا ہے۔ اس شہر میں ڈھیروں لوگ ہیں اور دکھ بھی، چاہے دھماکہ ہو یا دنگا، کچھ مرجاتے ہیں تو حساب میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جو کسی کو کھودیتا ہے، صرف وہی زندگی بھر غم اٹھاتا ہے، دوسرے بھول جاتے ہیں، زندگی کو سمیٹ لیتے ہیں، ڈر کا کوئی دوسرا لمحہ آنے تک ...

سامنے چرچ ہے، وہیں سے وہ مین روڈ چھوڑ کر اندر مڑے گی۔ اب اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ امی کو فون سے خبر کردیں کیا؟ لیکن موبائل کام نہیں کررہا ہے، ایسے دنوں میں رشتے کتنی دور نکل جاتے ہیں؟ سب کچھ قریب ہونے پر دور لگتا ہے، دور، بہت دور ...

رخسانہ مڑگئی۔ پیچھے ہجوم کے ساتھ آہستہ آہستہ شور بڑھ رہا ہے۔ رخسانہ تیز قدموں سے چلنے لگی۔ گلی کے ایک سرے پر ایک پولس کی گاڑی اور دو کانسٹبل۔ وہ اسی طرح چپ چاپ چلتی رہی، اسے جلدی گھر پہنچنا ہوگا۔

گلی سے گلی.. موڑ پر موڑ... رخسانہ چل رہی تھی، پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ۔

دھیرے مگر نمایاں ... ضرور کوئی آرہا ہے، چاروں جانب اندھیرا، سنسان سڑک، بڑی بڑی عمارتوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہوچکے ہیں۔ یہ قدم ضرور اس کا پیچھا کررہے ہیں، جس خطرے سے وہ اب تک خود کو بچاتی آئی ہے، کیا وہ اتنے قریب ہے؟ وہ تو اس علاقے سے واقف ہے۔ کسی ظالم، بے رحم دہشت پھیلانے والے کے لیے کیا وہ خود کو قربان کردے گی؟

رخسانہ خوف سے کانپنے لگی، اس کی سانس رکنے لگی، پاؤں میں جان نہیں رہی۔

اتنے قریب پھر اتنی دور۔ اس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ایک لڑکی ہے... عمر میں اس سے کچھ چھوٹی ہوگی۔ دبے پیر آکر وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔

''مجھے گرانڈ روڈ تک جانا ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے!'' وہ خوف بھری آواز میں بول رہی تھی۔

''کیا تم مسلمان ہو؟''

''نہیں، میں ہندو ہوں''

شہر کے سارے لوگ آج خوف زدہ ہیں، زندگی ہے اس لیے موت سے ڈر لگتا ہے۔ موت قریب آسکتی ہے، اس لیے زندگی کا ڈر رہتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں کو انسانوں سے ڈر ہے۔ عقیدت، اعتماد اور محبت کی غیر موجودگی میں صرف خوف ہی خوف۔ رخسانہ سوچنے لگی کہ وہ کس سے ڈر رہی تھی؟ ایک جانی پہچانی قربت سے؟... اندھیرے سے؟... وہ ساتھ ساتھ چلنے لگیں، دوسری طرف موت کی سی خاموشی تھی۔ خاموشی ہی سوال ہے، خاموشی ہی جواب ہے، خاموشی ہی صداقت اور حسن ہے۔ خاموشی میں ہی وہ دونوں اپنے اپنے وجود کو محسوس کرنے لگی۔

دل روشن ہوا تھا، رخسانہ نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑلیا، وہ دونوں اسی طرح آگے کی جانب چلنے لگیں، رکنے پر ڈر لگتا ہے، آگے بڑھنے پر ڈر کہاں؟

• اڑیا افسانہ نگار دیوپرساد داس کی پیدائش 1966 میں بھونیشور میں ہوئی۔ چار افسانوں کے مجموعے اور مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

ماخذ: چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیاں: مصنفہ: دیوپرساد داس، مترجمہ: شائستہ فاخری، اشاعت: 2011، ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95

◘

Shaesta Fakhri,C-9, Radio Colony,
Auckland Road, Allahabad- 211001

3/21/2018 P68.jpg (1580×2200)

ہندوستانی سینما: جسے اردو نے بولنا سکھایا!

نصرت ظہیر

ہندوستانی سنیما، جس کی مادری زبان اردو ہے، اپنے وجود کے سو سال پورے کررہا ہے۔ کہنے کو کچھ حلقے اسے 'ہندی سنیما' کہنے پر اصرار کرتے ہیں، لیکن ہے یہ دراصل ہنوستانی سنیما، جس میں علاقائی، مذہبی یا تہذیبی وابستگی کو تو ضرور جگہ ملی مگر کسی طرح کا تعصب کبھی اپنی جڑیں نہیں جما سکا۔ اردو مشترکہ تہذیب کی علامت ہی نہیں، اس کی پروردہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سنیما آج بھی اسے دل سے لگائے ہوئے ہیں۔ زیرنظر مضمون کے ساتھ ہم 'ہندوستانی سنیما اور اردو' کے تعلق سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کررہے ہیں جس میں ہندوستانی سنیما کے مختلف شعبوں میں اردو زبان و ادب کے عمل دخل کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے گا۔ (ادارہ)

جدید ہندوستان کو قوم، ملک اور تہذیب کے طور پر ایک وحدت کی شکل دینے میں تین چیزوں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اردو زبان، ہندوستانی ریلوے اور ہندوستانی سنیما۔

اردو زبان نے ملک کے عوام کو رابطے اور ترسیل کا وسیع ترین وسیلہ عطا کیا اور انھیں لسانی و سماجی سطح پر ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔

ریلوے کے ملک گیر نظام نے، جسے انگریز نو آبادکاروں نے اس ملک کی دولت کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوٹنے کھسوٹنے کے لیے وسعت دی تھی، آزاد ہندوستان کی حکومت اور عوام کو انتظامی، اقتصادی اور سماجی طور ایک لڑی میں پرویا۔

اسی طرح فلم کے میڈیم نے، ملک و قوم کو جذباتی، سماجی اور شعوری بیداری کے ساتھ ساتھ تہذیبی و ثقافتی اختلاط اور عالمی بصیرت کے مواقع اور وسائل فراہم کر کے نہ صرف اس ملک کے اتحاد کی ایک اور جہت کو روشن کیا بلکہ ہندوستان کو عالمی تناظر میں ابھارنے کے راستے بھی دکھائے۔ اس کے علاوہ قومیت کے اُس جذبے کو جسے انگریزوں نے 1857 کی پہلی ہندوستانی جنگِ آزادی کی سخت ظالمانہ و جابرانہ بیخ کنی کے ذریعے بڑی حد تک دبا دیا تھا، پھر سے ابھارنے میں بھی ہندوستانی سنیما نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں سنیما کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی اس کی عالمی تاریخ ہے۔ فرق صرف سات مہینوں کا ہے۔ فرانس کے لومیئر بھائیوں نے چلتی پھرتی تصویروں یعنی سنیماٹوگرافی کی پہلی عوامی نمائش 28 دسمبر 1895 کو کی تھی۔ سات ماہ بعد 7 جولائی 1896 کو انھوں نے ممبئی کے ایک ہوٹل میں پردے پر اس سنیما شو کو دوہرایا۔ پردے پر انسانی تصویروں اور مشینوں کو حرکت کرتے اور ریل گاڑی کو اسٹیشن پر آکر رکتے دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ تب یہ فلمیں خاموش تھیں لیکن، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ متحرک تصویر کشی کی تکنیک جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل گئی اور دنیا کے متعدد ملکوں میں تقریباً ایک ساتھ یا کچھ آگے پیچھے، سنیماٹوگرافی کا دور شروع ہوگیا۔

ہندوستان میں، کچھ تو آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ اس بنا پر کہ یہاں اسٹیج اور پرفارمنگ آرٹ کے شو اس طرح ڈیولپ اور مقبول نہیں ہوئے جس طرح یوروپ اور مغربی دنیا کے دوسرے خطوں میں ہوئے تھے، عوامی تفریح Mass Entertainment کے مواقع کم ہونے کے نتیجے مں سنیما نے بڑی جلدی ترقی کرلی اور پورا ملک کم خرچ تفریح کے اس میڈیم کی گرفت میں آ گیا۔

ممبئی میں لومیئر بھائیوں کے شو کے دو سال بعد بنگال کے ایک وکیل کے فوٹوگرافر بیٹے، ہیرالال سین نے کلکتہ کے اسٹار تھیٹر میں اسٹیج ہونے والے شو 'دی فلاور آف پرشیا' کو فلما کر ایک مختصر فلم اسی نام سے بنائی، جسے ہندوستان میں بنائی گئی پہلی فلم ماننا چاہیے۔ یہ فلم انھوں نے اپنے ایک دوست پروفیسر اسٹیوینسن سے مستعار لیے ہوئے مووی کیمرے پر شوٹ کی تھی۔ بعد کے برسوں میں 1904 تک ہیرالال سین نے اسی طرز پر، اسٹیج ڈراموں کی سیدھی شوٹنگ پر مشتمل کچھ اور فلمیں بنائیں، مثلاً بھرمر، ہری راج اور بدھ دیو۔ 1903 میں انھوں نے اپنی سب سے طویل فلم 'علی بابا اینڈ فورٹی تھیوز' بنائی۔ یہ بھی اسٹیج شو کو شوٹ کر کے بنائی گئی تھی۔ انھوں نے کئی نیوز فلمیں، اشتہاری فلمیں، اور برٹش حکومت کے کہنے پر کچھ دستاویزی فلمیں بھی بنائیں۔ لیکن افسوس، 1917 میں آگ کے ایک حادثے میں ان کی بنائی ہوئی فلموں کے سارے پرنٹ جل گئے، جنھیں وہ لندن سے درامد کیے گئے 'بائیسکوپ' پر دکھاتے تھے۔ شوٹنگ کے بعد ان کی فلموں کے نیگیٹو بھی لندن سے ہی پراسیس ہوکر آتے تھے۔

پہلی ہندوستانی فلم یا 'مووی' رام چندر گوپال دادا صاحب تورنے، نے 'شری پنڈلیک' کے نام سے بنائی جو 12 مئی 1912 میں 'کورونیشن سنیما ٹوگراف' میں ریلیز ہوئی۔ اسے بھی لندن میں پراسیس کرایا گیا تھا۔ اسی سال، ڈھنڈی راج گوبند دادا صاحب پھالکے، جنھوں نے اپنا کیریئر گودھرا گجرات میں معمولی سے فوٹوگرافر کے طور پر شروع کیا تھا اور طاعون میں بیوی کی موت کے بعد ممبئی آگئے تھے، اپنی پہلی فیچر فلم راجہ ہریش چندر کی شوٹنگ میں

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P68.jpg 1/1

3/21/2018 P69.jpg (1599×2200)

مصروف تھے۔ اس فلم کی پہلی عام نمائش 3 مئی 1913 کو ممبئی کے کورونیشن سنیما میں ہوئی اور اسی فلم نے دادا صاحب پھالکے کو 'فادر آف انڈین سنیما' بنا دیا۔ بظاہر یہ اعزاز دادا صاحب تورنے کو دیا جانا چاہیے تھا جن کی بنائی ہوئی فلم ایک سال پہلے سنیما کے پردے پر آئی تھی، لیکن ایک تو ان کی فلم صرف 1500 فٹ کی تھی یعنی پھالکے کی فلم سے 1200 فٹ کم۔ دوسرے اس کا دورانیہ بھی صرف 22 منٹ کا تھا جب کہ پھالکے کی فلم تقریباً چالیس منٹ طویل تھی۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس فلم کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والا کیمرا اور دیگر آلات میں سے بیش تر ہندوستان میں تیار ہوئے تھے اور یہیں فلم کے نیگیٹو دھلوائے گئے تھے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس فلم کو فلم سازی کی مروجہ روایات کے مطابق منظّم انداز میں بنا یا گیا تھا۔ اس طرح یہ دراصل ہندوستانی فلم انڈسٹری کی بنیاد رکھنے والی فلم تھی، جسے سچ مچ کی صنعت کا درجہ بہت بعد، بیسویں صدی کے اواخر میں حاصل ہوا۔ اس خاموش فلم کے ہدایت کار اور کیمرہ مین دادا صاحب پھالکے خود تھے۔ اس کے علاوہ اسکرین پلے بھی انھوں نے خود لکھا تھا۔ اس میں باقاعدہ اداکاروں کی خدمات حاصل کر کے ایکٹنگ کرائی گئی تھی اور اپنے بنائے ہوئے سیٹ پر فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ یعنی یہ کسی اسٹیج پرفارمنس کو شوٹ کر کے نہیں بنائی تھی۔

بعد میں پھالکے نے پانچ تاجروں کی شراکت سے ایک فلم کمپنی 'ہندوستان فلمز' کے نام پر بنائی، باقاعدہ ایک اسٹوڈیو کھڑا کیا، تربیت دے کر ٹیکنیشین، اور اداکار تیار کئے، جس کے بعد کمپنی کی بنائی ہوئی فلموں نے پورے ملک میں دھوم مچادی۔ تاہم پھالکے تخلیقی مزاج رکھتے تھے اور بزنس کی انھیں بہت زیادہ سمجھ نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں شراکت داروں سے ان کی ان بن رہنے لگی۔ بیچ میں کمپنی سے مستعفی ہوکر وہ الگ بھی ہوگئے اور ڈرامے لکھنے لگے۔ لیکن تاجروں نے کسی طرح انھیں منالیا۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ اور فلمیں بنائیں، مگر بے دلی کے ساتھ۔ کل ملا کر انھوں نے 19 سال کے فلم کیریئر میں 95 بڑی فلمیں اور 26 مختصر فلمیں بنائیں۔ موہنی بھسماسر، ستیہ وان ساوتری، لنکا دہن اور شری کرشن جنم ان کی اہم فلمیں ہیں۔ 38-1936 میں انھوں نے آخری فلم 'گنگا اوترن' بنائی۔ مگر تب تک بولتی فلموں کا زمانہ آچکا تھا۔ خاموش فلموں میں لوگوں کی دل چسپی ختم ہوگئی۔ پھالکے اس نئی تکنیک سے تال میل بٹھانے میں کامیاب نہیں ہوئے اور بالآخر فلموں سے سنیاس لے کر ناسک چلے گئے جہاں 16 فروری 1944 کو 74 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ابھی تک فلم یا مووی صرف متحرک فلموں کا نام تھا۔ اور وہ بھی سیاہ وسفید پرچھائیوں والی فلمیں۔ آواز اور رنگ کا میل ابھی نہیں ہوا تھا۔ آواز کی کمی کو فلم کی کہانی کو جوڑنے والے اناؤنسروں کی کمنٹری اور اسکرین کے پیچھے بٹھائے گئے سازندوں کے ذریعے پر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بعد میں جب فونوگرافی یا گراموفون ریکارڈ کی تکنیک کو فروغ ملا تو فلم کے مکالموں اور دوسری آوازوں کے ریکارڈ بنائے جانے لگے۔ لیکن گراموفون ریکارڈ اور فلم پروجیکٹر کی رفتار میں ہم آہنگی کا کوئی نظام نہ ہونے کی وجہ سے مضحکہ خیز حالات پیدا ہوجاتے تھے۔ پردے پر گولی چلنے کا دھماکہ کبھی گولی کے چلنے سے پہلے ہوجاتا اور کبھی بعد میں۔ تھپڑ مارا جاتا تو تڑاخ کی آواز بھی پہلے یا بعد میں سنائی دیتی اور کہانی کو سمجھنے میں بھی الجھنیں آجاتیں۔ آخر اس کا حل کھوج لیا گیا۔ ساؤنڈ آن ڈسک، یعنی آواز کو گراموفون ریکارڈ پر رکھنے کی بجائے اسے فلم کے فیتے پر ہی چڑھانے کی تکنیک وضع کرلی گئی جسے 'ساؤنڈ آن فلم' کہا جاتا ہے اور یہی تکنیک کئی اضافوں کے ساتھ آج بھی رائج ہے۔ اس تکنیک نے فلم اور آواز کو 'ہم رفتار' کر دیا۔ اپریل 1923 کو نیویارک سٹی میں اس تکنیک سے پہلی بولتی فلم کی نمائش ہوئی۔

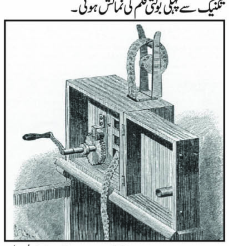

ہندوستان میں اس تکنیک سے بننے والی پہلی بولتی فلم، ایک کامیاب تاجر اور فلم ساز خان بہادر اردیشر ایرانی کی 'عالم آرا' تھی جس نے تہلکہ مچادیا۔ یہ فلم 14 مارچ 1931 کو ممبئی کے میجسٹک سنیما میں ریلیز ہوئی۔ جوزف ڈیوڈ کے تحریر کردہ پارسی ڈرامے کی کہانی پر بنائی گئی اس فلم کے شو جب شروع ہوئے تو شائقین کی بھیڑ کو قابو میں کرنے کے لیے پولیس کا بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ اس فلم کے ساتھ فلمی موسیقی کی بھی ابتدا ہوئی اور اس میں وزیر محمد خاں کا گایا ہوا گانا، ''دے دے خدا کے نام پے پیارے طاقت ہے گر دینے کی'' ہندوستانی فلم انڈسٹری کا پہلا ایسا گانا تھا جسے ہم فلمی گانا کہہ سکتے ہیں۔ یوں اردو شاعری نے پہلی بار فلم کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے موسیقار فیروز شاہ ایم مستری اور بی اردیشر تھے۔ فلم میں سات گانے تھے اور ساتوں اردو میں تھے:

- دے دے خدا کے نام پے پیارے طاقت ہے گر دینے کی
- بدلا دلوائے گا یارب
- روٹھا ہے آسمان گم ہوگیا مہتاب
- تیری قاتل نگاہوں نے مارا
- دے دل کو آرام، اے ساقی گلفام
- بھر بھر کے جام پلا جا ساغر کے چلانے والے
- درس بنا میرے ترسے ہیں نینا پیارے

ہندوستان کی اس پہلی بولتی فلم کے تمام مکالمے اردو میں تھے، اور تبھی سے اردو، ہندوستانی سنیما کی مادری زبان بن گئی۔ فلم کا سب سے مشہور گانا وہی تھا، ''دے دے خدا کے نام پے ...'' وزیر احمد خاں نے یہ گانا کسی اسٹوڈیو میں نہیں بلکہ فلم کے سیٹ پر گایا تھا اور وہیں چھپے ہوئے مائکروفون سے اس کی ریکارڈنگ ہوئی۔ ایک بڑا ہی دل چسپ اتفاق، ہندوستانی سنیما کے اس پہلے فلم گلوکار کی زندگی کے ساتھ یہ ہے کہ 'عالم آرا' تین بار بنائی گئی، 1931، 1956 اور 1973 میں۔ تینوں فلموں میں یہ گانا ایک فقیر گنگناتا ہے اور تینوں میں فقیر کا کردار وزیر محمد خاں نے ادا کیا تھا۔ پہلی بار جب وہ 29 برس کے تھے، دوسری بار جب ان کی عمر 44 برس تھی اور تیسری مرتبہ تب جب وہ 71 برس کے ہوچکے تھے۔ تینوں میں آواز بھی ان ہی کی تھی لیکن تیسری 'عالم آرا' میں یہ صرف گنگنایا گیا ہے۔ ریکارڈ پہلی والی دو فلموں کے ہی بنے جو آج دستیاب نہیں ہیں۔ یعنی ہندوستانی سنیما کا یہ پہلا گانا آج کسی بھی شکل میں موجود نہیں ہے۔ 'عالم آرا' کا اصلی پرنٹ یوں تو پونا میں ہندوستانی فلموں کی سب سے بڑی آرکائیوز میں محفوظ تھا لیکن 2003 کی آگ میں پہلی ہندوستانی فلم 'راجہ ہریش چندر' اور چھوت چھات جیسے اہم ترین مسئلے پر بننے والی پہلی سوشل فلم 'اچھوت کنیا' جیسی فلموں کے ساتھ 'عالم آرا' کا پرنٹ بھی جل کر راکھ ہوگیا!

اردو والوں کے لیے یہ ایک نقصان عظیم ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ 'عالم آرا' برصغیر ہند کی پہلی بولتی فلم ہی نہیں بلکہ اردو کی بھی پہلی فلم تھی۔

ہندوستان کی پہلی ٹاکی فلم جو اردو بولتی تھی!

nusratzaheer@gmail.com

■

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P69.jpg 1/1

3/21/2018 P70.jpg (3401×2401)

■ شمس الاسلام فاروقی

انسانی جسم کے قدرتی معجزے

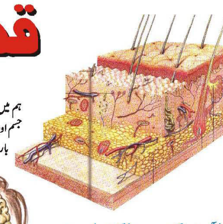

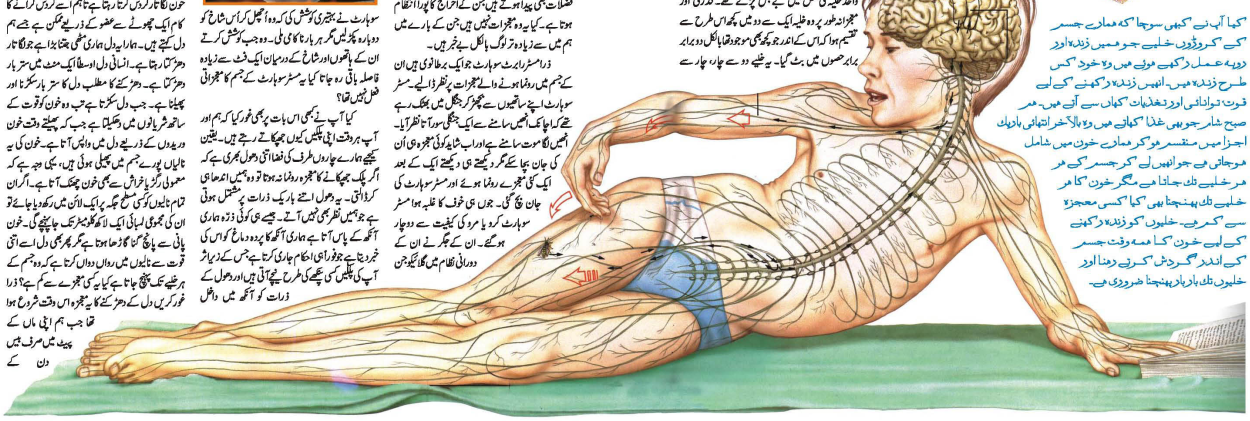

ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنے وجود، اپنے جسم اور جسم میں پوشیدہ غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں کبھی کچھ سوچتے ہیں۔

> کیا آپ نے کبھی سوچا کہ ہمارے جسم کے کروڑوں خلیے جو ہمیں زندہ اور روبہ عمل رکھے ہوئے ہیں وہ خود کس طرح زندہ ہیں۔ انہیں زندہ رکھنے کے لیے قوت، توانائی اور تغذیات کہاں سے آتے ہیں۔ ہم صبح شام جو بھی غذا کھاتے ہیں وہ بالآخر انتہائی باریک اجزا میں منقسم ہو کر ہمارے خون میں شامل ہو جاتی ہے جو انہیں لے کر جسم کے ہر ہر خلیے تک جاتا ہے مگر خون کا ہر خلیے تک پہنچنا بھی کیا کسی معجزہ سے کم ہے۔ خلیوں کو زندہ رکھنے کے لیے خون کا ہمہ وقت جسم کے اندر گردش کرتے رہنا اور خلیوں تک بار بار پہنچنا ضروری ہے۔

ذرا غور کیجیے ہم میں سے کتنے لوگوں کو اپنے متناسب اور خوبصورت جسم پر انتہائی ناز اور مضبوط ہاتھوں پیروں پر بے حد غرور اور گھمنڈ نہیں ہوتا، مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوئے ہیں کہ اُن پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ اپنی ماں کے رحم میں محض ایک واحد خلیہ کی شکل میں بے بس پڑے تھے۔ قدرتی اور معجزانہ طور پر وہ خلیہ ایک سے دو میں کچھ اس طرح سے تقسیم ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ بھی موجود تھا بالکل دو برابر برابر حصوں میں بٹ گیا۔ یہ خلیے دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ میں تقسیم ہوتے رہے۔ تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک جیسے خلیوں کا ایک گچھا بن گیا۔ پھر ایک دوسرا معجزہ رونما ہوا اور خلیوں میں تفریق شروع ہو گئی۔ طرح طرح کے خلیے بننے لگے اور ہر قسم کے خلیوں نے جسم کے مختلف حصوں کو تشکیل دینا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم ایک ننھے سے بچے کی شکل اختیار کر گئے۔ ماں کے پیٹ ہی میں معجزانہ طریقے سے ہماری غذا کا انتظام ہوا پھر معجزانہ انداز ہی سے ہم عالم وجود میں آ گئے۔ پہلے ماں کا دودھ پھر باہری غذائیں معجزانہ طریقوں سے ہماری جزوِ بدن بنتی رہیں اور ہم بڑے ہوتے گئے۔ بڑھنے کا یہ سلسلہ بھی لگاتار جاری نہ رہا بلکہ ایک مقام پر پہنچ کر رک گیا۔ اب اگر ہم مشاہدہ کر پائیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ ہمارے جسم میں موجود کروڑوں خلیے ہمہ وقت مصروف کار ہیں۔ وہ کھاتے پیتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے اندر بے شمار قسم کے کیمیائی تعملات ہوتے رہتے ہیں جن کے نتیجے میں ایسی اشیا پیدا ہوتی ہیں جو ہمیں قوت دیتی ہیں اور جن سے ہم نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اُن کی وجہ سے رو بہ عمل بھی ہیں۔ ہر خلیے میں تعملات کے نتیجے میں کچھ فضلات بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے اخراج کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ کیا یہ وہ معجزات نہیں ہیں جن کے بارے میں ہم میں سے زیادہ تر لوگ بالکل بے خبر ہیں۔

ذرا مسٹر رابرٹ سوہارٹ جو ایک برطانوی ہیں ان کے جسم میں رونما ہونے والے معجزات پر نظر ڈالیے۔ مسٹر سوہارٹ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر جنگل میں بھٹک رہے تھے کہ اچانک انھیں سامنے سے ایک جنگلی سور آتا نظر آیا۔ انھیں لگا موت سامنے ہے اور اب شاید کوئی معجزہ ہی اُن کی جان بچا سکے مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے بعد ایک کئی معجزے رونما ہوئے اور مسٹر سوہارٹ کی جان بچ گئی۔ جوں ہی خوف کا غلبہ ہوا مسٹر سوہارٹ کرو یا مرو کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ ان کے جگر نے ان کے دورانی نظام میں گلائیکوجن داخل کر دی جو فوراً ہی شکر میں تبدیل ہو گئی۔ مسٹر سوہارٹ کا تنفس تیز ہو گیا جس سے ان کے خون میں زیادہ مقدار میں آکسیجن شامل ہونے لگی اور شکر سے توانائی میں اضافہ ہونے لگا۔ گردوں کے اوپری حصوں میں موجود غدودوں سے ایڈری نیلن کا اخراج ہوا جس نے گلائیکوجن کے استعمال کو بڑھاوا دیا۔ دل نے تیزی سے کام کر کے زیادہ مقدار میں عضلات کو خون فراہم کیا جس سے توانائی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد مسٹر سوہارٹ بہت تیز رفتاری سے دوڑے اور انھوں نے اُچھل کر درخت کی ایک اونچی شاخ پکڑ لی۔ زور لگا کر انھوں نے خود کو اوپر کھینچا اور جلد ہی ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے ساتھیوں نے وہاں پہنچ کر جنگلی سور کو بھگا دیا اور مسٹر سوہارٹ بحفاظت نیچے اتر آئے۔ بعد میں مسٹر

سوہارٹ نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اُچھل کر اُس شاخ کو دوبارہ پکڑ لیں مگر ہر بار ناکامی ملی۔ وہ جب کوشش کرتے ان کے ہاتھوں اور شاخ کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ فاصلہ باقی رہ جاتا کیا یہ مسٹر سوہارٹ کے جسم کا معجزاتی فعل نہیں تھا؟

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ ہم اور آپ ہر وقت اپنی پلکیں کیوں جھپکاتے رہتے ہیں۔ یقین کیجیے ہمارے چاروں طرف کی فضا اتنی دھول بھری ہے کہ اگر پلک جھپکانے کا معجزہ رونما نہ ہوتا تو وہ ہمیں اندھا ہی کر ڈالتی۔ یہ دھول اتنے باریک ذرات پر مشتمل ہوتی ہے جو ہمیں نظر بھی نہیں آتے۔ جیسے ہی کوئی ذرہ ہماری آنکھ کے پاس آتا ہے ہماری آنکھ کا پردہ دماغ کو اس کی خبر دیتا ہے جو فوراً ہی احکام جاری کرتا ہے جس کے زیر اثر آپ کی پلکیں کسی پنکھے کی طرح نیچے آتی ہیں اور دھول کے ذرات کو آنکھ میں داخل ہونے سے روک دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پپوٹا کسی غلاف کی طرح آنکھ پر چھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کچھ ذرات اپنی راہ بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آنکھ کے کناروں پر موجود غدود فوراً ہی آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر کے انھیں بہا دیتے ہیں۔ یہ وہ معجزے ہیں جو ہمارے، آپ کے اور دیگر جانوروں کے ساتھ ہر وقت پیش آ رہے ہیں مگر ہم انھیں نہ تو غیر معمولی تصور کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی سوچا کہ ہمارے جسم کے کروڑوں خلیے جو ہمیں زندہ اور روبہ عمل رکھے ہوئے ہیں وہ خود کس طرح زندہ ہیں۔ انھیں زندہ رکھنے کے لیے قوت، توانائی اور تغذیات کہاں سے آتے ہیں۔ ہم صبح شام جو بھی غذا کھاتے ہیں وہ بالآخر انتہائی باریک اجزا میں منقسم ہو کر ہمارے خون میں شامل ہو جاتی ہے جو انھیں لے کر جسم کے ہر ہر خلیے تک جاتا ہے مگر خون کا ہر خلیے تک پہنچنا بھی کیا کسی معجزہ سے کم ہے۔ خلیوں کو زندہ رکھنے کے لیے خون کا ہمہ وقت جسم کے اندر گردش کرتے رہنا اور خلیوں تک بار بار پہنچنا ضروری ہے۔ جسم کے اندر خون کی نالیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن کے ذریعے خون لگاتار گردش کرتا رہتا ہے تاہم اسے گردش کرانے کا کام ایک چھوٹے سے عضو کے ذریعے ممکن ہے جسے ہم دل کہتے ہیں۔ ہمارا یہ دل ہماری مٹھی جتنا بڑا ہے جو لگاتار دھڑکتا رہتا ہے۔ انسانی دل اوسطاً ایک منٹ میں ستر بار دھڑکتا ہے۔ دھڑکنے کا مطلب دل کا ستر بار سکڑنا اور پھیلنا ہے۔ جب دل سکڑتا ہے تب وہ خون کو قوت کے ساتھ شریانوں میں دھکیلتا ہے جب کہ پھیلتے وقت خون وریدوں کے ذریعے دل میں واپس آتا ہے۔ خون کی یہ نالیاں پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ معمولی رگڑ یا خراش سے بھی خون چھلک آتا ہے۔ اگر ان تمام نالیوں کو کسی مسطح جگہ پر ایک لائن میں رکھ دیا جائے تو ان کی مجموعی لمبائی ایک لاکھ کلومیٹر تک جا پہنچے گی۔ خون پانی سے پانچ گنا گاڑھا ہوتا ہے مگر پھر بھی دل اسے اتنی قوت سے نالیوں میں رواں دواں کرتا ہے کہ وہ جسم کے ہر خلیے تک پہنچ جاتا ہے کیا یہ کسی معجزے سے کم ہے؟ ذرا غور کریں دل کے دھڑکنے کا یہ معجزہ اس وقت شروع ہوا تھا جب ہم اپنی ماں کے پیٹ میں صرف بیس دن کے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P70.jpg 1/1

3/21/2018 P71.jpg (3401×2401)

شمس الاسلام فاروقی

انسانی جسم کے قدرتی معجزے

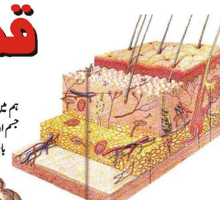

ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنے وجود، اپنے جسم اور جسم میں پوشیدہ غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں کبھی کچھ سوچتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی سوچا کہ ہمارے جسم کے کروڑوں خلیے جو ہمیں زندہ اور روبہ عمل رکھے ہوئے ہیں وہ خود کس طرح زندہ ہیں۔ انہیں زندہ رکھنے کے لیے قوت، توانائی اور تغذیات کہاں سے آتے ہیں۔ ہم صبح شام جو بھی غذا کھاتے ہیں وہ بالآخر انتہائی باریک اجزا میں منقسم ہو کر ہمارے خون میں شامل ہوجاتی ہے جو انہیں لے کر جسم کے ہر ہر خلیے تک جاتا ہے مگر خون کا ہر خلیے تک پہنچنا بھی کیا کسی معجزہ سے کم ہے۔ خلیوں کو زندہ رکھنے کے لیے خون کا ہمہ وقت جسم کے اندر گردش کرتے رہنا اور خلیوں تک بار بار پہنچنا ضروری ہے۔

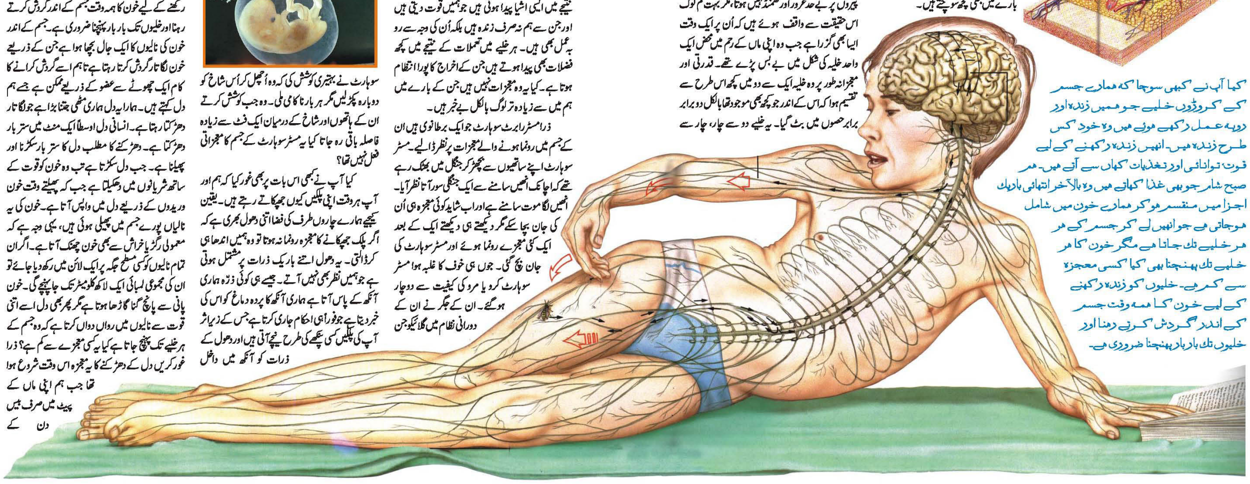

ذرا غور کیجیے ہم میں سے کتنے لوگوں کو اپنے متناسب اور خوبصورت جسم پر انتہائی ناز اور مضبوط ہاتھوں پیروں پر بے حد غرور اور گھمنڈ نہیں ہوتا، مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوئے ہیں کہ اُن پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ اپنی ماں کے رحم میں محض ایک واحد خلیہ کی شکل میں بے بس پڑے تھے۔ قدرتی اور معجزانہ طور پر وہ خلیہ ایک سے دو میں کچھ اس طرح سے تقسیم ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ بھی موجود تھا بالکل دو برابر برابر حصوں میں بٹ گیا۔ یہ خلیے دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ میں تقسیم ہوتے رہے۔ تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک جیسے خلیوں کا ایک گچھا بن گیا۔ پھر ایک دوسرا معجزہ رونما ہوا اور خلیوں میں تفریق شروع ہوگئی۔ طرح طرح کے خلیے بننے لگے اور ہر قسم کے خلیوں نے جسم کے مختلف حصوں کو تشکیل دینا شروع کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم ایک ننھے سے بچے کی شکل اختیار کرگئے۔ ماں کے پیٹ ہی میں معجزانہ طریقے سے ہماری غذا کا انتظام ہوا پھر معجزانہ انداز ہی سے ہم عالم وجود میں آگئے۔ پہلے ماں کا دودھ پھر باہری غذائیں معجزانہ طریقوں سے ہماری جزوِ بدن بنتی رہیں اور ہم بڑے ہوتے گئے۔ بڑھنے کا یہ سلسلہ بھی لگاتار جاری نہ رہا بلکہ ایک مقام پر پہنچ کر رک گیا۔ اب اگر ہم مشاہدہ کر پائیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ ہمارے جسم میں موجود کروڑوں خلیے ہمہ وقت مصروف کار ہیں۔ وہ کھاتے پیتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے اندر بے شمار قسم کے کیمیائی تعملات ہوتے رہتے ہیں جن کے نتیجے میں ایسی اشیا پیدا ہوتی ہیں جو ہمیں قوت دیتی ہیں اور جن سے ہم نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اُن کی وجہ سے رو بہ عمل بھی ہیں۔ ہر خلیے میں تعملات کے نتیجے میں کچھ فضلات بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے اخراج کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ کیا یہ وہ معجزات نہیں ہیں جن کے بارے میں ہم میں سے زیادہ تر لوگ بالکل بے خبر ہیں۔

ذرا مسٹر رابرٹ سوہارٹ جو ایک برطانوی ہیں ان کے جسم میں رونما ہونے والے معجزات پر نظر ڈالیے۔ مسٹر سوہارٹ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر جنگل میں بھٹک رہے تھے کہ اچانک انھیں سامنے سے ایک جنگلی سور آتا نظر آیا۔ انھیں لگا موت سامنے ہے اور اب شاید کوئی معجزہ ہی اُن کی جان بچا سکے مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے بعد ایک کئی معجزے رونما ہوئے اور مسٹر سوہارٹ کی جان بچ گئی۔ جوں ہی خوف کا غلبہ ہوا مسٹر سوہارٹ کرو یا مرو کی کیفیت سے دوچار ہوگئے۔ ان کے جگر نے ان کے دورانی نظام میں گلائیکوجن داخل کردی جو فوراً ہی شکر میں تبدیل ہوگئی۔ مسٹر سوہارٹ کا تنفس تیز ہوگیا جس سے ان کے خون میں زیادہ مقدار میں آکسیجن شامل ہونے لگی اور شکر سے توانائی میں اضافہ ہونے لگا۔ گردوں کے اوپری حصوں میں موجود غدودوں سے ایڈری نیلن کا اخراج ہوا جس نے گلائیکوجن کے استعمال کو بڑھاوا دیا۔ دل نے تیزی سے کام کر کے زیادہ مقدار میں عضلات کو خون فراہم کیا جس سے توانائی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ اس کے بعد مسٹر سوہارٹ بہت تیز رفتاری سے دوڑے اور انھوں نے اُچھل کر درخت کی ایک اونچی شاخ پکڑ لی۔ زور لگا کر انھوں نے خود کو اوپر کھینچا اور جلد ہی ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے ساتھیوں نے وہاں پہنچ کر جنگلی سور کو بھگا دیا اور مسٹر سوہارٹ بحفاظت نیچے اتر آئے۔ بعد میں مسٹر

سوہارٹ نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اُچھل کر اُس شاخ کو دوبارہ پکڑ لیں مگر ہر بار ناکامی ملی۔ وہ جب کوشش کرتے ان کے ہاتھوں اور شاخ کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ فاصلہ باقی رہ جاتا کیا یہ مسٹر سوہارٹ کے جسم کا معجزاتی فعل نہیں تھا؟

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ ہم اور آپ ہر وقت اپنی پلکیں کیوں جھپکاتے رہتے ہیں۔ یقین کیجیے ہمارے چاروں طرف کی فضا اتنی دھول بھری ہے کہ اگر پلک جھپکانے کا معجزہ رونما نہ ہوتا تو وہ ہمیں اندھا ہی کرڈالتی۔ یہ دھول اتنے باریک ذرات پر مشتمل ہوتی ہے جو ہمیں نظر بھی نہیں آتے۔ جیسے ہی کوئی ذرہ ہماری آنکھ کے پاس آتا ہے ہماری آنکھ کا پردہ دماغ کو اس کی خبر دیتا ہے جو فوراً ہی احکام جاری کرتا ہے جس کے زیر اثر آپ کی پلکیں کسی پنکھے کی طرح نیچے آتی ہیں اور دھول کے ذرات کو آنکھ میں داخل ہونے سے روک دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پپوٹا کسی غلاف کی طرح آنکھ پر چھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کچھ ذرات اپنی راہ بنا لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو آنکھ کے کناروں پر موجود غدود فوراً ہی آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر کے انھیں بہا دیتے ہیں۔ یہ وہ معجزے ہیں جو ہمارے، آپ کے اور دیگر جانوروں کے ساتھ ہر وقت پیش آرہے ہیں مگر ہم انھیں نہ تو غیر معمولی تصور کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی سوچا کہ ہمارے جسم کے کروڑوں خلیے جو ہمیں زندہ اور روبہ عمل رکھے ہوئے ہیں وہ خود کس طرح زندہ ہیں۔ انھیں زندہ رکھنے کے لیے قوت، توانائی اور تغذیات کہاں سے آتے ہیں۔ ہم صبح شام جو بھی غذا کھاتے ہیں وہ بالآخر انتہائی باریک اجزا میں منقسم ہو کر ہمارے خون میں شامل ہوجاتی ہے جو انھیں لے کر جسم کے ہر ہر خلیے تک جاتا ہے مگر خون کا ہر خلیے تک پہنچنا بھی کیا کسی معجزہ سے کم ہے۔ خلیوں کو زندہ رکھنے کے لیے خون کا ہمہ وقت جسم کے اندر گردش کرتے رہنا اور خلیوں تک بار بار پہنچنا ضروری ہے۔ جسم کے اندر خون کی نالیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن کے ذریعے خون لگاتار گردش کرتا رہتا ہے تاہم اسے گردش کرانے کا کام ایک چھوٹے سے عضو کے ذریعے ممکن ہے جسے ہم دل کہتے ہیں۔ ہمارا یہ دل ہماری مٹھی جتنا بڑا ہے جو لگاتار دھڑکتا رہتا ہے۔ انسانی دل اوسطاً ایک منٹ میں ستر بار دھڑکتا ہے۔ دھڑکنے کا مطلب دل کا ستر بار سکڑنا اور پھیلنا ہے۔ جب دل سکڑتا ہے تب وہ خون کو قوت کے ساتھ شریانوں میں دھکیلتا ہے جب کہ پھیلتے وقت خون وریدوں کے ذریعے دل میں واپس آتا ہے۔ خون کی یہ نالیاں پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ معمولی رگڑ یا خراش سے بھی خون چھنک آتا ہے۔ اگر ان تمام نالیوں کو کسی مسطح جگہ پر ایک لائن میں رکھ دیا جائے تو ان کی مجموعی لمبائی ایک لاکھ کلومیٹر تک جا پہنچے گی۔ خون پانی سے پانچ گنا گاڑھا ہوتا ہے مگر پھر بھی دل اسے اتنی قوت سے نالیوں میں رواں دواں کرتا ہے کہ وہ جسم کے ہر خلیے تک پہنچ جاتا ہے کیا یہ کسی معجزے سے کم ہے؟ ذرا غور کریں دل کے دھڑکنے کا یہ معجزہ اس وقت شروع ہوا تھا جب ہم اپنی ماں کے پیٹ میں صرف بیس دن کے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P71.jpg 1/1

3/21/2018 P72.jpg (1601×2391)

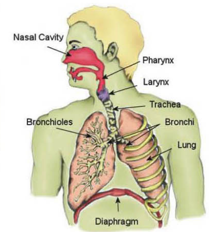

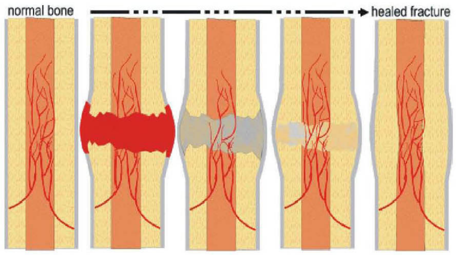

تھے۔ یہ معجزہ بنا رکے لگاتار جاری ہے اور ہماری آخری سانس تک جاری رہے گا۔ ماہرین کے اندازوں کے مطابق ہمارا یہ مٹھی برابر دل دن بھر میں کوئی آٹھ ٹن خون اپنے اندر سے گزارتا ہے۔ یہ چوبیس گھنٹوں میں ایک لاکھ آٹھ سو بار دھڑکتا ہے اور ہر روز پورے جسم کی 1000 گردشیں پوری کرتا ہے۔ ماہرین کے بموجب ستر سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یہ چھوٹا سا دل ڈھائی بلین بار دھڑکتا ہے جس کے دوران اندازاً 152 ملین لیٹر خون اِس سے گزر چکا ہوتا ہے۔ یہ سب معجزے ہیں جو ہمارے اور آپ کے ساتھ مسلسل پیش آرہے ہیں مگر ہم ان کے بارے میں کبھی سوچتے تک نہیں۔

ہمارے جسم کے کسی حصے میں چوٹ لگنے یا زخم ہوجانے سے خون کا بہنا ایک عام سی بات ہے مگر کیا آپ نے کبھی سوچا کہ یہ رقیق خون اُس چوٹ سے لگاتار کیوں نہیں بہتا رہتا، رک کیوں جاتا ہے۔ دراصل یہ بھی ایک معجزانہ عمل ہے۔ ہمارے خون میں کئی قسم کے ذرّات ہوتے ہیں جیسے سرخ ذرات، سفید ذرّات، پلیٹ لیٹس، نمکیات، تغذیات وغیرہ۔ جیسے ہی کسی مقام پر چوٹ لگتی ہے اور خون بہنا شروع ہوتا ہے وہیں پر خون کے پلیٹ لیٹس بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور ان میں موجود ایک انیزائم تھرومبو کائینیز باہر نکل آتا ہے۔ اس انیزائم کے زیراثر خون میں گھلی ایک شے پروتھرومبین ایک دوسری شے تھرومبین میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ تھرومبین خون سے گھلی ایک پروٹین فائبری نوجن سے تعمل کرکے اُسے ریشے دار فائبرن میں تبدیل کردیتی ہے جو خون میں حل نہیں ہوتی اور کٹی ہوئی جگہ پر ایک جال سا بنادیتی ہے۔ یہ جال خون کے سرخ ذرّات کو روک کر جمے ہوئے خون کا ایک تھکا سا بنا دیتا ہے اور خون کا بہنا فوراً بند ہوجاتا ہے۔ سوچیے یہ معجزہ عمل میں نہ آتا تو کیا ہوتا؟ بعض لوگ سچ مچ ہی اس انیزائم سے محروم ہوتے ہیں۔ انھیں جریانِ خون کی شکایت ہوتی ہے اور چھوٹی سی چوٹ بھی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔

معمولی حادثوں کے دوران کسی ہڈی کا ٹوٹنا ایک عام تجربہ ہے۔ ڈاکٹر ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑتا نہیں ہے بلکہ اسے صحیح جگہ پر بٹھا کر اوپر سے پلاسٹر کردیتا ہے تاکہ وہ ہل کر جگہ نہ چھوڑ دے۔ ہڈی جڑنے کا معجزانہ کام خودبخود ہوتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی پر بھی جمے ہوئے خون کی ایک پرت جم جاتی ہے۔ ہڈی بنانے والے خلیے کچھ نمکیات پیدا کرتے ہیں جو جمے ہوئے خون کو رفتہ رفتہ ہڈی میں تبدیل کردیتے ہیں۔ تاہم یہ ہڈی بے حد ناہموار ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ دوسرے خلیے ہائیڈروکلورک ایسڈ پیدا کرتے ہیں جو ہڈی کے ناہموار حصوں کو تحلیل کرکے اس جگہ کو ہموار بنا دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی مشاق آرکیٹکٹ یہ کام انجام دے رہا ہے۔ ہموار ہونے کے بعد نئی اور پرانی ہڈی کا فرق بالکل ختم ہوجاتا ہے بلکہ اب ہڈی کچھ اور بھی مضبوط ہوجاتی ہے۔

کیا آپ نے کبھی اپنے تنفس پر بھی غور کیا ہے۔ یہ عمل پیدائش سے مرنے تک لگاتار جاری رہتا ہے اگر آپ کو یہ بتایا جائے کہ آپ ہر روز سانس لینے کے دوران تقریباً بیس بلین بیرونی مضر ذرات سے نبرد آزما ہوتے

ہیں جن میں جراثیم بھی موجود ہوتے ہیں تو شاید آپ ماننے سے انکار کردیں یا ہوسکتا ہے بہت زیادہ خوف زدہ ہوجائیں مگر حقیقت یہی ہے۔ آپ کو اِن بیس بلین بیرونی ذرات سے نجات آپ کی ناک میں موجود بالوں سے ملتی ہے جن میں وہ اٹک جاتے ہیں۔ جو باقی بچ جاتے ہیں وہ ناک کی اندرونی سطح پر موجود لیس دار میوکس میں چپک جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میوکس کے نیچے بہت باریک روئیں دار بالوں کی ایک تہہ ہوتی ہے۔ یہ بال سیلیا کہلاتے ہیں اور ان کا رخ منہ کی جانب ہوتا ہے ان بالوں کی مخصوص حرکت کسی بھی بچے ہوئے ذروں کو گلے تک پہنچادیتی ہے جہاں سے وہ یا تو آپ کے معدے میں چلے جاتے ہیں جہاں تیزابی افرازات انھیں گلا ڈالتے ہیں یا پھر آپ کھنکھار کے ساتھ انھیں باہر تھوک دیتے ہیں۔ بیرونی ذرات سے بچنے کے لیے اگر یہ معجزاتی طریقہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا، آپ خود سوچ سکتے ہیں۔

کیا آپ نے غلطی سے کبھی خراب یا جراثیم زدہ کوئی چیز کھائی ہے۔ جیسے ہی کوئی ایسی چیز آپ کے معدے کی حساس سطح سے ٹکراتی ہے۔ وہ اس کی فوری اطلاع دماغ کو دیتی ہے۔ دماغ فوراً حکم روانہ کرتا ہے جس کے زیراثر پردۂ شکم پھیلتا ہے اور پھیپھڑے ہوا سے بھر جاتے ہیں۔ گلے میں سانس کا راستہ اور معدے کا نچلا والو بند ہوجاتا ہے جبکہ معدے کا اوپری والو کھل جاتا ہے۔ ہوا بھرے پھیپھڑوں کی وجہ سے پردہ شکم سے بہت روز کا دھکا معدے کو لگتا ہے اور آپ کو زور کی ابکائی آتی ہے جس کے ساتھ ہی جراثیم زدہ غذا قے کی شکل میں باہر نکل جاتی ہے۔ بلاشبہ مضر اشیا سے معدے کی حفاظت کا یہ ایک معجزاتی طریقہ ہے۔

■

Dr. Shamshul Islam Farooqui90-B, Ahata Talib, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P72.jpg 1/1

3/21/2018 P73.jpg (1601×2391)

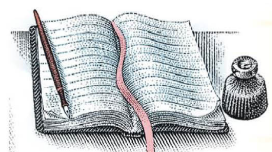

تبصرہ وتعارف

سائنس کی تدریس

مصنفین: ڈی این شرما، آر سی شرما
مترجم: غلام دستگیر
صفحات: 431، قیمت: 110
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد مقیم، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

یہ سائنس وتکنالوجی کا زمانہ ہے۔ کائنات کے وہ عقدے جو حل طلب تھے لیکن انسان انھیں حل کرنے میں ناکام رہ گیا تھا۔ علت کا معلول تو تلاش کرنا ہی تھا لہٰذا ذہنِ انسانی نے بے بس ہونے کی شکست تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی منطق پسندی کی بنا پر ایسی حل طلب باتوں کو ماورائیت کا نام دے دیا تھا۔ سائنس کی ترقی نے انسان کو جدید اندازِ فکر، نئے منطقی شعور اور استدلال سے روشناس کرایا ہے۔ سائنس کا مضمون دلچسپ بھی ہے اور خشک بھی۔ اس کے دلچسپ اور غیر دلچسپ ہونے کا انحصار اسکولوں میں پڑھانے کے طریقے پر ہے۔

'سائنس کی تدریس' ڈی این شرما اور آر سی شرما کی ایسی ہی قابلِ قدر کاوش ہے جو براہِ راست اساتذہ سے مخاطب ہے۔ اس کتاب میں تدریسِ سائنس میں درپیش پیچیدگیوں اور تدریس کے رموز ونکات کو پوری صراحت کے ساتھ بہترین انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ سائنس کے اساتذہ کے لیے تدریسی تربیت میں معاون یقیناً یہ ایک راہنما کتاب ہے۔

زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے ترتیب دی گئی اس کتاب میں 'تدریس سائنس کی تاریخ' کے ساتھ ساتھ 'تدریس سائنس کے طریقے'، 'سائنس کی تجربہ گاہیں اور ان کا سامان'، 'تجربہ گاہ کے کام کا انتظام— تجربہ گاہ کے کام کی قدر'، 'سائنس کا استاذ' اور 'دوسرے مضامین کے ساتھ سائنس کا ربط' ایسے 19 اہم ابواب ہیں۔ کتاب کے اخیر میں 9 ضمیمے شامل ہیں۔ ضمیمہ ایک 6 یونٹ پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے درجہ اول تا ہشتم کے لیے تیار کیا گیا جنرل سائنس کا نصاب ہے۔ ضمیمہ دو میں مختلف یونیورسٹیوں میں شامل تدریسِ سائنس (بی ایڈ) کے نصابات کا خاکہ ہے۔ ضمیمہ تین میں سائنس کے سامان مہیا کرانے والی بعض فرموں کے پتے دیے گئے ہیں۔ ضمیمہ چار میں سائنس کی فلموں اور فلمچوں کے ملنے کے ذرائع، فلمیں اور فلمچے فروخت کرنے والی فرمیں، فلموں اور فلمچوں کے نام نیز ہندی میں دستیاب فلموں اور فلمچوں کے نام شامل ہیں۔ پانچ نمبر میں ہائی اسکولوں کی سائنسی کارگاہوں میں ضرورت کے اوزار وآلات کے اسما درج ہیں۔ چھ میں اعادہ کے لیے سوالات اور سات میں اسکول کی لائبریری کے لیے عمومی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ ضمیمہ آٹھ این سی ای آر ٹی پبلی کیشنز کی کتابوں کے نام اور نواں ضمیمہ حوالہ جات پر مشتمل ہے۔

مصنفینِ کتاب نے سائنس کی تجربہ گاہوں کی ضرورت، اقسام، محلِ وقوع، ساخت اور ساز وسامان کے بارے میں بھی مفصل تحریر کیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے بھی نہایت ضروری ہے جو براہِ راست تدریسی خدمات پر مامور نہ ہو کر منتظمہ کمیٹی اور ادارت سے جڑے ہیں۔ تجربہ گاہوں کی اقسام کا نقشہ بھی ان کی ضروریات کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ نیز طبیعات، کیمیا اور حیاتیات کی تجربہ گاہوں میں کس قسم کے سامان ہونے چاہئیں یہ بھی درج ہے۔ تجربہ گاہ میں کام کس طرح کیا جائے اور طلبا کے ذریعے کیے گئے کام کی نگرانی اور قدر کس طرح کی جائے، کاپیاں کس طرح ترتیب دی جائیں اور ان میں تجرباتی عمل کا اندراج کیسے کیا جائے ان سب کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تجربہ گاہ میں پیش آنے والے ممکنہ حادثات اور فوری طبی امداد کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ذاتی صلاحیتوں اور بنیادی تعلیمی لیاقت بہ اعتبار اسناد اور ان باتوں کے رموز کو درج کرنے کے ساتھ ساتھ سائنس کے اساتذہ کو چند مفید مشورے بھی دیے گئے ہیں۔ یونٹ کی منصوبہ بندی اور سبق کی منصوبہ بندی کی طرف بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نقشے اور خاکے بھی ترتیب دیے گئے ہیں۔ سائنس کلب، تفریحی مشغلے اور میلے پر پورا ایک باب شامل کتاب ہے۔

'دوسرے مضامین کے ساتھ سائنس کا ربط' نامی باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ سائنس کے طلبا کے لیے اسکولی نصاب میں داخل دیگر مضامین کیوں اہم ہیں۔ مثلاً سائنس اور زبان کے تعلق سے اظہار کیا گیا ہے کہ سائنس کے طلبا اظہار خیال کے معاملے میں عموماً کمزور ہوتے ہیں جب کہ اظہار خیال کا آسان، دلچسپ اور واضح ہونا از حد ضروری ہے۔ اس کے لیے زبان کے استاد کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ طلبا سے کسی ایجاد یا کسی سائنس داں کی حیات اور کارنامے پر مضمون لکھوایا جا سکتا ہے، وغیرہ۔

اپنے مشمولات، جزئیات اور تفصیلات کی بنا پر تدریس سائنس کے لیے یہ ایک اہم معاون کتاب ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب تربیت یافتہ اور زیرِ تربیت اساتذہ کے ساتھ ہی ساتھ اسکولوں کے منتظمین، اراکین اور ادارت کی مزید توجہ حاصل کرے گی۔

اخبار کی کہانی

مصنف: غلام حیدر
صفحات: 140، قیمت: 48 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: رضی احمد ندوی،
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی

گرد وپیش اور دور دراز کے حالات وواقعات سے آشنائی حاصل کرنا زندہ دلی کی علامت ہے، اس کے بغیر انسانی زندگی درویش اور سنیاسی فقیری زندگی کے مترادف ہے، جو نہ آج کے سماج میں مقبول ومحبوب اور نہ ہی اسلام میں، ان حالات سے آگاہی اور واقفیت کے دو بڑے ذرائع الکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات وجرائد ان میں موخرالذکر زیادہ اہم ہیں۔

اخبارات سے اپنے اردگرد، علاقے، صوبے، ملک اور بیرون ملک میں کیا کیا حالات پیش آرہے ہیں، کیا کیا سرگرمیاں چل رہی ہیں، نت نئے اور کیا کیا انکشافات اور

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P73.jpg 1/1

3/21/2018 P74.jpg (1608×2314)

سائنسی ایجادات ہورہے ہیں اور تجارتی دنیا میں کیا اتار چڑھاؤ ہورہا ہے یہ سب ہمیں اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اخبار ہماری زندگی کا حصہ ہے۔

اخبار ایک جمہوری ملک میں عوام اور حکومت کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ یہ مختلف ملک، قوم، سماج، تہذیب وتمدن زبان وادب اور کاروبار وغیرہ میں رابطے کا کام بھی کرتا ہے، یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں نہ صرف ہم اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان چیزوں سے بھی باخبر ہوسکتے ہیں جو ہماری دسترس سے کافی دور ہے، یہ کمزور اور بے جان لوگوں کے لیے زبان بھی ہے اور ہتھیار بھی جس کے ذریعے کئی لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ صبح ہوتے ہی اخبار بینی کے لیے طبیعت میں عجیب بے چینی شروع ہوجاتی ہے، لیکن کیا ہم نے کبھی اس اخبار کی تاریخ اور ابتدا وارتقا پر نگاہ ڈالی ہے کہ اخبارات کا یہ لامتناہی سلسلہ کب سے، کہاں سے اور کیسے شروع ہوا؟

غلام حیدر نے انھیں سوالات کا جواب اور اردوداں طبقے میں اخبار بینی کا مزید شوق پیدا کرنے کے لیے 'اخبار کی کہانی' کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ بقول غلام حیدر سماجی تربتوں سے بچوں کو آگاہ کرنے کی یہ چوتھی کڑی ہے قبل ازیں موصوف 'پیسے کی کہانی'، 'خط کی کہانی' اور 'بینک کی کہانی' لکھ چکے ہیں۔

غلام حیدر نے اس کتاب کے مندرجات سے ایک ایسے موضوع کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جس پر اردو میں کم لکھا گیا ہے۔ زیر نظر تصنیف میں اختصار مگر جامع انداز میں اخبار کی سرگزشت مصنف نے پیش کی ہے جو قابل تعریف اور لائق ستائش ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں، اخبار کی حقیقت، اہمیت، اچھے اخبار کی علامت پھر کاغذ اور پیغام رسانی سے اخبار نویسی تک کے مراحل پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے باب میں اس کے ابتدائی نقوش، اس کی تاریخ، پریس پر نہایت مفید اور کارآمد معلومات فراہم کی ہیں جو اخبار کی تاریخ کی حد تک خاصے کی چیز ہے، تیسرے باب میں نئے اخبار، دنیا کے بڑے اخبارات، پھر اخبارات کی ترتیب و تزئین دلچسپی کی چیزیں، کارٹون اور اخبار کی دو بنیادوں خبریں اور اشتہار پر روشنی ڈالی گئی ہے، چوتھے باب میں ہندوستان میں اخبارات کا سلسلہ کب سے اور کیسے شروع ہوا، اس کا ارتقا اور عروج کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں 1857 کی بغاوت اور بغاوت کے بعد اردو اخبار، باغی اخبار وغیرہ اہم موضوعات کی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ اور چھٹے باب میں اخبار کی دنیا کے عنوان سے خبروں کی فراہمی، ان کی لکھائی، ابتدا میں کیسے ہوتی تھی اور آج کیسے ہوتی ہے، اتنے کم وقت میں کس طرح 30,30 ,20,20 اخبارات کے دو بجے تک چھپ کر صبح تک دور دراز علاقوں میں کیسے پہنچ جاتے ہیں، کمپیوٹر کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع کے پانچ ابواب میں software سے بحث کی گئی ہے اور آخری یعنی چھٹے باب میں hardware پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمے پیش کیے گئے ہیں جن میں دنیا سے نکلنے والے اہم اخبارات، انگریزی، اردو، ہندی اور دیگر زبانوں میں نکلنے والے اخبارات کی فہرست دی گئی ہے، ان کی تعداد، مختلف وقتوں میں کیا رہی ہے، پھر اس کے پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے یہ تاریخی اعتبار سے اہم ہیں جو بچوں اور عام قاری سے زیادہ صحافت سے متعلق محققین کے لیے کارآمد ہے جگہ جگہ غلام حیدر صاحب نے قدیم اخبارات کے تراشے بھی پیش کیے ہیں جو کتاب کی دل چسپی بڑھانے میں معاون ہوسکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ کتاب اپنے موضوع پر معلومات افزا ہے مواد سے پر ہے، زبان بھی شستہ اور سلیس ہے۔ بچوں کے ساتھ ساتھ صحافت سے متعلق طالب علموں اور دل چسپی رکھنے والے قارئین کے لیے مواد اس کتاب میں موجود ہے۔ البتہ طرز بیان اور اسلوب انشائیہ اور اخباری زیادہ ہے۔

ذوق و جستجو

مصنف: خواجہ احمد فاروقی

صفحات: 400، قیمت: 87 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: عبدالصبور G-50، تھرڈ فلور،

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

'ذوق وجستجو' اردو کے کثیرالتصانیف ادیب ومحقق خواجہ احمد فاروقی کے چند اہم علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے نہایت نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں نہ صرف یہ کہ اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں بلکہ حالات کو سازگار بنانے اور زبان وادب کے فروغ کے لیے راہیں ہموار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بیرونی ممالک میں بھی اردو کے فروغ کے سلسلے میں فاروقی صاحب کی خدمات قابل صد تحسین ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی اہم اور وقیع علمی وادبی مقالات اور کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جنھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ذوق وجستجو میں سترہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں کئی ایسے ہیں جن کے بارے میں بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ ہماری ادبی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کا عہد ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی ہماہمی اور قدیم وجدید کی آویزش کا دور رہا ہے لیکن ان کی تحریریں توازن اور اعتدال کی مثال پیش کرتی ہیں۔

خواجہ صاحب نے ہمیشہ صحت مند ادبی اقدار کو پیش نگاہ رکھا نہ تو قدیم ادب سے بے زاری کا اظہار کیا اور نہ ہی جدید کی بے جا حمایت کی اس کی مثالیں مجموعے میں شامل مضامین میں بھی ملتی ہیں بلکہ اس کتاب میں شامل پہلا مضمون 'فن اور روایت' ہی اس خیال کی تائید وتوثیق کرتا ہے۔ 'مرزا شوق کی مثنویاں' بھی اسی نوعیت کا ہے۔

اردو نثر کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سلسلے میں خواجہ احمد فاروقی کی رائے قابل غور ہے۔ مضمون بہ عنوان 'گنج خوبی' میں لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ ہماری تاریخوں میں فورٹ ولیم کالج اور میر امن کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ان کے سلسلے میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، وہ بھی کچھ غیر متوازن سی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کالج کے مخاطب ہندوستانی نہیں انگریز تھے اور ان کے مقاصد ادبی اور تہذیبی نہیں بلکہ انتظامی اور سیاسی تھے۔ اس سے اور جو کچھ فائدہ پہنچا وہ صرف حتمی طور پر، وہ اس کا مقصود حقیقی نہیں ہے۔''

خواجہ احمد فاروقی وہابی ادب پر کام کر چکے تھے۔ اردو نثر کے ارتقا کے مراحل پر غور وخوض کیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی خدمات بھی ان کی نگاہ میں تھیں۔ اس سلسلے میں افراط وتفریط کی شکار آرا بھی ان کی نگاہ سے گزری ہوں گی۔ خواجہ صاحب کی اعتدال پسند طبیعت نے اس کی جانب توجہ دلانا ضروری خیال کیا تاکہ اصل صورت حال نگاہوں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ اس مجموعے کا ایک اہم اور معرکے کا مضمون 'ماسٹر رام چندر' ہے جو دراصل ایک کتاب کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اس میں ماسٹر رام چندر کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ دلی کالج کے قیام کے اغراض ومقاصد، اس کی اہمیت اور اس کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے اردو نثر کے ارتقائی سفر کی داستان سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''فورٹ ولیم کالج سے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی تک عشق کی ایک جست نہیں ہے دہلی کالج اس کی درمیانی منزل ہے۔ طبعیات، کیمیا، ہیئت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سیاست، تمدن، فلسفہ واخلاق، صحافت، قواعد، لغت سازی، تذکرہ وترجمہ، ناول نگاری،

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P74.jpg 1/1

3/21/2018 P75.jpg (1616×2318)

ادب نسواں، مقالہ نگاری اور مکتوب نویسی میں دہلی کالج سے متاثر شخصیتوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ہماری تاریخ ادب کے اہم سنگ میل ہیں اور اس وقت عمل میں آئے ہیں جب لوگ نوعروس نظم ہی کے خط وخال پر مٹے ہوئے تھے اور وقت تک مفکر جدید یعنی سرسید احمد خاں کے کارنامے سامنے نہیں آئے تھے۔''

مرزا غالب سے متعلق تین مضامین بہ عنوان غالب کی عظمت، غالب اور آزردہ اور غالب کا ملکہ شعر شامل ہیں۔ان مضامین میں غالب کی شعری وفنی عظمت کے ساتھ ان کی خامیوں اور بعض انسانی کمزوریوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔مومن دہلوی پر مضمون بھی خاصے کی چیز ہے جس میں مومن کے کمالات اور حدود پر عمدہ بحث ملتی ہے۔ایک مضمون 'واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے رقعات' ہے کئی اعتبار سے یہ نہایت اہم مضمون ہے۔ یہ خطوط واجد علی شاہ کے ذاتی حالات کے علاوہ اس زمانے کے تاریخی اور تمدنی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں نیز ان کے ذریعے لکھنو میں اردو نثر کے ارتقا کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ مجموعے میں شامل دیگر مضامین یہ ہیں: ریاض کی شگفتہ نگاری، فانی، اصغر کی شاعری، حسرت موہانی وغیرہ۔ایک مضمون مولانا آزاد کی صحافت سے متعلق ہیں۔غرض تمام مضامین ادب کے طالب علموں کے لیے روشنی فراہم کرتے ہیں اور بعض مضامین ضخیم کتابوں کا نعم البدل ثابت ہوں گے۔خواجہ احمد فاروقی کا اسلوب نہایت دلکش اور رواں ہے۔خالص تحقیقی اور خشک موضوعات بھی ان کے رواں دواں اسلوب کے باعث مطالعے پر آمادہ کرتے ہیں۔قومی کونسل اس کتاب کی اشاعت کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔

فیض ایک نیا مطالعہ

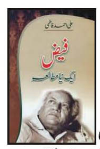

مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی

صفحات: 187، قیمت:/200 روپے

ناشر: ادارۂ نیا سفر الہ آباد

مبصر: رشدیٰ خاتون وارڈ نمبر 10، کھرکہ، فقیر آباد، سرائے عاقل، کوشامبی

زیر تبصرہ کتاب 'فیض ایک نیا مطالعہ' پروفیسر علی احمد فاطمی کی تازہ ترین کتاب ہے جو ادارۂ نیا سفر کے زیر اہتمام جنوری 2012 میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ کتاب میں مصنف کے ابتدائیہ کے علاوہ دس مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جو بعد کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیے گئے ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اپنے ابتدائیہ میں رقمطراز ہیں: ''مجھے یہ احساس ہے کہ یہ مضامین غیر معمولی نہیں ہیں تاہم آج کے تناظر میں فیض کو سمجھنے کی ادنیٰ سی کوشش ضرور ہے۔

اس کتاب کو اسی تناظر میں دیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ مضمون 'فیض — صوفی ازم سے مارکسزم تک' میں فاطمی صاحب نے فیض کے مزاج میں پائی جانے والی حلم ومروت، ان کی خاموش طبعی، دل کی دردمندی، اخوت ومروت وغیرہ جیسی صفات کو ان کے ارد گرد کے ماحول سے اثر اندازی وغیرہ کی دین بتایا۔یہی سچ بھی ہے کہ فیض کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی نیز جن اساتذہ سے انہوں نے کسب فیض کیا وہ سب کے سب صوفی خیالات ونظریات کے حامل تھے۔خود ان کے والد نماز کے پابند اور مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے درس لیا کرتے تھے۔ایسے مذہبی اور صوفیانہ ماحول میں پلنے بڑھنے والا شخص یقیناً اپنے اندر سوز وگداز اور حلم ومروت اور دردمندی جیسے اوصاف تو رکھے گا ہی۔ یہی ساری چیزیں جب انھیں مارکسزم کے مطالعہ سے معلوم ہوئیں تو وہ اشتراکی خیالات کو اپنائے بنا نہیں رہ سکے۔ ''انھوں نے صوفی ازم سے مارکسزم کا سفر کامیابی سے طے کیا اور ایک غیر معمولی شاعری اور دانشوری کے ذریعہ عمدہ عظیم شاعری کے لازوال نقوش ثبت کر گئے اور ترقی پسند شاعری کی تاریخ تو بنے ہی تہذیب بھی بن گئے۔

مضمون 'فیض — جمال سے جلال تک' میں فیض کی شاعری کے سفر پر گفتگو کی ہے کہ کس طرح فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا رومانی شاعری سے کی۔ وقت اور حالات کے تقاضے کے مدّ نظر، عوام سے بے پناہ ہمدردی وقربت نیز مختلف ممالک کے سفر کے دوران وہاں کے عوام سے قربت اور ان کی مشکلوں سے آشنا ہونے کے بعد ان کی شاعری میں ہونے والے تغیر وتبدل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مضمون 'فیض اور اقبال' کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔جس میں بیسویں صدی کے ان دونوں شاعروں کی قربتوں اور شاعری کی مماثلتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ساتھ ہی فیض پر اقبال کے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا مضمون 'فیض کی غالب شناسی' سے تعلق رکھتا ہے۔اس میں غالب پر لکھے گئے فیض کے تین مضامین 'غالب کے تخیل کے بنیادی عناصر' 1944 مشمولہ نیا ادب کا تیسرا شمارہ، غالب کی ایک غزل کا تجزیہ ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا'' اور میزان میں شامل ایک ڈرامہ جو غالب کی شاعری اور اس کے فلسفے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے پر کافی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ فیض کی بعض دیگر تقاریر اور انٹرویوز کے حوالے سے بھی غالب کی شاعری فکر وفلسفہ کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ ایک بات اور یہ کہ غالب کی شاعری اور فکر سے خود فیض نے کتنا کسب فیض کیا اس طرف بھی اس مضمون میں اشارے ملتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل پانچواں مضمون فیض کی نظم 'تنہائی' کا تجزیہ ہے جو تقریباً 16 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے فیض کے نظریات سے بھی بحث کی ہے۔ اکابرین ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے: ''دنیا یا زندگی محض عشق تک محدود نہیں ہے۔فیض خود تو اس محدود دائرے سے باہر جاتے ہی ہیں اردو شاعری کو بھی بڑے دائرے میں لے جاتے ہیں۔''

چھٹا مضمون فیض کے تنقیدی رویے، فکشن کے حوالے سے، ہے جس میں فاطمی صاحب نے 'میزان' میں شامل فیض کے ان مضامین پر گفتگو کی ہے جو انھوں نے 'اردو ناول' 'رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری' اور 'پریم چند' کے تعلق سے 39 تا 45 کے درمیان تحریر کیے تھے۔فیض کے ان مضامین سے ان کی علمی بصیرت اور ادب جسے صرف شاعری سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے سے ہٹ کر فکشن پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا بھی کہ پینتیس سال کا یہ نوجوان فکشن کو کس انداز سے دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔

ساتویں مضمون میں فیض کے ایک ڈرامے جو 'غالب اور زندگی کا فلسفہ' کے عنوان سے فیض کے تنقیدی مجموعہ 'میزان' میں شامل ہے پر گفتگو کی گئی ہے اس میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے مصنف رقمطراز ہے کہ: 'میرا خیال ہے کہ فیض کا یہ ڈرامہ غالب پر پہلے اور بعد کے لکھے گئے ڈراموں سے قطعئی مختلف ہے جو بہت سارے فکری تنقیدی اور بوجھل مضامین و مقالات کو بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔'

آٹھواں مضمون تجزیاتی نوعیت کا مضمون ہے جو روسی اسکالر ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کی فیض پر لکھی جانے والی کتاب 'پرورشِ لوح وقلم' ''حیات وتخلیقات' کے عنوان سے ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر فاطمی نے لدمیلا وسیلیوا کے خیالات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ایک روسی اسکالر جس کو بذات خود فیض صاحب کی قربتیں، اور ان کی شفقتیں حاصل رہی ہیں اور جو ہند وپاک کی تہذیب وثقافت سے نا آشنا ہے فیض کی شاعری کو کس انداز سے سمجھتی اور پرکھتی ہے۔

نواں مضمون تقی عابدی کی حال میں ہی فیض پر شائع ہونے والی کتاب 'فیض فہمی' سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مضمون بھی تجزیاتی نوعیت کا ہے۔ اس کتاب کا دسواں اور آخری مضمون فیض کی کتاب 'میزان' میں شامل ان کے مضمون 'ادب کا ترقی پسند نظریہ' جو 1938

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P75.jpg 1/1

میں لکھا گیا تھا پر قلم بند کیا گیا ہے۔

جیسا کہ فاطمی صاحب نے ابتدائیہ میں ہی عرض کر دیا ہے کہ 'اس کتاب سے فیض شناسی میں کوئی اضافہ نہ ہوگا' صد فی صد درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کے بعض مضامین فیض کی تحریر و تقریر کو موضوعِ گفتگو بنا کر پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کا پہلا اور دوسرا مضمون حالاں کہ بحث کے نئے در وا نہیں کرتا لیکن پھر بھی اچھے مضامین میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ ان مضامین میں فیض کی شاعری کے ادوار کو پیش کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فیض کس طرح اپنے گھر کے ماحول سے اشتراکیت تک کا سفر طے کرتے ہیں۔ شاعری کی ابتدا رومانی شاعری سے کرنے والا ایک نوجوان شاعر جب گردشِ زمانہ کے چکر میں گرفتار ہوتا ہے تو کیسے کیسے اس کی شاعری کی لے بدلتی جاتی ہے۔ اس کے علاو فیض کی نظم 'تنہائی' پر کیا گیا تجزیہ بہت اچھا ہے۔ میں پروفیسر علی احمد فاطمی کی اس نئی کتاب پر مبارک باد مستحق ہیں اور امید کرتی ہوں کہ حلقۂ ادب میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات

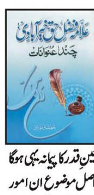

مصنف: خوشتر نورانی

صفحات: 208، قیمت: 130 روپے

ناشر: ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

مبصر: خالد مبشر،

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب کا تعلق تاریخی حقائق سے ہے، لہٰذا اس کے علمی تعینِ قدر کا پیمانہ یہی ہوگا کہ یہ تحقیق کی مسلمہ اخلاقیات کی کس حد تک پابند ہے۔ اس کتاب کا اصل موضوع ان امور کی تحقیق ہے کہ فضل حق خیر آبادی نے 1857 کے معرکے میں شرکت کی یا نہیں؟ اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کیا یا نہیں؟ مذکورہ دونوں سوالات کا جواب مصنف نے اثبات میں دیا ہے اور اس کے ثبوت میں دلائل بھی پیش کیے ہیں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ فضل حق خیر آبادی کے حوالے سے مذکورہ مسائل بحث طلب رہے ہیں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی، مولانا عبدالحکیم شرف قادری، مفتی نجم الحسن خیر آبادی، حکیم سید محمد احمد برکاتی اور ڈاکٹر سلمہ سیہول کے مطابق فضل حق خیر آبادی نے 1857 کے معرکے میں سرگرم حصہ لیا تھا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی جاری کیا تھا۔ جب کہ امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام کے نزدیک یہ دونوں امور غیر محقق ہیں۔ امتیاز علی عرشی نے فضل حق خیر آبادی اور فضل حق رام پوری کی ہم نامی پر جو بحثیں کی ہیں ان پر خوشتر نورانی نے جس طرح جرح و تعدیل کرتے ہوئے سوالات قائم کیے ہیں وہ بلاشبہ ذہانت و متانت پر مبنی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ 1857 کے بعد کے صحیح صورت حال کی تفہیم آسان کام نہیں ہے۔ اس عہد کی تاریخ ابھی تک مکمل طور پر مرتب ہی نہیں کی جا سکی۔ نیشنل آرکائیوز میں غدر سے متعلق بے شمار نوادر ایسے موجود ہیں جن سے استفادے، اخذ و نتائج اور نت نئے تاریخی انکشافات کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔

فضل حق خیر آبادی کے حوالے سے اب تک جو تحقیقی بحثیں ہو چکی ہیں، خوشتر نورانی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں نئے زاویۂ نگاہ اور نادر و نایاب مواد کی پیش کش سے اس میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اس کتاب میں فضل حق خیر آبادی کے دو عربی قصائد، قصیدہ نونیہ اور قصیدہ رائیہ کی نہ صرف بازیافت کی ہے بلکہ ان کے اردو تراجم اور تلخیص بھی پیش کیے ہیں جن سے انگریزیوں کی مذمت اور ان کے خلاف فتویِ جہاد کی تصدیق ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس تحقیقی مسئلے پر یہ ایک نیا حوالہ ہے۔ اس کے علاوہ 'فضل حق شناسی' میں خوشتر نورانی کا ایک اور اہم اضافہ یہ ہے کہ انھوں نے 'فوقیت فضل حق' کی ترتیب میں بڑی تحقیقی دقت رسی کا مظاہرہ کیا ہے۔

خوشتر نورانی صاحب معروف عالم اور صحافی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں تجزیاتی، استدلالی اور منطقی اسلوب کو قائم رکھنے کی بہت حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کا مقدمہ معروف ناقد و محقق پروفیسر معین الدین عقیل (پاکستان) نے رقم کیا ہے اور فلیپ میں پروفیسر اسد قادری احمد (امریکہ) اور خواجہ رضی حیدر (پاکستان) نے مصنف کے علمی ذہن اور تجزیاتی اسلوب کو سراہتے ہوئے اس کتاب کو 'فضل حق شناسی' میں اہم اضافہ قرار دیا ہے۔ البتہ خواجہ رضی حیدر کا مولانا فضل حق خیر آبادی کو محض عقائد اہلِ سنت کے مبلغ کے بطور پیش کرنا ان کی تبحر علمی و ادبی شخصیت کے ساتھ یک گونہ زیادتی کے مترادف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فضل حق خیر آبادی کی عظمت و فضیلت کے معترف اس زمانے کے تمام علما و فضلا تھے اور اس سلسلے میں خوشتر نورانی صاحب نے بجا طور پر سرسید احمد خاں کے اعترافی کلمات نقل کیے ہیں۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت جو ہر سنجیدہ قاری کو متاثر کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں حواشی، ضمیمے اور حوالوں کا اہتمام کیا گیا ہے، جس سے مصنف کے محققانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے اس کتاب سے فضل حق خیر آبادی ہی نہیں بلکہ 1857 کے معرکے پر نئے زاویے سے تحقیق جستجو کا رجحان فروغ پذیر ہوگا۔

ہندوستانی فلموں میں تہذیبِ اودھ کی عکاسی

مصنف: منتظر قائمی

صفحات: 395، قیمت: 182 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: اصغر اعجاز، امامیہ ہال، نیشنل کالونی، امیر نشان، علی گڑھ

سنیما عہد حاضر کا ایک نایاب اور سب سے طاقتور ذریعۂ اظہار ہے جس کو متعدد فنون مثلاً ڈرامہ، فوٹوگرافی، پینٹنگ، رقص و موسیقی، ساؤنڈ ایفکٹ، ادب، حرکات و سکنات جیسے انگنت میڈیم کا امتزاج متصور کیا جاتا ہے۔ یہ منجملہ فنون یہاں کوئی اپنی علاحدہ شناخت قائم نہیں کرتے بلکہ ان کے انضمام سے ایک داستان سرائی کا ایک نیا میڈیم جنم لیتا ہے جس کو سنیما کہتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ بالخصوص سنیما میں زندگی کی عکاسی اس قدر قوی ہوتی جارہی ہے کہ سنیما کو اب تہذیبی مطالعے کا ایک اہم حوالہ باور کیا جانے لگا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تھیٹر حرکات، اعمال و افعال کو پیش کرنے میں جب اپنی کم مائیگی کا احساس دلانے لگا تو سنیما جیسی صنف نے جنم لیا اس کے علاوہ ڈرامے کا میڈیم جن اشیا اور مظاہر کو پیش کرنے کے لیے ناکافی تصور کیا جاتا تھا سنیما نے ڈرامے کی یہ مشکل آسان کردی۔ آغاز میں سنیما نے فن، تکنیک، مواد اور موضوع کی سطح پر پارسی ڈراموں سے خوب کسبِ فیض لیا اس لیے ہندوستان میں پارسی تھیٹر کے زمانے کے ڈراموں میں جو کہانی بیان کرنے کا فن تھا اور کہانی کو جس انداز سے پیش کیا جاتا تھا وہی سنیما کا فن ٹھہرا اور کم و بیش دنیا کے دیگر سنیما کے برعکس آج بھی سنیما ہندوستان میں اسی فریم میں بنایا جاتا ہے۔

ہندوستانی سنیما یعنی بالی ووڈ ساختیاتی سطح پر دنیا کا واحد سنیما ہے جو نغموں اور رقص و موسیقی کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا یہی باقی دنیا کے مقابلے اس کی کمزوری اور انفرادیت ٹھہرتی ہے۔ دوسرے ہندوستان میں رقص و موسیقی اور نغمہ اور راگ راگنیوں کی

3/21/2018 P77.jpg (1603×2252)

ایک قدیم روایت ہے جس کا بھرپور استعمال ڈرامے اور سنیما دونوں ہی میڈیم میں نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں تہذیبِ اودھ کی نمایاں صفات جن پر اس تہذیب کی اساس قائم ہے ان کی نشاندہی فلموں میں اور منجملہ ہمارے سنیما میں کی گئی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ عموماً جب بھی تہذیبِ اودھ کا ذکر کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے ہمارے دل و دماغ پر طوائف جلوہ افروز ہو جاتی ہے جس کی بڑی وجہ ہمارا سنیما ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بقول مصنف ''زیادہ تر فلموں نے اودھ سے متعلق اسٹیریو ٹائپ کو مستحکم کرنے کا فریضہ ہی انجام دیا ہے اور انگریزوں نے اس طرزِ معاشرت سے متعلق جن غلط تصورات کی آبیاری کی تھی فلموں نے ان کا نقش اور گہرا کرنے کا فریضہ ہی انجام دیا ہے۔'' کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ اس تہذیب میں طوائف کا رول مرکزی تھا اور بڑے سے بڑے امرا اور نوابین مجلسی آداب و اطوار سیکھنے کے لیے ان طوائفوں کے سامنے زانوائے ادب تہہ کرتے تھے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ طوائفوں کو سماج اور معاشرے میں ایک معیاری مقام عطا کیا گیا۔ سنیما نے بھی اسی مشہور روایت اور پاپولر تاریخ کا سہارا لیا اور اس تہذیب سے متعلق فلموں میں بھی طوائف کو اساسی اہمیت دی گئی اور اسی پرکشش طوائف کے ذریعہ اودھ میں فنونِ لطیفہ کی مقبولیت اور طرزِ حیات کے متعدد مراحل کی نشاندہی کی گئی۔ سنیما نے تہذیبِ اودھ کے نگارخانے سے طوائف جیسی پرکشش شے کو نکال کر دنیا کے گوشے گوشے میں تشہیر کر دیا حالانکہ تہذیبِ اودھ فقط طوائف سے راہ و رسم اور تعلقات کا ہی نام نہیں ہے بلکہ تہذیبِ اودھ میں اور بھی بہت سے رنگا رنگ اور پر لطف پہلو ہیں جو عام طور پر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ اس تہذیب نے دو پلی ٹوپیوں، شربتی انگرکھوں، چوڑی دار پائجاموں، ریشم اور کم خواب کے کڑھے ہوئے کرتوں کی شکل میں ایک نئی جدت تراشی تو غذاؤں میں پلاؤ، خاصگی، مزعفر، شیرمال، جلیبی، امرتی، پراٹھے، کباب اور قورمے وغیرہ میں اپنی انفرادیت قائم کی۔ اخلاق و آداب میں ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی تو تفریحی مشاغل میں پتنگ بازی، مرغ بازی اور بٹیر بازی کو فروغ دیا۔ کتھک، ٹھمری، خیال، دادرے، قوالی، گائکی اور رہس جیسی انگنت اصناف میں اختراع کا فریضہ انجام دیا گیا۔ مصوری، خطاطی، مشاعرے، جلسے، دستکاری، چکن اور کامدانی، کارچوبی اور سلمہ ستارے کے ذریعہ ایک انوکھا مقام پیدا کیا گیا۔ نولکشور پریس اور اودھ پنچ اخبار اسی تہذیب کی دین ہیں۔

تہذیبِ اودھ دو بڑی اور نمایاں تہذیبوں کا خوبصورت امتزاج ہے جس کو گنگا جمنی تہذیب اور ساجھی وراثت کے عنوان سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسی تہذیب کو اپنا مرکزی نقطہ سمجھ کر سنیما بھی کم و بیش اسی نہج پر اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ ہندوستانی سنیما جس کو عرفِ عام میں ہندی سنیما کہا جاتا ہے اس کے متعلق کتاب کے مطالعے سے یہ عیاں ہے کہ اس کے خمیر میں شمالی ہند کے تہذیبی عوامل کی کارفرمائی زیادہ نظر آئی ہے۔ ممبئی سنیما میں جس طرح کا تمدن اور کلچر پیش کیا جاتا رہا ہے وہ زیادہ تر شمالی ہند کا ہے اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ اس میں لباس، مکان، گفتگو، زبان، جائے وقوع سب شمالی ہند سے تعلق رکھتے ہیں خصوصاً مسلم معاشرے اور پس منظر پر مبنی فلموں میں ان کی جھلک اور بھی صاف نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ اس تہذیب نے جن روایات اور فن کو ایجاد کیا ان کا سنیما نے خاطر خواہ تصرف کیا ان میں قوالی جیسی قدیم صنف سے لے کر کتھک، مجرا، ٹھمری، دادرہ، برہا، چیت، لوک گیت وغیرہ شمالی ہند کی ہی تہذیب کی مرہونِ منت ہیں۔ اداکار، ہدایت کار، کہانی کار، نغمہ نگار اور موسیقار غرض کہ فلم کے تمام شعبوں میں اپنے کارہائے نمایاں انجام دینے والے زیادہ تر افراد کا تعلق شمالی ہند سے ہونے کی وجہ سے فلم کے بہت سے پہلوؤں پر اس تہذیب و تمدن کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم معاشرے خصوصاً نوابی کلچر پیش کرنے کے لیے اودھ کو اور اس کی تہذیب و تمدن کو رول ماڈل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ یہاں کے محل، حویلیوں، دلکش اور دیدہ زیب عیش گاہوں اور رہائش گاہوں کا ماڈل اختیار کیا گیا ہے جو ابھی بھی فلموں میں نظر آ جاتا ہے۔ مارشل ہیڈ گاسن نے اپنے مضمون Urdu, Awadh and Tawaif میں ہندوستان میں اردو زبان کی آخری آماجگاہ سنیما ہی کو قرار دیا ہے۔

اردو میں فلموں کے تہذیبی مطالعے پر بہت کم صرفِ نگاہ فرمائی گئی ہے اور پھر فلموں میں تہذیبِ اودھ کی مختلف اور رنگارنگی صفات کے محرکات کا مبسوط مطالعہ کوئی آسان کام بھی نہیں تھا مگر مصنف نے بڑی دلجمعی اور خوش اصلوبی سے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ اس قسم کے مطالعوں کی اگر حوصلہ افزائی نہ فرمائی جائے تو یقیناً ناسپاسی ہوگی۔

آب حیات

مصنف: انجینئر محمد فرقان سنبھلی
صفحات: 141، قیمت: 200 روپے
ناشر: القاضی پرنٹر اینڈ پبلشر
مبصر: فصیح اکمل قادری

اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت کی تحریک نے جو اثرات مرتب کیے تھے اس سے سنجیدہ افسانوں کا قاری نہ صرف غیر مطمئن تھا بلکہ کسی حد تک نالاں بھی تھا۔ لیکن یہ غیر افسانوی فضا زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور گذشتہ چند سالوں میں افسانوی ادب تحریر کرنے والوں میں مقبول ترین ناموں کو چھوڑ کر کئی ایسے نام شامل ہوئے جنھوں نے افسانوں کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اپنی قلم برداشتہ تحریروں سے افسانے کو ایک نیا معیار بخشا اور گذشتہ منظرنامے کو اس تیزی سے تبدیل کیا کہ افسانے کے ناامید قاری میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ان افسانہ نگاروں نے زندگی کی تصویر کا ہر جہت سے معائنہ کیا اور باریک سے باریک پہلو کو ایک نئے رنگ سے رنگنے کا کام بخوبی انجام دیا ہے۔ شہری اور دیہی مسائل پر ان نو واردان قلم نے اس تیزی سے گرفت مضبوط کی کہ معاشرے کا ادنی سے ادنی مسئلہ روزِ روشن کی طرح ہم پر واضح ہو گیا۔ صارفیت کے دور میں کساد بازاری نے پوری دنیا کے عوام کو اپنے ریشمی جال میں اس خوبصورتی سے پھانسا ہے کہ مہنگائی کے جہنم نے امیر اور غریب دونوں کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے اور اس تفریق کے باوجود ان دونوں طبقوں کے مسائل میں کسی حد تک مماثلت پیدا ہو گئی ہے ایسے میں بیمار زمانہ کی نفس پہ ہاتھ رکھ کر اصل مسئلے کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں رہ گیا جتنا بظاہر نظر آتا ہے محمد فرقان سنبھلی جیسے افسانہ نگار جو اس بیماری کی جڑ تک پہنچ کر اس کی صحیح شناخت کا ہنر اپنے اندر پیدا کر رہے ہیں یہ امر قابلِ صد تحسین ہے۔ کئی معتبر افسانہ نگاروں کی موجودگی میں جن میں عابد سہیل، اقبال مجید، رتن سنگھ، جوگندر پال وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں، اور ساتھ ہی دوسرے نئے افسانہ نگاروں کی صف میں اپنا قد پوری طرح استوار کر لینا ایک غیر معمولی فعل ہے۔ محمد فرقان سنبھلی پر فنِ افسانہ نگاری کا اتنا سہل ہو جانا کہ وہ قاری کو نہ صرف اپنی گرفت میں رکھے بلکہ تا دیر اس کے دل پر اس کا اثر بھی برقرار رہے، بڑی بات ہے۔

محمد فرقان سنبھلی ابھی نوجوان ہیں۔ ان کی اس سے قبل کئی اہم موضوعات پر کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں جن میں مصرِ قدیم (2003)، آئینۂ فلکیات (2004) کے علاوہ اردو صحافت اور ضلع مرادآباد (2008) قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے حوالے سے علمی و ادبی حلقوں میں ان کا نام غیر معروف نہیں تھا اس لیے آب حیات (افسانوی مجموعہ) کو بھی ان کی دوسری مفید اور معلوماتی کتابوں کی طرح مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ محمد فرقان سنبھلی کی کتاب 'آب حیات' جس میں انھوں نے پندرہ افسانے اور دو افسانچے جمع کیے ہیں، افسانے کے قاری کو کچھ اچھے افسانوں سے متعارف کرواتی ہے۔ اس میں بعنوان انصاف، راجہ کا محل، تقسیم کے داغ، آب حیات، آنر کلنگ، امداد، زلزلہ،

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P77.jpg 1/1

3/21/2018 P78.jpg (1596×2200)

واپسی، کریڈٹ کارڈ، خوبوں کا تاجر، دائمی جہیز، نوکری، چوراہے والا بھکاری، احساس اور آخری خواہش یہ پندرہ افسانے اور غلطی اور اپنے دکھ مجھے دے دو کے نام سے دو افسانچے موجود ہیں۔ ساتھ ہی انھوں اپنی کتاب میں یہ التزام بھی کیا ہے کہ اور 'افسانے کا ایک مختصر جائزہ' اور 'مرادآباد (جہاں کے وہ رہنے والے ہیں) میں 1985 کے بعد اردو افسانہ' کے نام سے دو معلوماتی مضامین بھی شامل کردئے ہیں جس سے افسانے کے نئے قاری کو گذشتہ افسانوی منظرنامے سے واقفیت تو حاصل ہوتی ہی ہے ساتھ ہی صاحب کتاب کے شہر میں افسانے کی موجودہ صورت حال کیا ہے اس سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ محمد فرقان سنبھلی کی کتاب میں 'تعارفی کلمات' کے عنوان سے ایڈووکیٹ شمیم فاطمہ نے محمد فرقان اور ان کی کتاب کا جس علمی انداز میں تعارف کروایا ہے وہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایڈووکیٹ شمیم فاطمہ، محمد فرقان سنبھلی صاحب کی شریک حیات ہیں ان کے تعارفی کلمات کی اہمیت کا بخوبی اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے جو کتاب کی پشت پر موجود ہے۔

مختصر افسانوں کے حوالے سے محمد فرقان سنبھلی اپنی ایک منفرد شناخت بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ قابلِ مبارکباد ہیں انجینئر صاحب کہ انہوں نے اپنے فن کی بڑی مضبوط اور دیرپا تراکیب کا استعمال کرکے نہ صرف افسانے کے تاثراتی اسلوب کو تازہ کاری سے ہم کنار کیا بلکہ عصری موضوعات کو بھی بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ اس تعلق سے ان کا افسانہ 'انصاف' بابری مسجد تنازعہ پر، 'تقسیم کے داغ' ہند پاک تقسیم کے مسئلے پر اور 'آب حیات' جو اس مجموعے کا سب سے موثر اور موجودہ صورت حال پر ارتقا کی سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے انسان کی بے بسی اور بے چارگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ زبردست افسانہ ہے۔

میں ذاتی طور پر انجینئر محمد فاروق کو ان کامیاب افسانوں پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے اردو کے عام قاری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو ایک بار ضرور پڑھیں۔

نیا دور (صحافت نمبر)

مدیر: وضاحت حسین رضوی

صفحات: 340، قیمت: 30 روپے

ناشر: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

مبصر: راغب اختر، 169 سابرمتی ہاسٹل،

جے این یو، نئی دہلی 67

کسی زبان کی بقا اور ہمہ گیریت کی وجہ اس زبان کا عوام سے رابطہ اور عصری شعور ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی زبان بجائے خود ایک سماجی معاہدے کے تحت وجود میں آتی ہے اس لیے اس کا معاشرے کے سفید و سیاہ سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ زبان کا معاشرے سے یہ رشتہ یوں تو تمام تر تقریر و تحریر میں کاربند ہوتا ہے تاہم صحافت میں یہ رشتہ زیادہ متحرک اور مضبوط ہوتا ہے۔ زبان اور معاشرے کے اسی رشتے کو منعکس کرنے کے لیے اتر پردیش حکومت کے محکمہ انفارمیشن اور پبلک ریلیشنز کے ذریعہ شائع ہونے والے رسالہ نیا دور نے اردو صحافت نمبر شائع کیا جس میں نہ صرف یہ کہ ہم عصر صحافت کے حوالے سے مضامین شائع ہوئے ہیں بلکہ اس خصوصی شمارے میں ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ کو ایک دستاویزی شکل دینے کی مثبت کوشش کی گئی ہے۔

دیباچہ یا عرض ناشر والے حصے کو چھوڑ کر رسالہ کل دس حصوں یا ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدا اس رسالے کی جدو جہد آزادی میں اردو صحافت کے کردار سے ہوتی ہے اور اس باب میں تین مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ہر چند کہ آزادی کے تناظر میں نہیں ہے تاہم یہ قلمی یا اخباری صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ دیگر دو مضامین آزادی اور اردو صحافت سے متعلق ہیں۔ 'صحافت کے ستون' کے عنوان سے جو باب قائم کیا گیا ہے اس میں اردو صحافت کے نمائندہ نام شامل ہیں جس میں مولوی باقر سے موجودہ دور کے صحافیوں تک کئی ناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ 'نشیب و فراز اور ارتقا' کے عنوان سے ایک حصے میں اردو صحافت کی مختلف منزلوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'سب کی زبان سب کی صحافت" کا عنوان اردو کے سیکولر مزاج کی غمازی کرتا ہے اور اس باب میں اردو کے غیر مسلم صحافیوں کے ساتھ ساتھ اس میں ترجمے اور طنز و مزاح کی روایت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے' یہ کسی مضمون کی تمہید کا حصہ نہیں بلکہ اس رسالے کا ایک باب ہے جس میں اردو صحافت کا سفرنامہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ آخر اس باب کے مضامین کو 'نشیب و فراز اور ارتقا' والے حصے میں رکھنے میں کیا قباحت تھی۔ "مختلف صوبوں کی صحافت" کی شہ سرخی جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے مختلف صوبوں کی صحافت پر ہی روشنی ڈالے گی تاہم یہ روشنی صرف بہار، اتر پردیش اور کشمیر ہی تک پہونچ پائی جبکہ اردو صحافت میں متحرک کئی دیگر صوبے اس سے محروم رہے۔ 'عصری تقاضوں کے آئینے میں' کے عنوان سے اردو صحافت کو درکار چیلنجوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے طریقوں پر بھی غور کیا گیا ہے۔ 'جدید وسائل اور الکٹرانک میڈیا' کے عنوان سے جو باب قائم کیا گیا ہے وہ دور حاضر میں صحافت کے نئے روپ کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح اردو میڈیا ان نئے مظاہر سے ہم آہنگ ہوسکتی ہے۔ آخری باب 'ادبی صحافت' کے عنوان سے ہے جس میں کل تین مضامین ہیں اور یہ قاری کی تشنگی کو برقرار رکھتے ہیں۔

حقانی القاسمی کا مضمون جو 'ادبی رسائل، انٹرنیٹ اور عالمی منظرنامہ' کے عنوان سے شامل رسالہ ہے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وجہ اس مضمون کے اہم ہونے کی یہ ہے کہ اس مضمون میں عالمانہ انداز میں اردو رسائل و جرائد کے انٹرنیٹ ایڈیشن پر بات کی گئی ہے۔ یہ دور انٹرنیٹ اور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے اور اس دور مجازی میں حقانی القاسمی جیسے لوگ اگر انٹرنیٹ اور سائبر اسپیس پر بات کرتے ہیں تو یہ فعل اردو کی بقا کے لیے فال نیک کہلائے گا۔ شافع قدوائی کا مضمون جو 'عوامی ذرائع ابلاغ کا عصری منظرنامہ' کے عنوان سے شائع ہوا ہے ایک مفید اور معلوماتی مضمون ہے جس میں مختلف ذرائع ابلاغ کا جائزہ لیتے ہوئے ٹی وی کی اہمیت کو سرفہرست رکھا گیا۔ قاری ایک لمحے کو یہ ضرور سوچتا ہے کہ آج کے سب سے بڑے ذریعہ ابلاغ انٹرنیٹ کو اس مضمون میں جگہ ہی نہیں دی گئی لیکن پھر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مضمون فقط روایتی ذرائع ابلاغ کا احاطہ کرتا ہے اور پوری ایمانداری سے کرتا ہے۔

240 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ہر چند کہ قاری کو مکمل طور پر مطمئن نہیں کرتا تاہم رسالہ موٹے گلوسی پیپر پر چھاپا گیا ہے اور دور سے ہی منفرد اور پرشکوہ نظر آتا ہے۔ رسالے کی کمزوری کی بات کریں تو ملک کے دیگر خطوں کے قلمکاروں کی شمولیت اسے مزید بہتر اور افادی بنا سکتی تھی۔ مثال کے طور پر صوبوں کی صحافت کے حوالے سے اگر حیدرآباد، مہاراشٹر، دہلی اور دیگر صوبوں کی صحافتی سرگرمیوں کا احاطہ کیا جاتا تو قاری کو اردو صحافت کے کچھ اور پہلوؤں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع فراہم ہوتا۔ تاہم مجموعی طور پر یہ رسالہ اردو صحافت کی حیثیت اور حسیت کو باور کرانے کی ایک مثبت اور باہمت کوشش ہے جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے۔

■

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P78.jpg 1/1

3/21/2018 P79.jpg (1588×2200)

اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ای ٹی وی اردو چینل کے پروگرام اردو دنیا نے اپنی نشریات کا آغاز ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ پروگرام کے دوران ناظرین کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوا ہے۔ جنوری 2011 سے اب تک کل 56 ایپی سوڈ پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں کونسل کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کونسل کے اردو عربی مراکز کی سرگرمیوں کو بھی ملک و بیرون ملک کے اردو ناظرین کے لیے نشر کیا جاتا ہے۔ کونسل کی کتابوں پر تبصرے، اردو کی اہم اور مقتدر شخصیات اور ادبا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی تفصیلی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا اردو ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو گزشتہ دس برسوں سے ٹیلی ویژن نشریات کی خدمات دیتا رہا ہے اور جنوری 2011 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی ادبی وثقافتی سرگرمیاں بھی ٹیلی ویژن نشریات کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔ ہفتہ وار اردو دنیا سنیچر کی شام آٹھ بجے اور اتوار کی صبح ساڑھے دس بجے نشر کیا جاتا ہے۔ ملک میں اردو کے تئیں بیداری اور حکومت کی پالیسیوں کو اردو عوام تک پہنچانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ٹیلی ایڈیشن کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج برآمد ہورہے ہیں۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' پروگرام کا آغاز ہر ہفتے قومی اردو کونسل سے متعلق خبرنامے سے ہوتا ہے اور اردو کی ترقی وترویج سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین کے ان سوالات کا جواب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے ذمہ داران کے ذریعے دیا جاتا ہے جن کا تعلق قومی اردو کونسل کی اسکیموں اور ان کے نفاذ سے ہوتا ہے 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہر ایپی سوڈ میں اردو اور فلموں کے تعلق سے ایک سوال بھی کیا جاتا ہے اور اس کا صحیح جواب دینے والوں کا نام اگلے ایپی سوڈ میں دکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح 'اردو دنیا' کے ہر ایپی سوڈ میں جہاں اردو زبان وادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے والی کسی ایک اہم شخصیت کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی سفر پر تفصیلی رپورٹ پیش کی جاتی ہے وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اہم کتابوں کا جائزہ بھی اردو ناظرین کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین اپنے تاثرات بھیجنے کے لیے ان ای میل آئی ڈیز کا بھی استعمال کرسکتے ہیں: urducouncil@gmail.com, urduduniya@etv.co.in

جولائی 2012 کی نشریات

7 جولائی 2012 بروز ہفتہ

جولائی کے پہلے ہفتہ کو رات ساڑھے آٹھ بجے 'اردو دنیا' میں پیش کیے جانے والے پروگرام میں صوبہ اترپردیش کے ضلع کانپور نگر کے گھاٹم پور میں انجمن اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام اسلامیہ انٹر کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے چلنے والے کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس پروگرام میں ہی ممتاز ادیبہ ڈاکٹر زینت شوکت علی کے ادبی سفر پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ ڈاکٹر زینت شوکت علی ممبئی کے مشہور سینٹ زیور کالج میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک ممتاز ادیبہ کے ساتھ ورلڈ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز فار ڈائیلاگ کی ڈائریکٹر جنرل ہیں۔

ڈاکٹر زینت شوکت علی

14 جولائی 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں ممبئی کے ماہم میں پیر مخدوم صاحب چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام حضرت بی بی فاطمہ کمپیوٹر ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے اشتراک سے چلنے والے کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی دہلی کے ماہر اسلامیات اور ممتاز ادیب پروفیسر اخترالواسع کے فن وشخصیت پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر اخترالواسع کا شمار ملک اور بیرون کے ملک کے ممتاز ماہر اسلامیات میں ہوتا ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر پروفیسر اخترالواسع کی درجن بھر سے زیادہ کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔

پروفیسر اخترالواسع

21 جولائی 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے 'اردو دنیا' کے خاص ایپی سوڈ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دلی کے اشتراک سے صوبہ بہار کے ضلع نالندہ کے بہار شریف میں نالندہ سماج سیوا آشرم میں چلنے والے کمپیوٹر ایجوکیشن سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی صوبہ اترپردیش کے ضلع مئو کے مشہور ادیب مولانا مبارک حسین مصباحی کے فکر وفن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ مولانا مبارک حسین مصباحی کی مختلف موضوعات پر اب تک 25 کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا مبارک حسین مصباحی

28 جولائی 2012 بروز ہفتہ

جولائی کے آخری ہفتہ میں پیش کیے جانے والے خاص ایپی سوڈ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے اشتراک سے صوبہ گجرات کے پالن پور میں نوتن کیلوانی منڈل کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹر روشن کمپیوٹر اکادمی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی پونہ مہاراشٹر کے ممتاز ماہر تعلیم پی اے انعام دار کی شخصیت اور ان کی تعلیمی سفر پر ایک خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پی اے انعام دار حکومت ہند کی کئی تعلیمی کمیٹیوں کے رکن ہیں۔

پی اے انعام دار

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P79.jpg 1/1

ماریشس میں اردو کا مستقبل بہت روشن ہے: پروفیسر ابن کنول

ممتاز عالم رضوی

پروفیسر ابن کنول کا شمار اردو کے معروف ادیبوں میں ہوتا ہے، گزشتہ چھبیس سال سے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں، شعبہ میں صدارتی فرائض بھی انجام دے چکے ہیں، ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں بوستان خیال ایک مطالعہ، داستان سے ناول تک، تنقید و تحسین، میر امن، باغ و بہار، انتخاب سخن، بندراستے، تیسری دنیا کے لوگ، تحقیق و تدوین، نظیر اکبرآبادی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے امریکہ، انگلینڈ، ماریشس، سعودی عرب اور پاکستان سمیت کئی ملکوں کے سفر کیے ہیں، اردو کے حوالے سے تین بار ماریشس کا سفر کیا، ماریشس میں اردو کی صورت حال پر معروف صحافی ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے پروفیسر ابن کنول سے خصوصی گفتگو کی، جس کے اقتباسات پیش ہیں:

سوال: اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔

جواب: اردو برصغیر سے آگے نکل کر پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ خواہ وہ امریکہ ہو، یوروپ، آسٹریلیا یا افریقہ کے ملک ہوں۔ اردو کے حوالے سے امریکہ، یوروپ اور افریقی ملک ماریشس بھی گیا۔ خلیجی ممالک سعودی عرب یا دبئ وغیرہ گیا، تو مجھے زبان کے اعتبار سے بولنے میں کسی بھی ملک میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اردو میں ہی رابطہ قائم کیا۔ امریکہ میں اردو والے اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ وہاں کئی بڑے شہروں سے جو ہفت روزہ اخبار نکلتا ہے 'اردو ٹائمز' اس کی اچھی خاصی سرکولیشن ہے۔ اسے لوگ خریدتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر میں وہاں اردو کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ان تقریبات میں لوگ شرکت کرنے کے لیے طویل سفر طے کرکے آتے ہیں اور ٹکٹ لے کر ان تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان سے وہاں لوگ گئے ہوئے ہیں وہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہماری جڑیں جس تہذیب سے جڑی ہوئی ہیں، جس زبان سے جڑی ہوئی ہے وہ محفوظ رہے اور سو فیصد نہ سہی لیکن کسی حد تک ہمارے بچوں میں بھی سرایت کر جائے نیز بچے اسے سنبھالیں۔

سوال: کیا اردو کی نئی بستیوں میں نئی نسلیں بھی اردو پڑھ رہی ہیں؟

جواب: کہیں کہیں ایسا ہے کہ بہت سے نوجوان اردو رسم الخط کی بجائے اردو کو رومن میں پڑھتے ہیں۔ انگلینڈ میں یہ چیز بطور خاص دیکھی جا سکتی ہے۔ وہاں ایک دو اخبار بھی ہیں جو رومن رسم الخط میں نکلتے ہیں۔ آپ انٹرنیٹ پر دیکھ لیں کہ جو لوگ بات چیت کرتے ہیں تو اردو رسم الخط میں تو بہت کم لوگ ٹائپ کر پاتے ہیں، رومن میں سب بات چیت چلتی ہے۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ رسم خط بدلے لیکن وہ اردو تو کم از کم بول رہے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مقامی لوگ بھی اردو میں دلچسپی لیتے ہیں اور اردو سیکھتے ہیں۔ آپ روس میں دیکھ لیں۔ میرے طالب علم آسٹریلیا، روس، امریکہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ وہیں کے لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ یعنی انگریز اردو پڑھ رہے ہیں۔ الازہر یونیورسٹی میں باقاعدہ اردو کا شعبہ موجود ہے۔ اردو شعبہ میں اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس وقت جو صدر شعبہ اردو ہیں وہ میرے شاگرد ہیں۔ ان کا نام ہے ڈاکٹر قاضی محمد احمد۔ ماریشس ایک بہت ہی چھوٹا سا جزیرہ ہے اس میں اردو بہت زیادہ فروغ پا رہی ہے، برصغیر کے بعد شاید کوئی ایسا ملک ہو کہ جہاں ماریشس جیسے اردو پڑھنے اور بولنے والے ہوں۔

سوال: موریشس میں اردو کا حال کیا ہے؟

جواب: میں موریشش اب تک تین بار جا چکا ہوں۔ پہلی بار میں 2003 میں گیا تھا جب وہاں عالمی اردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اب آپ اس بات سے اندازہ لگائیں کہ عالمی اردو کانفرنس ماریشس میں ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماریشس میں اردو کے چاہنے والے یا اردو کے عاشقین موجود ہیں۔

ماریشس چھوٹا سا جزیرہ ہے ساؤتھ افریقہ کے پاس، آبادی کل ساڑھے بارہ لاکھ کی ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کی ریاستوں بہار اور اترپردیش سے لوگ روزگار کی تلاش میں وہاں گئے تھے۔ وہاں اردو کے ساتھ ساتھ بھوجپوری زبان بھی فروغ پا رہا ہے۔ وہاں ہندو اور مسلمانوں کی آبادی ہے اور عیسائی اقلیت میں ہیں۔ وہاں اب حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو لوگ برصغیر سے یورپ اور امریکہ گئے ہیں وہ اپنی زبان اور تہذیب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس ملک میں بھی ہندی اور اردو زندہ ہے۔ وہاں کی بہت سی مسجدوں میں اردو میں خطبہ اور تقریریں ہوتی ہیں۔ وہاں پورٹ لوئس میں جو سب سے بڑی جامع مسجد ہے اس کے مولانا جمعہ اردو میں تقریر کرتے ہیں جو ماریشس ریڈیو سروس سے فرینچ میں نشر ہوتی ہے اور محترمہ مریم گوڈڑ اس

ابن کنول ماریشس میں وہاں کی اہم شخصیات سے ملاقات کرتے ہوئے

3/21/2018 P81.jpg (1609×2252)

کا ٹرانسلیشن کرتی جاتی ہیں۔ اردو زبان کو وہاں ابتدا میں مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے ترقی ملی لیکن بعد میں لوگوں نے اس زبان کی طرف توجہ دی اور زبان کو پوری طرح سے سیکھنا شروع کر دیا۔

سوال: وہاں اردو کون کون پڑھتا ہے؟

جواب: وہاں اب مسلمانوں کی زبان اردو سمجھی جانے لگی ہے۔ وہاں بہت سے مولاناؤں کی تقریر اردو میں ہوتی ہے، تو اس طرح اردو زبان مسلمانوں کی شناخت بن گئی ہے۔ ماریشس 1968 میں آزاد ہوا لیکن اس سے پہلے ہی وہاں اردو کی تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ 1957 سے وہاں جامعہ اردو علی گڑھ کا سینٹر ہے۔ اس سینٹر سے کہ ماریشس کے سینکڑوں طالب علم ہر سال ادیب کامل، ادیب ماہر کا امتحان دیتے ہیں۔ ابھی ہم نے وہاں کی کچھ تصویریں دیکھیں جو آج سے 40 یا 45 سال پرانی تھیں جہاں سینٹر میں بچے امتحان دے رہے ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ وہاں علی گڑھ کے ایک استاد تھے عظیم الحق جنیدی جنھوں نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں وہ وہاں گئے اور اردو کے سلسلہ میں کتابیں تیار کر کے دیں۔ ہندوستان کے اسکالر اور علی گڑھ کے استاد ڈاکٹر اطہر پرویز بہت زمانے تک ماریشس میں رہے۔ انھوں نے باقاعدہ وہاں اردو کی تعلیم دی، انھوں نے موریشس میں اردو کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

1968 میں اطہر پرویز صاحب وہاں گئے اور اسی سال سے وہاں کے طالب علم ہندوستان اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے لگے تھے۔ وہاں ایک قاسم ہیرا صاحب ہیں جنھیں ماریشس یونیورسٹی میں جس کا مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ایک حصہ ہے، جہاں اب ایم اے کی سطح تک اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں انھیں شعبہ اردو کا فاؤنڈر مانا جاتا ہے۔ انھوں نے 1968 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا اور بی ایڈ کرنے کے بعد جب وہ واپس اپنے وطن پہنچے۔ وہاں اسکولوں میں اردو شروع کروائی اور پھر کالجوں میں اردو شروع ہو گئی، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ جو کہ ماریشس یونیورسٹی سے ملحق ہے جس میں شعبہ اردو قائم ہوا۔ ایک اور صاحب ہیں عنایت حسین عیدن کہ جن کے ناول 'اپنی زمین' کا ہندوستان میں اجرا بھی ہوا ہے۔ وہ بھی اردو شعبہ کے فاؤنڈرس میں سے ہیں۔ میں جب پہلی بار ماریشس عالمی اردو کانفرنس میں گیا تھا لیکن گزشتہ دو سال سے وہاں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر ایکسٹرنل اکزامنر کی حیثیت سے گیا ہوں۔

ماریشس یونیورسٹی میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ وہاں اردو کے کئی کورسیز ہیں۔ بی اے آنرس، بی اے پاس یعنی دوسرے سبجیکٹ کے ساتھ بھی لوگ اردو ایک مضمون کے طور پر لیتے ہیں۔ گزشتہ سال سے وہاں اردو میں ایم اے بھی شروع ہو گیا ہے۔ ابھی ہم وہاں بات کر کے آئے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ وہاں جلد ماس میڈیا کا بھی کورس شروع کر دیا جائے۔ اردو سرٹیفکیٹ کورس کی بھی ابتدا ہو گئی ہے۔ اس میں تعلیم بالغان کے طور پر اردو سکھائی جائے گی۔ میں نے وہاں کی ایک تقریب میں کہا تھا کہ بہت ممکن ہے آئندہ برسوں میں ہندوستان اور پاکستان سے اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے طالب علم ماریشس آنے لگیں کہ جس طرح آج ماریشس سے لوگ ہندوستان اور پاکستان جاتے ہیں۔

ممتاز صاحب آپ کو حیرت ہوگی کہ وہاں تقریباً 200 اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے جبکہ کل آبادی ساڑھے بارہ لاکھ ہے جیسا کہ شروع میں میں نے بتایا تھا، اردو پڑھانے والے دو سو اسکول دہلی میں بھی نہیں ہیں جبکہ یہاں ڈیڑھ کروڑ کی آبادی ہے۔ دہلی کی آبادی سے کتنی کم ماریشس کی آبادی ہے، لیکن وہاں بڑی تعداد میں اردو کے اسکول ہیں۔ ماریشس کے یہ وہ 200 اسکول ہیں کہ جہاں بچوں کو اردو کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب جہاں ابتدائی تعلیم اردو کی ہو وہاں آپ اندازہ لگالیں کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے بچے آگے چل کر اردو تو بولیں گے۔ اردو پڑھیں گے۔ زبان کو سکھانے یا فروغ دینے کے لیے اگر آپ کی نیت صحیح ہے تو آپ اسکولوں سے اردو شروع کرائیں گے۔

سوال : وہاں اردو کو روزگار سے جوڑنے کا بھی کوئی پروگرام ہے؟

جواب : ہمارے یہاں تو عام طور پر طلبا پی ایچ ڈی کر کے بھی بے روزگار گھومتے ہیں۔ اب کچھ صورت بہتر ہوئی ہے کہ انھیں میڈیا میں نوکریاں ملنے لگی ہیں۔ اردو کے چینل بھی کھل رہے ہیں اور اردو کے اخبارات بھی آ رہے ہیں۔ وہاں ہم نے عام طور پر یہ دیکھا کہ وہاں بی اے کا طالب علم بھی ہے تو اس کی ملازمت اسکول میں لگ جاتی ہے۔ کہیں نہ کہیں وہ کام پر لگ جاتے ہیں۔ ہو سکتا کہ مستقبل میں ان کو کچھ پریشانیاں ہوں کہ جب زیادہ تعداد میں بچے پڑھ کر نکلیں گے لیکن اس کا جواز یہ بھی ہے کہ اسکول بھی اسی تعداد میں بڑھتے چلے جائیں گے۔ وہاں ابھی ملازمت کی مشکل نہیں ہے۔ یہاں سے جو طالب علم اردو پڑھ کر جاتا ہے اسے وہاں نوکری مل ہی جاتی ہے۔ جو ایم اے اور بی اے کر کے گئے ہیں وہ وہاں ٹیچر ہیں۔

سوال : وہاں میڈیا کی کیا صورت حال ہے؟

جواب : وہاں ٹیلی ویژن پر اور ریڈیو پر، ایم بی سی یعنی ماریشس براڈ کاسٹنگ کارپوریشن ہے جس میں اردو کے پروگرام آتے ہیں اور ریڈیو پر بھی اردو کے پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے ہیں۔ وہاں باقاعدہ بزم کی طرز پر پروگرام آتا ہے جس طرح ہمارے یہاں دور درشن پر بزم کے نام سے ادبی پروگرام ہے۔ وہاں اس کا نام انجمن رکھا گیا ہے۔ اس پر انٹرویوز ہوتا ہے اور یہ ہر جمعہ کو نشر ہوتا ہے۔ جو ہندوستان سے لوگ جاتے ہیں انھیں بھی وہاں بلایا جاتا ہے اور ان کا انٹرویو ہوتا ہے۔ اس پر شعر و شاعری کا بھی سلسلہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں دو انسٹی ٹیوٹ ہے۔ ایک ہے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ ہے جس کے قیام کو 40 سال ہو گئے ہیں، ابھی ان لوگوں نے 40 سالہ جشن بھی منایا ہے۔ وہاں ایک بہت بڑے سرمایہ دار تھے عبداللہ احمد صاحب جو 1926 میں گجرات سے وہاں منتقل ہوئے تھے، انھوں نے اس انسٹی ٹیوٹ کو قائم کیا تھا وہ اس کے سرپرست تھے۔ عنایت حسین عیدن، فاروق بوچا، قاسم ہیرا، صابر گوڈر یہ لوگ وہاں پر ہیں جنھوں نے اس انسٹی ٹیوٹ کو قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام نہ صرف یہ کہ ادبی پروگرام کرتے ہیں بلکہ مشاعرے اور کانفرنسز بھی کرتے ہیں۔ طالب علموں کو امتحانات بھی دلاتے ہیں اور ان کی تیاری بھی کراتے ہیں، کوچنگ کلاسیز کراتے ہیں۔ 2003 میں جب عالمی اردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی اور ہندوستان سے اس میں شرکت کرنے کے لیے بڑی تعداد میں لوگ گئے تھے، دوسرے ملکوں سے بھی لوگ آئے تھے۔ وہاں پر ان لوگوں نے اردو اسپیکنگ یونین قائم کی۔ یہ یونین عبداللہ احمد کے سرپرستی میں قائم ہوئی تھی کہ جن کا حال ہی انتقال ہو گیا ہے۔ اب اردو اسپیکنگ یونین کے صدر شہزاد عبداللہ ہیں جو کہ عبداللہ احمد کے بیٹے ہیں۔ وہ بہت فعال ہیں۔ ان کی اپنی لائبریری ہے اور ان کا ایک باقاعدہ اخبار نکلتا ہے جس کا نام صدائے اردو ہے۔ وہ کتابیں بھی چھپواتے ہیں۔ اردو اسپیکنگ یونین کو حکومت سے تعاون بھی حاصل ہے۔

سوال: وہاں کے مدرسوں میں اردو کی کیا صورت حال ہے؟

جواب: میں نے شروع میں یہ بات کہی تھی کہ وہاں اردو کی ابتدا ہوئی تھی تو وہاں اردو کو مذہبی زبان سمجھ کر لکھنا، پڑھنا اور بولنا شروع کیا تھا۔ تو وہاں کے مدرسوں میں بھی ہندوستان اور پاکستان سے مولوی حضرات جاتے ہیں اور

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P81.jpg 1/1

اردو کی تعلیم دیتے ہیں۔ جب ہماری ملاقات وہاں کے مولویوں سے ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان سے ہی گئے ہوئے ہیں۔ وہ ماریشس میں قرآن مجید بھی پڑھاتے ہیں اور اردو کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔

سوال :ماریشس میں اردو کا مستقبل؟

جواب :ماریشس میں بطور خاص مجھے اردو کا مستقبل بہت روشن نظر آ رہا ہے۔ گزشتہ سال جب میں ماریشس یونیورسٹی میں گیا تھا تو تقریباً پچاس طالب علم بی اے آنرس کے تھے۔ پچاس طالب علم ایک بڑی تعداد ہے۔ ان طالب علموں کی میں نے کاپیاں بھی دیکھیں اور ان کے لکھے ہوئے ڈیزرٹیشن دیکھے، وہ کسی بھی طرح ہمارے طالب علموں سے کمزور نہیں تھے۔ سوائے اس کے کہ ان میں کچھ اسپیلنگ کی غلطیاں تھیں، کچھ تذکیر و تانیث کا معاملہ تھا، وہ ہمارے یہاں بھی ہے۔ ہمارے یہاں آپ دیکھئے کہ جو دوسرے صوبوں سے طالب علم آتے ہیں ان کے یہاں اسپیلنگ کی غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور تذکیر و تانیث کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ تو ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ اس بار جب وہاں ایم اے، شروع ہوا تو پہلے ہی سال میں وہاں ایم اے میں 11 طالب علم تھے جبکہ وہاں وہ کورس سیلف فائنانسنگ ہے اور طالب علم کی 80 ہزار روپیے فیس ہے اس کے باوجود وہاں پہلے سال میں ایم اے کے طالب علموں کی اتنی تعداد تھی۔ مجھے پوری امید ہے کہ آئندہ برسوں میں یہ تعداد اور بڑھے گی۔ وہاں جو لوگ اردو کے فروغ کے لیے کوشش کر رہے ہیں ان کی نیت صاف ہے۔

سوال : وہاں کے لوگوں کی تہذیب اور طور طریقوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب :میں نے وہاں ایک چیز دیکھی کہ ان لوگوں کے اندر خلوص بہت ہے۔ وہ لوگ مہمان نواز بہت ہیں۔ وہاں کے خواہ اردو والے ہوں یا ہندی والے ہوں، ان کے اندر محبت بہت پائی جاتی ہے۔ ویسے تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ دنیا کے خوبصورت ترین جزیروں میں سے ایک ہے۔ مجھے نام تو یاد نہیں ہے لیکن کسی انگریز نے وہاں کہا تھا کہ شاید ماریشس کو دیکھنے کے بعد اللہ نے جنت بنائی ہوگی۔

سوال :کیا ماریشس میں بھی ادبی نشستوں اور محفلوں کی روایت ہے؟

جواب :ہاں وہاں پر بھی ادبی نشستوں اور ادبی محفلوں کا چلن ہے۔ وہاں لوگ نشستیں بھی کرتے رہتے ہیں اور مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ ادبی شامیں بھی ہوتی ہیں۔ مذہبی جلسے بھی ہوتے ہیں۔ میلاد اکبر جو ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے، وہاں بھی خوب مشہور ہے۔ ظاہر ہے انھیں چیزوں سے زبانیں زندہ رہتی ہیں۔ دیکھئے! کوئی بھی زبان ہوا سے سرکار نہیں بلکہ عوام زندہ رکھتی ہے۔ میں نے اپنے ایک بیان میں کہا بھی تھا اردو سرکار کی وجہ سے زندہ نہیں ہے بلکہ اپنی طاقت کی وجہ سے زندہ ہے۔ سرکاری سطح پر اکیڈمیاں بنا دی جائیں یا کچھ بھی لیکن اس سے زبان زندہ نہیں رہے گی۔ اردو تو اپنی تہذیب، اپنی شیرینی، اپنی لچک، اپنی نرمی، اپنے لہجہ کی وجہ سے زندہ رہے گی۔ یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے ہماری اردو زبان آج دوسرے ملکوں میں بھی مقبول ہو رہی ہے۔

■

Mumtaz Alam Rizvi,3/121,Lalita Park, Laxmi Nagar, New Delhi

امریکہ

اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی

واشنگٹن: امریکہ میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے وہاں اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں بھی کمی آ رہی ہے۔ جس کی وجہ ہے جنوبی ایشیائی تارکین وطن کی نئی نسل کی اس زبان میں عدم دلچسپی۔ انھیں اردو زبان و ادب اور ثقافت سے روشناس کرانے کے لیے ریاست ورجینیا میں اردو انجمن کے نام سے ایک تنظیم کام کر رہی ہے۔ واشنگٹن کے قریبی علاقے برک ورجینیا کی ایک لائبریری میں ہر مہینے اردو سے محبت کرنے ولوں کی ایک محفل منعقد ہوتی ہے۔ اس انجمن کو قائم ہوئے اب دو سال ہو چکے ہیں اور گزشتہ دنوں اردو انجمن کے قیام کی دوسری سالگرہ منائی گئی۔ سوسائٹی آف اردو لٹریچر کی بنیاد ابوالحسن نغمی اور ان کی اہلیہ یاسمین نغمی نے ریاست ورجینیا کے شہر برک کی ایک لائبریری میں رکھی تھی۔ جہاں اس کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں آ کر بسنے والے پاکستانیوں کی نئی نسل اردو بول تو لیتی ہے لیکن انھیں اردو میں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ ابوالحسن نغمی کہتے ہیں کہ ہمارے بچے ہیں وہ مشاعروں سے دور بھاگتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ ایسا کون سا طریقہ اختیار کریں کہ ہمارے بچے نہ صرف اردو بولیں بلکہ بائی لینگول بھی ہوں۔ یاسمین نغمی کہتی ہیں پہلے ہم نے اپنے بچوں کو آگے بڑھایا۔ رومن میں لکھ کر انھیں کہا کہ بولو۔ ہمارے بچے گھر میں تو اردو بولتے ہیں لیکن لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ پھر ہم نے اور بچوں سے اس ادبی محفل میں آنے کے لیے کہا۔ اب ہر محفل میں دو بچے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو نئے ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر مصنف اکمل علیمی کا کہنا تھا کہ کثیر تعداد میں تارکین وطن کی آمد نے امریکہ کو ایک ایسا مرکز بنا دیا ہے جس میں مختلف ملکوں، ثقافتوں اور زبانوں کے رنگ موجود ہیں اور پاکستانی بھی یہاں اپنا ثقافتی ورثہ بچا سکتے ہیں۔ جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں رضاکارانہ طور پر اردو سکھانے والے معظم صدیقی کہتے ہیں کہ وہ امریکہ میں اردو کے مستقبل کو اتنا تابناک نہیں دیکھتے۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں تک امریکہ میں اردو کے مستقبل کا تعلق ہے، امریکہ میں اس پر بہت کام ہوا ہے لیکن زیادہ تر کام مشاعروں کی حد تک رہا ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی 22 مئی 2012

3/21/2018 P83.jpg (1609×2304)

اردو روزنامہ کی بحرین اور قطر سے اشاعت

حیدرآباد: درون ہند حیدرآباد اور بنگلور کے علاوہ کئی شہروں میں اردو اخبارات پڑھنے والوں کی ضرورت کامیابی کے ساتھ پوری کرنے کے بعد اردو روزنامہ 'سیاست' نے بحرین اور قطر سے بھی ایک ساتھ اپنی اشاعت شروع کردی ہے۔ اس طرح مشرق وسطی میں اردو والوں کی دیرینہ ضرورت کی تکمیل ہوئی ہے۔ موقر اشاعتی گھرانہ دارالشرق کے اشتراک سے ہفت روزہ سیاست کی اشاعت شروع کی گئی ہے۔ یہ اطلاع روزنامہ سیاست کی طرف سے جاری ایک ریلیز میں دی گئی ہے۔ اخبار کے مدیر عامر علی خان اس موقعے پر وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی چونسٹھ سالہ اشاعتی زندگی میں سیاست نے کامیابی کے ساتھ مشرق وسطیٰ میں اپنے قاریوں تک رسائی حاصل کی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اخبار اپنے قاریوں کی ضرورت کو پوری کرے گا۔ اس موقعے پر قطر میں ہندوستانی کونسل خانے کو کونسلر دیپا گوپالن ودھوا اور پاکستانی کونسلر سرفراز اے خان زادہ نے اپنی نیک تمنائیں پیش کیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 مئی 2012

عباس اور جیکب کی جوڑی اردو کے تحفظ کے لیے سرگرداں

نئی دہلی: اردو والوں کے بین سرحدی پھیلاؤ نے کل جہاں حضرت داغ کو یہ کہنے کی تحریک دی تھی کہ 'سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی' وہیں برصغیر سے یورپ امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ہجرت کرجانے والے یا اردو گھرانوں کی نئی نسل کے لیے اب یہ زبان اجنبی بنتی جارہی ہے۔ اطلاعاتی ٹکنالوجی سے وابستہ ایک پاکستانی نے اس احساس کے کرب کو اس وقت شدت سے محسوس کیا جب اسے اپنی تین سالہ بیٹی کی غیراردو شناخت کا ادراک ہوا۔ سید عباس نامی اس شخص نے سات سال پہلے اپنے اس درد کا درماں کرنے کا قدم اٹھایا تو اردو حلقوں میں ہر قدم پر انھیں مایوسی ہاتھ آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہار جاتے سنیل جیکب نامی ایک ہندوستانی کی مسیحائی نے ان کے عزم کو ٹوٹنے سے بچالیا۔ اس محاذ پر اپنی ذمے داری کو محسوس کرتے ہوئے عباس نے اپنی پیشہ ور بیوی کو اعتماد میں لیا اور اس فیصلے کے ساتھ ملازمت چھوڑ دی کہ بیوی گھر چلائے وہ بیرون برصغیر ملکوں میں اردو گھرانوں کی نئی نسل کو اپنی تہذیبی زبان سے جوڑنے کا نصاب تیار کرے۔ ایک انگریزی روزنامہ میں شائع رپورٹ کے مطابق اس طرح سات سال پہلے عباس نے اردو کی عالمی بقا کے محاذ پر جو بیڑا اٹھایا تھا وہ ایک سال قبل اردو ایٹ ہوم ڈاٹ آرگ، کی شکل میں سیلی کون ویلی کا اٹوٹ حصہ بن چکا ہے جس کے ذریعے ویب سائٹ پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔ سنیل جیکب کی عباس سے ملاقات اس وقت ہوئی جب سنیل بھی اپنی مادری زبان ملیالم کے حوالے سے کچھ اسی طرح کی سوچ میں غلطاں تھا۔ سنیل جو کوچی کے رہنے والے ہیں، غزلوں اور ٹی وی پر پیش کیے جانے والے اردو پروگراموں کی وجہ سے زلف اردو کے اسیر ہوگئے تھے۔ اس طرح دونوں کی ملاقات اردو کے حق میں باہمی اشتراک کی سنگ میل ثابت ہوئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 جون 2012

سعودی عرب

ثروت زیدی بھوپالی کے شعری مجموعہ بندگی کے بعد بھی کی تقریب رونمائی

سعودی عرب کے شہر جبیل میں مقیم نامور اردو شاعر ثروت زیدی بھوپالی کے شعری مجموعہ 'بندگی کے بعد بھی' کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا گیا، تقریب کی صدارت کہنہ مشق شاعر سجاد سید نے کی، مہمانِ خصوصی کی نشست پر نامور پر سماجی شخصیت مشتاق حسین بلوچ تشریف فرما تھے، جب کہ مہمانِ اعزازی کی نشستوں پر صاحب جشن ثروت زیدی بھوپالی اور مرزا حسن علی متمکن تھے، نظامت ہر دلعزیز شاعر باقر نقوی نے کی۔ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی، پہلے حصے میں ثروت زیدی بھوپالی کے فن پر روشنی ڈالی گئی جب کہ دوسرے حصے میں شاندار محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد صاحب صدر سجاد سید نے کتاب کی رسم رونمائی ادا کی، مشتاق حسین بلوچ نے اعزازی شیلڈ پیش کی، شجاع الرحمٰن انور نے معروف شاعر (حالیہ مقیم ہندوستان) سعید منتظر کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے ثروت زیدی بھوپالی کے ساتھ اپنی قدیم رفاقتوں کا ذکر کیا۔ محمد ایوب صابر نے ثروت زیدی بھوپالی کے فن پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ثروت زیدی بھوپالی شعریت کے اعتبار سے انتہائی صاحب ثروت ہیں۔ برسوں پر محیط ان کا ادبی سفر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے، مشتاق حسین بلوچ نے ثروت زیدی بھوپالی کی ادبی کاوشوں کو سراہا، سجاد سید نے اپنے صدارتی کلمات میں سعودی عرب کے ادبی ماحول پر خوشی کا اظہار کیا۔ شعری نشست میں سعید گستاخ، روشن علی، ظفر ہاشمی، باقر نقوی، شجاع الرحمٰن انور، عقیل آصف، شیراز مہدی ضیا، باقر عباس فائز، محمد ایوب صابر، قدسیہ ندیم لالی، سجاد سلیم، طارق محمود طارق، اقبال احمد قمر، ثروت زیدی بھوپالی اور سجاد سید نے اپنا کلام پیش کیا، پرتکلف عشائیے پر یہ یادگار محفل اختتام پذیر ہوئی۔

پریس ریلیز، رپورٹ: محمد ایوب صابر، جون 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P83.jpg 1/1

3/21/2018 P84.jpg (1594×2238)

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قانونی کتابوں کی اشاعت پر کونسل کی پیش رفت: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دھلی: قومی اردو کونسل 13-2012 کے لیے ایک نیا لائحہ عمل طے کر رہی ہے کیوں کہ کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں ہونے والی تمام قومی سطح کی سرگرمیاں، پینلوں اور کمیٹیوں کے ذریعے کرتی آئی ہے۔ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں Law-Panel کی ایک اہم

میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ اس میٹنگ کے دو اہم مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ کونسل قوانین اور انسانی حقوق سے متعلق کتابوں کی اشاعت میں اور نیا کیا کیا جاسکتا ہے۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ قومی اردو کونسل قانونی کتابوں کی اشاعت اور نئے پراجیکٹس پر توجہ دے رہی ہے۔ اس سال خاص طور سے ڈاکٹر طاہر محمود صاحب کی مسلم قانون قابل ذکر ہے، جس کا اردو ترجمہ جلد ہی قومی اردو کونسل سے شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ 'مسلمانوں سے متعلق قوانین کے حوالے سے سپریم کورٹ کے آٹھ ایسے فیصلے جو ایک عام مسلمان کے لیے جاننے ضروری ہیں، ترجمے کے آخری مرحلے میں ہیں۔ کچھ اور کتابیں مثلاً اقلیتوں کے تعلیمی حقوق، ہندوستانی نظام قانون اور Law-Dictionary جیسے اہم پراجیکٹس زیر غور ہیں۔ وزارت قانون کی جانب سے قومی اردو کونسل کو اردو میں Nine-Bare Acts مہیا کرائے گئے ہیں، جن کو کونسل شائع کر چکی ہے، جو اس طرح ہیں:

نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی ایکٹ 2008، دی ڈرگس کنٹرول ایکٹ 1950، ان اور گنائزڈ ورکرس سوشل سیکوریٹی ایکٹ 2008، دی پروہی بشن چائلڈ میرج ایکٹ 2006، دی نیشنل کمیشن فار مائناریٹی ایجوکیشن انسٹی ٹیوشن ایکٹ 2004، دی سینٹرل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن (ریزرویشن ان ایڈمشن) ایکٹ 2006، دی ڈائجسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2005، دی گرام نیالیز ایکٹ، 2008، دی گورنمنٹ سیکوریٹیز ایکٹ 2006

قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ پر جج کمیٹی ایکٹ 2002، رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ 2005، کمیشن فار پروٹیکشن آف چائلڈ رائٹس ایکٹ 2005، دی پروٹیکشن آف وومین فروم ڈومیسٹک وائلنس ایکٹ 2005 کو دیکھا جاسکتا ہے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 مئی 2012

قومی اردو کونسل اردو صحافیوں کے لیے سری نگر میں جولائی میں ایک ورکشاپ کا اہتمام کرے گی: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دھلی: اردو اخبارات کی جرأتوں اور جدتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ہم اُردو اخبارات کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُردو صحافیوں کے لیے ایک ایسا قلیل مدتی کورس شروع کرنے جا رہے ہیں جو ماس میڈیا کی کچھ خاص ضرورتوں کا احاطہ کرے گا جس میں خبر نگاری اخبار کا صفحہ ترتیب دینا، پیج میکنگ، ترجمہ نگاری کو فوقیت دی جائے گی۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ماس میڈیا پینل کی ایک اہم میٹنگ میں کیا۔

سال 2013-2012 میں ماس میڈیا پینل کی اس میٹنگ کا مقصد سال 2011 میں ہوئے صحافیوں کی صلاحیت سازی کے قلیل مدتی کورس کی اُس کامیاب کوشش کو ایک بار پھر نئے عزم اور جوش سے عصری ضرورتوں کے مطابق شروع کرنا ہے۔ بقول ڈائرکٹر اس طرح کی پہلی باقاعدہ ورکشاپ کی شروعات سری نگر سے کی جائے گی اور پھر اِس تجربے کے مدنظر ہندوستان کے کچھ اور اہم شہروں کا احاطہ کیا جائے گا جن میں لکھنؤ، ممبئی، کلکتہ، حیدرآباد اور پٹنہ جیسے شہر شامل ہوں گے۔ اس میٹنگ کے ایک اہم فیصلے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ماس میڈیا اور جرنلزم کے مخصوص شعبے مثلاً الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، ویب جرنلزم کے لیے ماس میڈیا کے ماہرین اور صحافیوں پر مشتمل کمیٹیاں تشکیل دی جائیں گی۔ میٹنگ کی صدارت کر رہے جناب شافع قدوائی نے کہا کہ اُردو صحافیوں کے لیے کسی بھی ورکشاپ کو ترتیب دیتے وقت ترسیل کی بنیادی باتوں مثلاً تاریخ سے واقفیت، اسلامی تاریخ، حالات

حاضرہ پر گہری پکڑ، موجودہ سیاسی نظام سے باخبری، اس وقت کے اُردو صحافیوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر نارتھ جناب شکیل حسن شمسی نے کہا کہ اخباری صحافت کے لیے خبر نگاری، پیج میکنگ، کا جاننا بہت ضروری ہے۔ 'راشٹریہ سہارا' اُردو کے، ایڈیٹر انچارج جناب اسد رضا نے کہا کہ اُردو کے ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے اخبار کو بھی کام کرنے کے لیے کامیاب اخبارات کے طریقوں کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس میٹنگ میں 'چوتھی دنیا' اردو کی مدیر محترمہ وسیم راشد، 'رہنمائے دکن' کے مدیر اعلیٰ جناب سید وقار الدین، جناب بشارت احمد جناب فاروق ارگلی اور جناب اسلم جمشید پوری وغیرہ نے بھی تبادلۂ خیال کیا اور اس ورکشاپ کے تعلق سے اہم تجاویز پیش کیں۔

اس اہم میٹنگ میں جناب حسن شجاع ایڈیٹر روزنامہ صحافت، جناب معصوم مرادآبادی ایڈیٹر روزنامہ جدید خبر، جناب افضل مصباحی، جناب نور اللہ خاں، جناب توحید خاں، ڈاکٹر قیصر شمیم، جناب منصور عثمانی، کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، ریسرچ آفیسر جناب کلیم اللہ، آر اے جناب قاسم انصاری اور پی آر او محترمہ آبگینہ نے بھی شرکت کی۔ پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 مئی 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P84.jpg 1/1

3/21/2018 P85.jpg (1603×2243)

مرکزی حکومت اقلیتوں کی تعلیمی وفلاحی اسکیموں کے نفاذ کا ازسرِنو جائزہ لے گی: کپل سبل

نئی دہلی: مرکزی حکومت اقلیتوں کی تعلیمی وفلاحی اسکیموں کے نفاذ کے سلسلے میں مزید پیش رفت کرے گی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے حکومت نے قومی نگراں کمیٹی کی پانچ ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی ہیں۔ ان میں ایک کمیٹی معروف دانش ور وسماجی کارکن پی اے انعامدار کی سربراہی میں تشکیل دی گئی ہے۔ اس کی پہلی میٹنگ وزیر برائے

دائیں سے ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، پی اے انعامدار، وزیر کپل سبل، شفیع دہلوی اور پشپندر سنگھ

فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل کے ساتھ ہوئی۔ کمیٹی اقلیتوں کی فلاحی اسکیموں کے نفاذ کی نگرانی کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔ اس حوالے سے یہ کمیٹیاں جلد ہی اقلیتوں کے دبدبے والے نوے اضلاع کا دورہ کریں گی تاکہ اقلیتیں اپنی فلاحی اسکیموں کے تئیں بیدار بھی ہوسکیں اور ان علاقوں میں مزید سہولیات فراہم کی جاسکیں۔

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے دہلی میں کمیٹی کے اراکین کے ساتھ ہوئی ایک میٹنگ کے دوران کہا کہ وزیراعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت بہت سی تعلیمی اسکیمیں اقلیتوں کے لیے چلائی گئی ہیں۔ ان اسکیموں کی پیش رفت پر قومی نگراں کمیٹی کو حکومت کو رپورٹ پیش کرے گی تاکہ رپورٹ کی روشنی میں حکومت موثر اقدام کرسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کمیٹیاں نوے اقلیتی اکثریتی اضلاع کا دورہ جلد ہی کریں گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت کام کرنے والی قومی نگراں کمیٹی کے صدر پی اے انعامدار اور کونسل ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے علاوہ کمیٹی کے رکن شفیع دہلوی و پشپندر سنگھ نے بھی اس میٹنگ میں شرکت کی اور وزیر موصوف کے اس قدم کی بھرپور ستائش کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے حکومت کے اس قدم کو تاریخی قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ کونسل میں اس سلسلے میں اراکین کی میٹنگ جلد ہی کونسل کے زیراہتمام منعقد ہوگی جس میں نوے اقلیتی اضلاع کے دورے کی جامع حکمتِ عملی تیار کی جائے گی، انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کی پسماندگی کو دور کیے بغیر ملک ترقی نہیں کرسکتا اور حکومت بھی اس بات کو لے کر سنجیدہ ہے۔

کمیٹی کے صدر پی اے انعامدار نے بھی قومی نگراں کمیٹی کی تشکیل کو ایک بڑا قدم قرار دیا اور کہا کہ مرکزی حکومت نے اقلیتوں کی تعلیم وروزگار کے متعلق بڑے پیمانے پر اسکیمیں بنائی ہیں لیکن ان اسکیموں کا خاطر خواہ فائدہ اقلیتوں کو نہیں مل سکا ہے۔ کمیٹی کے رکن پشپندر سنگھ اور شفیع دہلوی نے بھی اپنا سرگرم تعاون پیش کرنے کی بات کہی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 مئی 2012

قومی اردو کونسل فارسی زبان کی ترویج وترقی کے تئیں سنجیدہ: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

نئی دہلی: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نے خود کو صرف اردو تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اردو سے جڑی دوسری زبانیں عربی اور فارسی بھی اس کے مشن کا حصہ ہیں۔ کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ عوام تک یہ پیغام پہنچنا بہت ضروری ہے کہ قومی اردو کونسل جس طرح اردو کے لیے کام کررہی ہے اسی طرح وہ فارسی زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بھی سنجیدہ ہے۔

پروفیسر سید عین الحسن کی صدارت میں قومی کونسل نے فارسی زبان کی ترویج وترقی کے لیے ایک پینل تشکیل دیا ہے جس کی ایک اہم میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ یہ پینل اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا دیگر زبانوں سے رشتہ اور عصری ضرورتوں کے پیش نظر نئی جہتوں پر غور کرے گا۔ خاص طور پر فارسی کی درسی کتابوں کی اشاعت وتدوین اس ایجنڈے کا ایک اہم مقصد

ہے۔ اس میں تدوین لغت (Lexicography)، قواعد لہجے اور لولیوں کا مطالعہ جیسے پراجیکٹ شامل ہیں۔ کونسل نے اب تک جن موضوعات پر کتابیں شائع کی ہیں۔ وہ اس طرح ہیں:

(1) منتخب التواریخ (تین جلدیں)
(2) تزک جہانگیری (دوجلدیں)
(3) فارسی اردو ادبیات کے چند پہلو
(4) ہند ایرانی ادبیات (چند مطالعے)
(5) منتخب اللغات۔

فارسی پینل کی 13-2012 میں ہوئی پہلی میٹنگ میں فارسی زبان کے تحت منصوبوں کی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا۔ پینل میں موجود فارسی زبان وادب کے ماہرین نے کچھ اہم تجاویز بھی پیش کیں۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 مئی 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P85.jpg 1/1

3/21/2018 P86.jpg (1584×2243)

اقلیتوں کی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے مرکزی حکومت کا ریمیڈیل کلاسیز شروع کرنے کا فیصلہ: کپل سبل

اردو زبان اور اردو اساتذہ کا ایک نیشنل رجسٹر تیار کرنے کا منصوبہ

دائیں سے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سیدہ بلگرامی امام، ماجد دیوبندی، مرکزی وزیر کپل سبل، پروفیسر اختر الواسع، وزیر مملکت ای احمد، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور سید حسن شجاع

نئی دهلی: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل نے اقلیتوں کے تعلیم اور روزگار سے جڑے مسائل اور ان کے حل کے لیے چل رہی اسکیموں کے نفاذ کو لے کر سنجیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اقلیتوں کے مسائل سے بے خبر نہیں ہے۔ جلد ہی ST/SC کی طرز پر اقلیتوں کے لیے اضافی کلاسیس چلائی جائیں گی۔ مرکزی حکومت کے ایک اہم فیصلے کے تحت اقلیتوں کے لیے Remedial Classes کی تجویز پر فیصلہ لیا گیا ہے۔

پروفیسر اختر الواسع کی قیادت میں حکومت کی قومی نگراں ذیلی کمیٹی کے ایک وفد نے مرکزی وزیر جناب کپل سبل سے ملاقات کی۔ اس کمیٹی نے مرکزی وزیر سے مطالبہ کیا کہ حکومت کی جانب سے چلائی جارہی اقلیتی اسکیموں کی زمینی حقیقتوں کی جانب توجہ دی جائے اور ایک ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس میں قومی اردو کونسل حکومت اور عوام کے بیچ کلیدی رول ادا کرے۔

اس سلسلے میں ان ذیلی کمیٹیوں کی کئی اہم میٹنگ میں منعقد ہوئیں، پہلی میٹنگ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں ذیلی کمیٹی برائے فروغ اردو زبان اور اقلیتوں کے انگریزی زبان سے تال میل کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی سے متعلق تھی۔ اس میٹنگ میں پروفیسر اختر الواسع، جناب سید حسن شجاع، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، پروفیسر ایس آر قدوائی، محترمہ سیدہ بلگرامی امام (ممبر نیشنل کمیشن فار مائناریٹی) نے اقلیتوں کے تعلیمی مسائل پر گفتگو کی۔

دوسری میٹنگ میں دو اہم ذیلی کمیٹی کے ممبران کے سات رکنی وفد نے جناب کپل سبل، جناب ای احمد (وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل)، جناب امیت کھرے (جوائنٹ سکریٹری) اور دیگر اہم افسران سے ملاقات کی۔ وفد نے اقلیتوں کی صورت حال سے روشناس کرایا تو حکومت نے فیصلہ لیا کہ Bihar, Jharkhand, UP اور مغربی بنگال کا فوری دورہ کیا جائے گا۔ اس سارے نظم و نسق کی ذمے داری کونسل کو سونپی گئی ہے اور یہ پانچوں ذیلی کمیٹیاں کونسل کے تعاون سے کام کریں گی۔

واضح رہے کہ قومی اردو کونسل، اردو زبان و ادب کے فروغ اور ترویج وترقی کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔

مرکزی وزیر نے کونسل نے بجٹ میں اضافہ کرنے اور مزید جگہ فراہم کرنے کے لیے متعلقہ افسران کو بھی ہدایت جاری کی ہیں۔ اردو کو National Vocational Framework میں لانے کے لیے اقلیتوں میں Vocational Education کو فروغ دینا بہت ضروری ہے اس لیے اقلیتی علاقوں میں ITI کھولنے اور ہنر مندی کے کورسز جلدی ہی شروع کیے جائیں گے۔ دسویں اور بارہویں جماعت کے بعد طلبہ کو سول انجینئرنگ، ماس کمیونکیشن، صنعت و حرفت سے جڑے ڈپلومہ کورسز اور انٹرنشپ کا انتظام کیا جائے گا تاکہ اردو سے جڑی اقلیت کو روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ حکومت نے سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کے ڈپلومہ شروع کرنے پر بھی زور دیا ہے۔

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے اقلیتوں کے لیے بنائی گئی پالیسیوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان بھر میں چل رہے کونسل کے Centre، جو کمپیوٹر، اردو لرننگ، عربک کے ڈپلومہ چلا رہے ہیں اور کونسل کے پاس پہلے سے موجود Networking ہے جس کے ذریعے ہر ایک اضلاع میں علاقائی سطح پر اقلیتی پالیسیوں کا نفاذ آسان ہوسکتا ہے۔

پروفیسر اختر الواسع نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کی اردو زبان وادب کے سلسلے میں کارگزاریوں سے اردو زبان سے جڑے اقلیتوں کے تعلیمی معیار میں بہت بڑی نہ صحیح لیکن نمایاں تبدیلی دکھائی دے رہی ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ عوامی سطح پر کونسل کی پالیسیاں اثر کر رہی ہیں۔ اس لیے قومی اردو کونسل Falicilator کا رول بخوبی نبھا سکتی ہے لیکن وسائل کی کمی کے باعث ابھی پوری طور پر اقلیتوں کو ان کے تعلیمی حقوق نہیں مل پا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان اور اردو اساتذہ کا ایک نیشنل رجسٹر تیار کرنے، مدارس کے اساتذہ کے لیے Training پروگرام کے ذریعے کونسل فلاحی اسکیموں کا نفاذ کرنے، ٹریننگ کے لیے یونیورسٹیوں اور اکیڈمیوں سے تال میل کرنے، پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کرنے، انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کو اختیاری مضمون کے طور پر اہمیت دینے جیسے تعلیمی امور پر کونسل اہم رول ادا کرسکتی ہے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 مئی 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P86.jpg 1/1

3/21/2018 P87.jpg (1624×2239)

مشترکہ تہذیبی سرمائے میں ہماری کتنی حصے داری ہوگی: پروفیسر وسیم بریلوی

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں اسلامک اسٹڈیز پینل کی پہلی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔

اسلامک اسٹڈیز کے پینل کا قیام نہ صرف اردو زبان کے فروغ میں اسلامک اسٹڈیز کی اہمیت وافادیت کو واضح کرنا ہے بلکہ مشترکہ تہذیبی سرمایہ میں اردو کے فروغ کی کتنی حصے داری ہونی چاہیے؟ یہ بھی طے کرنا ہے۔ ان ابتدائی کلمات سے پروفیسر وسیم بریلوی نے اس اہم میٹنگ میں آئے ہوئے علماء حضرات اور دیگر زبانوں کی ماہرین اور علمی وادبی شخصیات کا خیر مقدم کیا۔

اسلامک اسٹڈیز ہماری مشترکہ تہذیبی وراثت کی ترجمانی کے لیے ایک اہم موضوع ہے جسے ہم نظرانداز نہیں کرسکتے اور نہ ہی کرنا چاہیے، ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کیا۔ انھوں نے شرکا کے سامنے کونسل کے منشور کو واضح کرتے ہوئے کئی اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ اسلامک اسٹڈیز پینل کے چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ اسلامک اسٹڈیز سے ہماری مراد صرف متن تک نہیں ہے بلکہ ہم متن کو سیاق کے ذریعے بھی دیکھیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کونسل اپنے دائرے میں رہ کر کچھ اہم کام انجام دے سکتی ہے۔

دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ 'اسلامک اسٹڈیز کے لیے ہندوستان کی

خدمات' کے عنوان کے تحت ایک بڑے پراجیکٹ کی شروعات کی جائے گی اور اسلامک اسٹڈیز کی اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کی جائے گی۔ اسلامک اسٹڈیز کی عربی فارسی اور انگریزی میں مہیا اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے گا۔

سینٹر فار اسٹڈی آف سوسائٹی اینڈ سیکولرازم، ممبئی کے چیئرمین ڈاکٹر اصغر علی انجینئر نے کہا کہ اسلامک اسٹڈیز کے کئی ایسے تہہ دار پہلو ہیں جن کا جاننا بہت ضروری ہے۔ مثلاً اس موضوع کی سوشیولوجیکل اور سائنٹفک اپروچ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ ممبئی کی سینٹ زویس کالج کی ڈاکٹر زینت شوکت علی نے کہا کہ اسلام کی اصلی شبیہ کو پیش کیا جانا چاہیے۔ اس لیے عوامی بیداری کے لیے بھی اسلامک میتھولوجی پر آسان اردو زبان میں کتابیں شائع ہونا ضروری ہے۔

اس میٹنگ میں پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر منظور عالم، مولانا خوشتر نورانی، مولانا یسٰین اختر مصباحی، مولانا مبارک حسین مصباحی (مئو)، پروفیسر سید احسان (علی گڑھ)، ڈاکٹر اصغر علی انجینئر (ممبئی)، ڈاکٹر زینت شوکت علی، (ممبئی)، پروفیسر اشتیاق دانش، ڈاکٹر اقتدار محمد خان، ڈاکٹر فریدہ خانم نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 جون 2012

اب اردو میڈیم کے طالب علم بھی کرسکتے ہیں ITI کی اردو کتابوں سے استفادہ!

نئی دہلی: وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے قومی اردو کونسل کے ذریعے کئی ایسے انقلابی قدم اٹھائے ہیں جن کے ذریعے نہ صرف اردو زبان کا فروغ ہو رہا ہے بلکہ اقلیتوں کے لیے بھی زمینی سطح پر ایسے پروگرام اور پالیسیاں ترتیب دی گئی ہیں جن سے ایک بڑی تعداد میں

اردو طالب علم تکنیکی تعلیم اور روزگار سے جڑ رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے چوبیس روزہ ITI ورکشاپ کی اختتامی تقریب میں کیا۔

اردو زبان کو ذریعہ معاش سے جوڑا جاسکے اس سلسلے میں کونسل نے اپنے ایک بڑے پروجیکٹ کی شروعات کی ہے، اس سال قومی اردو کونسل ITI یعنی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے پیشہ وارانہ کورس کی کتابیں مہیا کرانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ITI کے ادارے پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان علاقوں میں بھی ہیں جہاں اقلیت کثیر تعداد میں موجود ہے، جن کی مادری زبان اردو ہے۔

قومی اردو کونسل پروفیشنل کورسز کی کتابیں اردو میں مہیا کرانے کے لیے ITI کی موجود انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ اور ان کی اشاعت کا ذمہ اٹھاتے ہوئے فروغ اردو بھون میں چوبیس روزہ ورکشاپ کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ آئی ٹی آئی کی 18، Trades (ٹریڈس) ہیں۔ ان میں Fitter (فیٹر)، Electrician (الیکٹریشین)، Mechanic Motor Vehicle (میکنک موٹر وہیکل)، Wireman (وائرمین)، Turner (ٹرنر)، Mechanic Diesel (میکنک ڈیزل)، Cutting and Sewing (کٹنگ اور سوئنگ)، Mechinist (میکی نسٹ)، Mechanic Tractor (میکنک ٹریکٹر)، Mechanic Radio & TV (میکنک ریڈیو اور ٹی وی)، Computer Operating & Programming Assistance (کمپیوٹر اوپریٹنگ اور پروگرامنگ اسسٹنس)، Refrigeration & AC Mechanic (ریفریجریشن اور اے سی میکنک)، Sheet Metal worker (شیٹ میٹل ورکر)، Tool & Die Making (ٹول اور ڈائی میکنگ)، Information Technology & Electronic system maintenance (انفارمیشن ٹیکنالوجی اور الیکٹرانک سسٹم مینٹننس)، Draughtsman Mechanical (ڈرافٹس مین میکنیکل)، Electronic System Maintenance (الیکٹرانک سسٹم مینٹننس)، کو منتخب کیا گیا۔ یہ 18 موضوعات National Instructional Media Institute (NIMI) جو ڈائرکٹوریٹ جنرل ایمپلائمنٹ اور ٹریننگ منسٹری آف لیبر، گورنمنٹ آف انڈیا، چنئی سے منظور شدہ ہیں۔

کونسل نے ITI کے ان 18 Trades کی کتابیں جس میں Theory, Practical اور Assignment/Text کی کتابوں کے ترجمہ کی ذمے داری یونیورسٹی پولی ٹیکنک، علی گڑھ کو دی تھی۔ اس پورے پروجیکٹ میں ITI کی 52 کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا۔ ان 52 ترجمہ شدہ کتابوں کے مینواسکرپٹ میں سے 41 مینواسکرپٹ، ہر لحاظ سے مکمل ہوچکی ہیں۔ اس ورکشاپ میں اردو، انگریزی، ریاضی، کامرس اور تکنیکی ترجمے کے ماہرین نے شرکت کی جو ان ترجمہ شدہ کتابوں پر نظر ثانی کریں گے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 جون 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P87.jpg 1/1

3/21/2018 P88.jpg (1604×2239)

اردو وِکی پیڈیا! قومی اردو کونسل کا تاریخ ساز قدم

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) جلد ہی اردو میں وکی پیڈیا لانچ کرنے والی ہے اور اس پروجیکٹ پر کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ امکان ہے کہ اکتوبر تک ہندوستان میں اردو وِکی پیڈیا کو لانچ کر دیا جائے گا۔ اس منصوبے کا مقصد اردو میں جامع اور مستند معلومات فراہم کرنا ہے۔ ہندوستان کی اردو کے تئیں کی جارہی کوششوں اور ادبی پیش رفت کو اردو وکی پیڈیا میں بہت کم جگہ مل پا رہی ہے۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر بھی اردو زبان وادب کے فروغ میں ہندوستان کی کوششوں کا ذکر کم ہی ہو رہا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے مطابق این سی پی یو ایل کے پلیٹ فارم سے ہم اردو وکی پیڈیا کی جلد ہی شروعات کرنے جارہے ہیں اور اس میں خاص طور سے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے کیے جارہے کاموں اور اردو ادب سے متعلق دیگر سرگرمیوں کا احاطہ کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے مزید کہا کہ ہم نئی نسل کو اردو زبان وادب کی جانب راغب کرنا چاہتے ہیں اسی لیے ایک پہل کے طور پر قومی اردو کونسل کے ذریعہ شائع شدہ اردو انسائیکلو پیڈیا کو اردو وکی پیڈیا کے ساتھ منسلک کیا جائے گا جس سے اردو کے قارئین کو اردو زبان میں آرٹس، سائنس، سیاست، تہذیب وتمدن جیسے مختلف موضوعات سے پر بہت ساری معلومات مفت حاصل ہوسکیں گی۔

قومی اردو کونسل نے فروغ اردو کی کوششوں کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اپنی تمام مطبوعات کو ڈجیٹلائز کرنے کا کام بھی شروع کر دیا ہے اور امکان ہے کہ این سی پی یو ایل اپنی ویب سائٹ پر جلد ہی 1200 سے زیادہ موضوعات پر اپنی شائع شدہ کتابوں کو ڈجیٹل فارمیٹ میں اَپلوڈ کر دے گی اور یہ کتابیں انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کے اردو قاریوں کو دستیاب ہوں گی۔ ان کے علاوہ کونسل ڈجیٹل ڈکشنری اور آن لائن اردو کلاسس کے پروجیکٹ پر بھی کام کر رہی ہے۔

قومی اردو کونسل کا آن لائن اردو پروگرام اور ڈجیٹل لائبریری

نئی دھلی: قومی اردو کونسل آغاز سے ہی اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیتی رہی ہے۔ کونسل جہاں مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابوں کی اشاعت کر چکی ہے وہیں اردو زبان وادب کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے اسے کمپیوٹر اور جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے میں بھی پیش پیش رہی ہے۔ اپنی خدمات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے کونسل نے آن لائن اردو کورس شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آن لائن کورس سی آئی آئی ایل میسور کی مدد سے تیار کیا گیا ہے جو کونسل کی ویب سائٹ پر مفت دستیاب ہوگا اور کوئی بھی شخص جو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر جانتا ہے وہ اس ویب سائٹ کے ذریعے آسانی سے اردو سیکھ سکے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کونسل کی شائع شدہ 1200 سے زیادہ کتابوں کو ڈجیٹلائز کرنے کا کام بھی جاری ہے۔

30 جون کو مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل کونسل کے آن لائن اردو کورس، کونسل کی ڈجیٹل لائبریری اور ڈجیٹل خواندگی کا افتتاح کریں گے۔ یقیناً اردو زبان وادب کی ترقی کی سمت میں یہ ایک اہم قدم ہے جس سے اردو زبان و ادب کا دائرہ مزید وسیع ہوگا اور اردو نئے نئے علاقوں میں اپنی جگہ بنائے گی۔

قومی اردو کونسل کے تعاون سے
سعادت حسن منٹو زندگی، شخصیت اور فن

مالیر کوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی مالیر کوٹلہ، عالمی اردو ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے ایک روزہ قومی سیمینار 'سعادت حسن منٹو زندگی، شخصیت اور فن' کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت جناب اے رحمان، چیئرمین عالمی اردو ٹرسٹ، نئی دہلی نے فرمائی اور پروفیسر صادق سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پدم شری اظہار رعالم چیئرمین پنجاب وقف بورڈ نے اپنے افتتاحی خطبے میں پنجاب اردو اکادمی کے ذمے داران اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان کو یہ سیمینار منعقد کرانے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم پنجاب اردو اکادمی کو اس کی تمام سرگرمیوں اور منصوبوں کے لیے ہر ممکن تعاون دیں گے۔ پروفیسر صادق نے اپنے کلیدی خطبے میں منٹو کی حیات اور فن کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ جناب اے رحمان نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ منٹو نے معاشرے کی جن برائیوں کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ان پر طبع آزمائی کی، ان برائیوں پر منٹو سے پہلے کسی نے اتنی باریکی سے نہیں لکھا۔ انھوں نے عالمی اردو ٹرسٹ کی طرف سے پنجاب اردو اکادمی کی ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اردو رابطہ کمیٹی کے چیئرمین ظہور احمد ظہور نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے سیشن میں ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا مقالہ 'پنجاب کا ایک بے باک فنکار' پیش کرتے ہوئے منٹو کی زندگی پر تفصیل

سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے اپنا مقالہ 'بابو گوپی ناتھ منٹو کا ایک بے مثال کردار' پیش کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کے کردار ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور گوپی ناتھ منٹو کا ایک شاہکار کردار ہے جو سیاہ ہے نہ سفید۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے 'سعادت حسن منٹو چند تصویریں' کے عنوان سے ایک تذکرہ پیش کیا جس میں انھوں نے منٹو کی زندگی سے متعلق کئی دلچسپ واقعات بیان کیے۔ یونیورسٹی آف کیرولینا یو ایس اے سے تشریف لائے ہوئے پروفیسر افروز تاج اور پروفیسر جون کالڈویل نے امریکہ میں اردو زبان کی ترویج کے متعلق گفتگو کی اور اس کے ساتھ منٹو اور اس کے اندازِ تحریر پر بھی روشنی ڈالی۔ آخری سیشن پروفیسر جون کالڈویل اور جناب اے رحمٰن کی صدارت میں ہوا جس میں جناب کشمیری لال ذاکر نے منٹو پر چلائے گئے مقدموں کی روداد بیان کرتے ہوئے منٹو کے ساتھ ہوئی اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ندیم احمد نے اپنا مقالہ بہ عنوان 'منٹو کا افسانوی ادب' پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 جون 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P88.jpg 1/1

3/21/2018 P89.jpg (1608×2243)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

وزیراعظم کی بہادر شاہ ظفر کے مزار پر حاضری

رنگون: آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر واقعی بدنصیب تھے کہ اپنے ملک میں انھیں دفن کے لیے دو گز زمین نہیں ملی، لیکن ان کے عزیز ملک سے ان کے مزار پر حاضری دینے والوں کا سلسلہ کبھی نہیں رکا۔ ان کے مزار پر ایک اور اہم شخصیات نے حاضری دی، وہ ہیں وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ۔ میانمار کے تین روزہ دورے پر گئے ڈاکٹر سنگھ نے اپنی اہلیہ گرچرن کور کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر خراج عقیدت پیش کیا۔ وزیراعظم نے میانمار کی جمہوریت کی علمبردار آنگ سان سوکی سے ملاقات کی اور انھیں ہندوستان آنے کی دعوت دی، جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ ڈاکٹر سنگھ نے انھیں یو پی اے سربراہ سونیا گاندھی کی جانب سے بین الاقوامی مفاہمت پر جواہر لال نہرو میموریل لیکچر دینے کی دعوت دی، جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ دونوں لیڈروں نے دونوں ممالک کے عوام کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ جمہوریت نواز لیڈر کو 1993 میں جواہر لعل نہرو ایوارڈ برائے بین الاقوامی مفاہمت دیا گیا تھا، لیکن وہ نظر بند ہونے کی وجہ سے یہ ایوارڈ لینے کے لیے ہندوستان نہیں آسکی تھیں۔ فوجی قیادت کے ذریعے انتخابات کے اعلان کے بعد انھیں 2010 میں رہا کردیا گیا تھا۔ سوکی نے 2012 کے ضمنی انتخابات میں حصہ لیا اور اب وہ رکن پالیمان ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 مئی 2012

تعلیم کا نظریہ بدلنے کی ضرورت: کپل سبل

نئی دہلی: فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر کپل سبل نے مختلف مضامین اور زبان کے اساتذہ کا ڈاٹا بینک تیار کرنے کی وکالت کی ہے تاکہ ان کی خدمات سے سبھی مستفیض ہوں۔ اس سلسلے میں انھوں نے یونیسکو کی میٹنگ بلانے کی اپیل کی ہے تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ عالمی سطح پر بچوں کی ضروریات کیا ہیں۔ کپل سبل کا کہنا ہے کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں جب تک اساتذہ کے معیار کو بہتر بنانے کے کام نہیں ہوں گے تب تک ترقی کے مقاصد کو حاصل کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ چیلنجز اور حقائق کے پیش نظر مختلف مضامین اور زبان کے اساتذہ کا گروپ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاٹا بینک کے ذریعے ہر شخص ان تک پہنچ سکتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 مئی 2012

خواجہ غریب نواز کے عرس پر ڈاک ٹکٹ: کپل سبل کے ہاتھوں اجرا

اجمیر: خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی کے سالانہ عرس کے موقعے پر ایک پروقار تقریب میں وزیر مواصلات کپل سبل نے سلطان الہند کی یاد میں ایک یادگاری ٹکٹ کا اجرا کیا۔ یہ پروقار تقریب درگاہ شریف کے محفل خانے میں بعد نماز عصر منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت انجمن خدام خواجہ سید زادگان کے صدر الحاج سید حسام الدین نیازی چشتی نے کی۔ اس موقعے پر وزارت مواصلات کے وزیر مملکت سچن پائلٹ بھی موجود تھے۔ مہمان خصوصی کے طور پر یونی ورسل ایسوسی ایشن فار اسپریچول اویرنس کے بانی پنڈت این کے شرما موجود تھے۔ جناب کپل سبل کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی روحانی راجدھانی اجمیر شریف ہے اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ ہم خود دربار غریب نواز میں حاضر ہوکر اس ٹکٹ کا اجرا کرکے دربار غریب نواز نظر عقیدت بھی پیش کریں۔ درگاہ شریف پہنچتے ہی بلند دروازے پر خدام خواجہ اور درگاہ کمیٹی کی جانب سے جناب کپل سبل اور پنڈت این کے شرما جی کا خیر مقدم کیا گیا جس کے فوراً بعد ان مہمانوں کو غریب نواز کے روزہ مبارک کی زیارت کرائی گئی جہاں انجمن کے سکریٹری جناب سید واحد حسین چشتی نے حضرات خدام خواجہ کی جانب سے تینوں مہمانوں کی دستار بندی کی اور ملک کی ترقی اور خوش حالی اور امن وامان کے لیے خصوصی طور پر دعا کی گئی۔ زیارت کے فوراً بعد محفل خانے میں ڈاکٹ ٹکٹ کا اجرا کیا گیا۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 28 مئی 2012

اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کی تشکیلِ نو

نئی دہلی: دہلی سرکار کے محکمہ فن وثقافت والسنہ کے اعلانیہ مورخہ 23 مئی 2012 کے مطابق وزیر اعلیٰ، دہلی محترمہ شیلا دیکشت جو کہ اردو اکادمی، دہلی کی چیئر پرسن بھی ہیں اکادمی کی گورننگ کونسل کی تشکیلِ نو کردی ہے، جس کی مدتِ کار ایک سال ہوگی۔ گورننگ کونسل کے وائس چیئرمین کے عہدے پر پروفیسر اخترالواسع کو برقرار رکھا گیا ہے۔ پرنسپل سکریٹری (مالیات) اور سکریٹری (فن، ثقافت والسنہ) دہلی سرکار بدستور ممبر بربنائے عہدہ بنے رہیں گے۔ اس کے علاوہ دہلی کے مختلف شعبہ ہائے علم و فن سے 20 مقبول و معروف شخصیات کو بحیثیت رکن نامزد کیا گیا ہے نیز دہلی سے شائع ہونے والے چار مقبول ومعروف مدیران کو گورننگ کونسل میں بطور خصوصی مدعوئین شامل کیا گیا ہے۔ اراکین کی مکمل فہرست حسبِ ذیل ہے:

وزیر اعلیٰ دہلی (چیئر پرسن)، پروفیسر اخترالواسع (وائس چیئرمین)، پرنسپل سکریٹری مالیات (ممبر بربنائے عہدہ)، سکریٹری فن، ثقافت والسنہ (ممبر بربنائے عہدہ)، پروفیسر عبدالحق (پروفیسر ایمرٹس، دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ (قلمکار وادیب)، ڈاکٹر جی آر کنول (سابق پرنسپل)، پروفیسر معین الدین جینا بڑے (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی)، پروفیسر ابن کنول (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر خالد محمود (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، پروفیسر توقیر احمد خاں (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر شہپر رسول (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی/قومی اردو کونسل)، ڈاکٹر عفت زرّیں (ماتا سندری کالج، دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر شبانہ نذیر (پرنسپل، گورنمنٹ اسکول)، ڈاکٹر عقیل احمد (غالب اکیڈمی)، جناب حاجی میاں فیاض الدین (تہذیبی وسماجی شخصیت)، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی (مدرسہ امینیہ)، جناب شاہد علی خاں (ادارہ نئی کتاب)، جناب انجم عثمانی (ڈی ڈی اردو)، جناب مرغوب حیدر عابدی (سابق سکریٹری اکادمی)، جناب معصوم مرادآبادی (ادیب وصحافی)، محترمہ منورما دیوان (چیف ایڈیٹر، ایشیا نیوز سروس)، جناب کے کے کوہلی (موسیقی، فلم وثقافت) جناب اسد رضا (راشٹریہ سہار اردو)، جناب شکیل حسن شمسی (انقلاب)، جناب حسن شجاع (صحافت) اور جناب خالد انور (ہمارا سماج) بطور خصوصی مدعوئین شامل ہیں۔ جناب انیس اعظمی گورننگ کونسل کے ممبر سکریٹری ہوں گے۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، 25 مئی 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P89.jpg 1/1

3/21/2018 P90.jpg (1596×2240)

ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کی دربھنگہ آمد پر اعزازی تقریب کا انعقاد

دربھنگہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کی تشریف آوری پر دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں ایک اعزازی تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر دارالعلوم کے تحت چلنے والے کمپیوٹر سنٹر کے سپروائزر احتشام الحق صاحب نے ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کا تعارف کراتے ہوئے اردو زبان کے تئیں ان کی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا

اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور قومی اردو کونسل کی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ ان کی ڈائرکٹرشپ میں کونسل اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔ اس کے بعد دربھنگہ ضلع میں چلنے والے قومی اردو کونسل کے سنٹر کی جانب سے گل دستہ پیش کر کے ان کا استقبال کیا گیا۔ دارالعلوم کے سکریٹری ڈاکٹر سید عبدالعزیز سلفی نے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ دارالعلوم کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر عبدالحلیم نے دارالعلوم کا تعارف پیش کرتے ہوئے خواجہ اکرام الدین اور قومی اردو کونسل کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر مشہور شاعر عبدالمنان طرزی نے بھی ایک استقبالیہ نظم پیش کی۔ اس کے بعد ڈائرکٹر صاحب کے دست مبارک سے قومی اردو کونسل کے کامیاب طلبہ و طالبات کے درمیان سرٹیفکیٹ کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس تقریب میں پروفیسر شاکر خلیق سابق رکن قومی اردو کونسل، ڈاکٹر شکیل احمد رکن قومی اردو کونسل اور ڈاکٹر مشتاق احمد پرنسل ملت کالج دربھنگہ و رکن قومی اردو کونسل نے بھی اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ یقینی طور پر مسائل تو بہت ہیں لیکن صرف مسائل کا شکوہ کرتے رہنے سے آپ پیچھے رہ جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امکانات پر غور کیا جائے اور جو وسائل میسر ہیں انھی کے ذریعے خدمت کے جذبے سے کام کیا جائے تو یقینی طور پر آپ کو کامیابی ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ مدارس میں بھی ایسے بہت سے کام ہوئے ہیں جن پر سیمینار کرائے جاسکتے ہیں۔ مدارس کی لائبریریوں کو بھی کتابوں کی خریداری کے لیے تعاون مل سکتا ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر مدارس سے نکلنے والے رسالوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ملک و قوم کی تعمیر میں ان رسالوں کی خدمات دوسرے رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ ملک کی بڑے قیمتی دستاویز ہیں۔ ان رسالوں کو بھی سالانہ تعاون مل سکتا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ کونسل بہت جلد ووکیشنل کورس شروع کرنے جارہی ہے۔ اس کے سنٹر مدارس میں بھی کھولے جائیں گے تاکہ مدارس کے فارغین روزگار سے جڑسکیں۔

پریس ریلیز، دربھنگہ بہار، 2 جون 2012

اردو شاعری میں دل کی آواز سنائی دیتی ہے: کاٹجو

الہ آباد: جوش و فراق لٹریری سوسائٹی کی جانب سے سابق جسٹس سپریم کورٹ اور پریس کونسل آف انڈیا کے موجودہ چیئرمین مارکنڈے کاٹجو کے اعزاز میں سابق ایڈوکیٹ جنرل و سینئر ایڈوکیٹ ایس ایم اے کاظمی کی رہائش

گاہ پر ایک تہنیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر جوش و فراق لٹریری سوسائٹی کے جنرل سکریٹری پروفیسر علی احمد فاطمی نے مارکنڈے کاٹجو کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جسٹس کاٹجو صرف ماہر قانون اور مصنف ہی نہیں بلکہ ایک مفکر اور دانشور بھی ہیں وہ اردو سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ مشترکہ تہذیب کے دلدادہ اور حمایتی ہیں ۔ اردو شاعری کی تو وہ بے پناہ عاشق ہیں۔ جوش و فراق لٹریری سوسائٹی کے صدر ایس ایم اے کاظمی نے سوسائٹی کی جانب سے مہمان خصوصی کو 'محافظِ اردو' ایوارڈ پیش کیا۔ مارکنڈے کاٹجو نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اردو کا پرچم اس لیے بلند کیے ہوئے ہوں کیوں کہ یہ وہ زبان ہے جس میں دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ میں نے اکثر اپنے فیصلوں میں غالب، فیض اور اردو کے دیگر شعرا کے اشعار کوٹ کیے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 مئی 2012

منٹو پر ہندوستانی اکادمی و ہندی یونیورسٹی کا سیمینار

الہ آباد: افسانہ نگار 'منٹو' یوم پیدائش پر ہندوستانی اکادمی اور مہاتما گاندھی بین الاقوامی ہندی یونیورسٹی (وردھا) کے باہمی اشتراک سے دوروزہ کل ہند سیمینار کا اہتمام ہوا جس میں مقامی و بیرونی دانشوران نے منٹو کی شخصیت اور افسانوی معنویت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پہلا اجلاس 9 جون کو ہندوستانی اکادمی میں شروع ہوا جس کی صدارت بزرگ افسانہ نگار نامور سنگھ نے کی۔ 'شخصیت اور منٹو کے تحت' اس پروگرام میں وبھوتی نارائن رائے مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس موقعے پر عابد سہیل نے اپنے افتتاحی خطبے میں منٹو اور سعادت حسن کو دو ایسی شخصیتیں قرار دیا جو کبھی ساتھ ساتھ رہیں اور کبھی کبھی ایک دوسرے سے بالکل الگ۔ سعادت حسن بیوی بچوں سے پیار کرتا، یہ خواہش بھی کرتا کہ اسے یاد رکھو، منٹو کو بھول جاؤ۔ اپنی بیٹی کے علاج معالجہ کے لیے قرض لینے سعادت حسن کے پاس جاتا لیکن شراب کی بوتل لے کر منٹو واپس آتا۔ نامور سنگھ نے اپنے صدارتی خطبے میں منٹو کو صفحہ اول کا افسانہ نگار کہا اس سے قبل رویندر کالیا نے بھی شخصیت اور منٹو پر تفصیلی تقریر کی۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت دودھناتھ نے کی تو دوسری نشست کی صدرت سید محمد عقیل رضوی نے کی اس اجلاس میں منٹو کی شخصیت اور افسانوی حقیقت پر بہت کارآمد باتیں سامنے آئیں۔ صدارت کر رہے سید عقیل رضوی نے منٹو کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کہتے ہیں سوا سیر کو۔ انھوں نے کہا منٹو کا خاندان تجارت کرتا تھا منٹو کی نگاہ میں ترقی پسند کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن انھوں نے ترقی پسندی کی کبھی مخالفت بھی نہیں کی تھی۔ منٹو اشتراکیت اور کیفیات کے لاجواب افسانہ نگار تھے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے منٹو کے تعلق سے کہا منٹو عظیم فنکار تھے۔ منٹو دنیا کے بڑے سے بڑے سوالات سے ٹکراتے تھے اور انھیں اپنی کہانی کا موضوع بناتے تھے انھیں اپنے فکشن میں جگہ دیتے تھے۔ کرشن موہن، شکیل صدیقی (لکھنؤ)، طارق چھتاری (علی گڑھ)، اکھلیش (لکھنو)، ڈاکٹر نگار عظیم (دہلی)، صغیر افراہیم (علی گڑھ)، ہمایوں اشرف (پٹنہ) کے علاوہ چوتھے اجلاس کی کہانی کی محفل جائی گئی جس کی صدارت ممتا کالیا نے کی اس موقعے پر رتن سنگھ (نوئیڈا) نے منٹو کو اپنے افسانے کا کردار بنا کر پیش کیا، معروف افسانہ نگار اسرار گاندھی کی کہانی کا عنوان تھا 'منظر پس منظر اور پیش منظر' مہیش کٹارے (گوالیار)، ڈاکٹر سروت خان (اُدے پور) وغیرہ نے افسانے پیش کیے۔ شرکا میں کامریڈ ضیا، سینئر ایڈوکیٹ ایم اے قدیر، چودھری ابن نصیر، ڈاکٹر اشفاق حسین، ڈاکٹر ضمیر احسن، احترام اسلام، خورشید نقوی، انیتا گوپیش، نیلم شنکر، ڈاکٹر اشرف علی بیگ، فہیم محمد (راعی بک ڈپو) کرانتی

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P90.jpg 1/1

3/21/2018 P91.jpg (1620×2236)

کمار شکلا، حسین جیلانی وغیرہ نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض سوریہ نارائن نے انجام دیے اور ہندوستانی اکادمی کے روی نند سنگھ نے خاص طور سے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جون 2012

موجودہ فکشن لکھنے والوں میں خالد جاوید اہمیت کے حامل: فاروقی

الہ آباد: افسانہ اور ناول نگاروں کو چاہیے کہ انھیں بھی اپنے فکشن میں جگہ دیں جن بے گناہوں نے کئی سال سلاخوں کے پیچھے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عالمی شہرت یافتہ نقاد و شاعر پدم شری شمس الرحمٰن فاروقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، دہلی کے ریڈر افسانہ و ناول نگار خالد جاوید کے مشہور ناول 'موت کی کتاب' کے دوسرے ایڈیشن کی رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ تقریب رسم اجرا میں سینئر ایڈوکیٹ ایم اے قدیر بھی شریک ہوئے۔ خالد جاوید کے مجموعے کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا موجودہ لکھنے والوں میں خالد جاوید کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے کئی مجموعے 'برے موسم میں'، 'آخری دعوت'، 'تفریح کی ایک دوپہر' اردو ادب میں کافی سراہے جارہے ہیں لیکن اُن کے ناول 'موت کی کتاب' نے قارئین کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اِس ناول میں جو چیز ہمیں بہت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے وہ اُس کا ڈرامائی آہنگ ہے۔ اس موقعے پر خالد جاوید نے میڈیا سے کہا کہ مجھے فاروقی صاحب کے معروف ادبی رسالے نے افسانہ نگار بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1992 میں میری پہلی کہانی 'ہذیان' شائع ہوئی تھی۔ ایم اے قدیر نے کہا کہ خالد جاوید نے بہت کم عرصے میں دنیائے ادب میں اپنی شناخت بنالی ہے جس کے لیے وہ قابلِ مبارکباد ہیں اور اُن کا ناول 'موت کی کتاب' ایک اہم ناول ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 30 مئی 2012

عمران ہاشمی اردو کتابیں پڑھتے ہیں

نوئیڈا: مشہور فلم اسٹار عمران ہاشمی نے نوئیڈا میں واقع انقلاب کے دفتر کا دورہ کیا اور یہاں کی جدید پرنٹنگ ٹکنالوجی کی ستائش کی۔ عمران ہاشمی اپنی آنے والی فلم 'شنگھائی' کے پروموشن کے لیے دہلی میں تھے۔ اپنے مصروف شیڈول میں سے وقت نکال کر وہ مشہور سماجی کارکن اور سیاسی رہنما شکیل سیفی کے ہمراہ شام کے وقت انقلاب کے دفتر پہنچے اور تقریباً ایک گھنٹے تک وہ مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔ دفتر انقلاب پہنچنے پر نارتھ ایڈیٹر شکیل شمسی، جاگرن گروپ کے جنرل منیجر ارون کمار سنگھ، ایڈیٹوریل انچارج ڈاکٹر افضل مصباحی اور نیوز ایڈیٹر عبدالحئی خان نے عمران ہاشمی اور شکیل سیفی کا خیر مقدم کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ اپنا تلفظ درست کرنے کے لیے روزانہ اردو کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس موقع پر شکیل سیفی نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے اتنا بڑا فلم اداکار اپنی فلم کے پروموشن کے لیے اردو اخبار کے کسی دفتر میں آیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جون 2012

خراب زبان کے لیے عوام بھی ذمے دار

لکھنؤ: ہندوستانی فلموں کے مشہور نغمہ نگار اور قلم کار جاوید اختر کا کہنا ہے کہ فلموں میں خراب گیت اور زبان کے لیے عوام بھی قصوروار ہیں۔ راجیہ سبھا کے رکن مسٹر اختر کا کہنا ہے کہ 'چولی کے پیچھے' گیت لکھنے، گانے، فلمانے والے چار چھ لوگ اسے ہٹ نہیں کرتے بلکہ اسے عوام سپرہٹ بناتی ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر فلموں میں خراب زبان سنائی دے رہی ہے تو کیا اچھی زبان سماج میں بولی جارہی ہے۔ زبان سمٹ رہی ہے۔ نئی نسل کا اپنی تہذیب اور اپنی زمین سے رشتہ ٹوٹ سا رہا ہے۔ کیا آج کسی کو محاورے یاد ہیں، کوئی مشاعرہ سنتا ہے۔ مشاعروں میں لوگ تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ آج کے ہمارے سماج میں یہ تمام چیزیں بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آج یہ ممکن ہے کہ 'دو بیگھہ زمین' جیسی فلمیں بنائی جائیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جون 2012

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام کا دورہ بہار

پٹنہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے نئے ڈائرکٹر مشہور اسکالر ڈاکٹر خواجہ اکرام پہلے دورۂ بہار میں پٹنہ ایئرپورٹ سے سیدھے اردو کی عالمی شہرت یافتہ شخصیت پروفیسر وہاب اشرفی کی عیادت کے لیے ان کی رہائش گاہ ہارون نگر کالونی پٹنہ تشریف لے گئے۔ اشرفی صاحب نے ان کی آمد پر غیر معمولی مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ آپ علمی کمال کے ساتھ اخلاقی بلندی بھی اپنے اندر رکھتے ہیں اس موقعہ پر اردو کے فروغ کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال ہوا۔ بعد ازاں پھلواری شریف میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری اور امارت شرعیہ کے امیر شریعت حضرت مولانا نظام الدین صاحب نے اردو کے فروغ کے سلسلہ میں اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ امارت شرعیہ میں قائم فروغ اردو کونسل کے کمپیوٹر سنٹر کا معائنہ بھی خواجہ صاحب نے کیا۔ امارت شرعیہ کے میٹنگ ہال میں خواجہ صاحب کا استقبال کیا گیا۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی میں خواجہ صاحب نے یونیورسٹی کے ذمہ داران سے ملاقات کی۔ پروفیسر مولانا شکیل قاسمی صاحب نے بہار کے تناظر میں اردو کی صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ اخیر میں خواجہ صاحب نے اردو کی عالمی صورتِ حال اور فروغ اردو کونسل کے نئے منصوبوں سے واقف کراتے ہوئے اردو آبادی کے تعاون سے کاموں کو آگے بڑھانے کے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ پٹنہ میں خواجہ صاحب نے پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر اسرائیل رضا، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر فاروق صدیقی، پروفیسر یوسف خورشیدی، پروفیسر شمس الضحیٰ سے مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔ اردو کے سلسلہ میں بہار کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بہار کی اردو آبادی کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ بعد میں ادارہ شرعیہ میں قائم فروغ اردو کے کمپیوٹر سنٹر کا بھی خواجہ صاحب نے معائنہ کیا۔ ادارہ شرعیہ کے ذمہ داروں نے خواجہ صاحب کا استقبال کرتے ہوئے انھیں یہ عہدہ ملنے پر مبارکباد پیش کیا۔ پٹنہ سے خواجہ صاحب دربھنگہ تشریف لے گئے جہاں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ میں عظیم الشان پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں خواجہ صاحب کو استقبالیہ بھی دیا گیا اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالحلیم سلفی نے کہا کہ فروغ اردو کونسل کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جب کوئی ڈائرکٹر اتنی خاکساری کے ساتھ ہمارے یہاں تشریف لایا ہو۔ اس موقعے پر فروغ اردو کونسل سے ملت کس طرح استفادہ کرسکتی ہے اس پر خواجہ صاحب نے روشنی ڈالی ہے۔

پریس ریلیز، پٹنہ 13 جون 2012

اردو اخبار کے اراکین کا دورۂ شانتی نکیتن

کولکاتا: ساری دنیا میں ہندوستان اور بنگلہ زبان کو عزت و وقار دلانے والے عظیم فنکار رابندر ناتھ ٹیگور کی 150 ویں سالگرہ کے موقعے پر روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ایک گروپ نے شانتی نکیتن کا دورہ کیا۔ اس گروپ میں سہارا انڈیا پریوار کی اردو اشاعتوں کے سربراہ اسد رضا کے علاوہ روزنامہ کے سینئر رکن نسیم اختر اور محمد خالد عرفان بھی شامل تھے۔ ٹیگور ایک عظیم ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ہمارے ملک کی سیکولر روایات اور رواداری کی علامت بھی

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P91.jpg 1/1

3/21/2018 P92.jpg (1601×2248)

تھے۔ اسی لیے ان کی قائم کردہ دانش گاہ میں سائنسی علوم او سماجی علوم کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی میں فلسفے اور مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کا بھی ایک شعبہ ہے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے گروپ نے شعبہ عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات کے صدر پروفیسر واصف احمد اور اسسٹنٹ پروفیسر عتیق الرحمٰن ودیگر سے ملاقات کی اور شعبے کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ گروپ میں شامل تمام افراد نے گرورابندرناتھ ٹیگور کی مذہبی رواداری اور وسیع القلبی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 21 مئی 2012

'شکوہ' کا ترجمہ

نئی دہلی: 'سارے جہاں سے اچھا' لکھ کر کروڑوں ہندوستانیوں میں آزادی کی لڑائی کا جوش بھرنے والے اردو کے مشہور شاعر علامہ اقبال نے تقریباً ایک صدی قبل 'شکوہ' اور اس کا 'جواب شکوہ' بھی لکھا تھا جس کا ترجمہ اب پینگوئن پبلشر شائع کرنے جارہا ہے۔ ممبئی کے رہنے والے آرکیٹیکٹ کے ٹیچر مختصر دلوی نے اقبال کی تخلیق کا نیا ترجمہ انگریزی میں بیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے 1909 میں 'شکوہ' اور 1913 میں 'جواہ شکوہ' لکھا تھا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 جون 2012

دہلی:

ہندی اسکولوں میں اردو پرنسپلوں کی فہرست

نئی دہلی: حکومت دہلی نے اردو کے تعلق سے ایک اہم فیصلہ لیتے ہوئے تمام اردو میڈیم اسکولوں میں اردو جاننے والے پرنسپلوں کی تقرری کو ہری جھنڈی دے دی ہے۔ ساتھ ہی ہندی میڈیم اسکولوں میں اردو جاننے والے پرنسپلوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اردو اور بچوں کے مفاد کے لیے جلد اپنا تبادلہ اردو میڈیم اسکولوں میں کرالیں۔ اس کے علاوہ حکومت نے دہلی اردو مومنٹ سے کہا کہ وہ ہندی میڈیم اسکولوں میں اردو جاننے والے پرنسپلوں کی لسٹ تیار کرکے دیں تاکہ ان پرنسپلوں کا تبادلہ اردو میڈیم اسکولوں میں کرایا جاسکے۔ اس سلسلے میں گزشتہ دنوں یہ شکایت دہلی اردو مومنٹ کے ایک فد نے دہلی اقلیتی کمیشن حکومتِ دہلی کے دفتر میں بلائی گئی ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ میں اربابِ حکومت کے روبرو کی تھی۔ صفدر حسین چیئرمین اقلیتی کمیشن حکومت دہلی کی جانب سے طلب کردہ اس میٹنگ میں محکمۂ تعلیمات حکومت دہلی کے ڈائریکٹر امت سنگلا، اسپیشل ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن) سریش گپتا کے علاوہ دہلی اردو موومنٹ کی جانب سے موومنٹ کے جنرل سکریٹری فرید احمد، جوائنٹ سکریٹری مشتاق بیگ اور پریس سکریٹری جاوید رحمانی موجود تھے۔ موومنٹ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرید احمد نے واضح طور پر یہ مطالبہ کیا تھا کہ اردو میڈیم اسکولوں اور اردو زبان کی صورتِ حال میں سدھار تب ہی ممکن ہے، جب ان اسکولوں میں اردو داں پرنسپل حضرات کی تقرری عمل میں آئے گی۔ ڈاکٹر خلیق انجم، صفدر حسین خاں، فرید احمد اور مشتاق بیگ نے محکمہ تعلیم حکومت دہلی کے فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کے دوسرے مسائل جیسے اردو سبجیکٹ اور اردو اساتذہ کا مکمل تقرر اردو کی تمام اسامیوں کا فوری طور پر کیا جانا، نصابی کتب کی فراہمی اور اردو اسکولوں کی صورتِ حال کے سدھار کے لیے دہلی اردو موومنٹ کی جدوجہد جاری رہے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مئی 2012

اردو اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ

نئی دہلی: اردو اکادمی ہمیشہ سے ہی اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے سنجیدہ رہی ہے اور اکادمی نے اردو اساتذہ کے کانٹریکٹ پر تقرری کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ یہ بات اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے ظہور احمد اٹیچی والے کی قیام گاہ پر مائناریٹی ویلفیئر فاؤنڈیشن کے ذریعے منعقدہ ایک تقریب میں کہی۔

انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو اساتذہ کا تقرر انھیں شرائط کی بنیاد پر ہونا چاہیے جن شرائط پر ہندی اور دیگر مضامین کے اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے۔ سیلم پور سے ممبر اسمبلی اور دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد نے کہا کہ جب بھی اردو اساتذہ کی تقرری کی بات آتی ہے فوراً 'ریکروٹ منٹ رول' (آر آر) بنانے کو کہا جاتا ہے۔ پروگرام کی ابتدا میں کنوینر ماسٹر فرید احمد نے تمام مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہم تمام اردو اداروں کے ذمہ داران کے شکرگزار ہیں کہ وہ اس عالم میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں جب اردو کو لوگ مٹانے پر تلے ہیں۔ سابق سفیر اور سابق ممبر پارلیمنٹ م افضل نے کہا کہ اردو اساتذہ کی تقرری نہ کیا جانا ایک افسوسناک بات ہے۔ آخر میں مولانا ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نے کہا کہ جب تک تحریک کو عوامی تحریک نہیں بنایا جائے گا تب تک کسی بھی مشن کو کامیابی نہیں مل پائے گی۔ اس موقعے پر جدید خبر کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی، این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام، دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خان، غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد، سابق کونسلر محمود ضیا، دہلی کی حج کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں، روزنامہ صحافت کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر حسن شجاع، ہمارا سماج کے ایڈیٹر خالد انور نے بھی اردو کے فروغ میں ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جون 2012

اردو اکادمی، دہلی کی تھیٹر ورکشاپ

نئی دہلی: کل شام اردو اکادمی دہلی کی جانب سے اردو اسکولوں کے طلبا وطالبات جن کی عمر 8 سے 15 سال کے درمیان ہے ان کے لیے ایک ماہ کی مفت تھیٹر ورکشاپ کا افتتاح بستی حضرت نظام الدین میں عمل میں آیا۔ اس سال یہ ورکشاپ اردو اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں منعقد کررہی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ تنظیم، 'آغا خان فاؤنڈیشن فار کلچر' کے اشترک سے ورکشاپ میں داخلے کے خواہش مند 70 بچوں میں انٹرویو کے بعد 35 کو منتخب کیا گیا۔ ایک ماہ کی اس ورکشاپ کا اختتام ان بچوں کے ذریعے تیار کردہ ڈرامے کی پیش کش کے ساتھ ہوگا۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی دہلی، 29 مئی 2012

اردو میڈیم اسکولوں کے عمدہ نتائج

نئی دہلی: سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری اسکول کے دسویں اور بارہویں کلاس کے بورڈ کے امتحان میں اردو میڈیم اسکولوں کے بچوں کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے دہلی اردو موومنٹ کے عہدیدار نے کہا کہ دہلی میں اردو میڈیم اسکولوں کے عمدہ نتائج ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی بہتری صلاحیتوں کا ثبت ہے۔ اردو طلبا و اساتذہ نے نامساعد حالات کے باوجود حالیہ سی بی ایس ای امتحانات میں شاندار نتائج درج کراکر یہ ثابت کردیا کہ ان میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ دہلی اردو موومنٹ کے ذمہ داران ڈاکٹر خلیق انجم، فرید احمد، مشتاق بیگ، جاوید رحمانی اور محمد ساجد نے کہا

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P92.jpg 1/1

کہ اردو کے حقوق کے لیے اب تمام غیر سرکاری تنظیموں کے تعاون سے زبردست عوامی تحریک شروع کرنے کا وقت آگیا ہے اور اردو طلبا اور ان کے والدین بھی اس تحریک کا حصہ بننے کو تیار ہیں۔ دہلی اردو مومنٹ کے جنرل سکریٹری فرید احمد کے مطابق اس سلسلے میں بہت جلد ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 مئی 2012

اردو طلبا کی کامیابیاں

نئی دہلی: جمنا پار علاقہ میں اردو کا گرتا ہوا گراف باعث تشویش ہے، لیکن طلبہ و طالبات نے اردو مضمون میں صد فی صد نمبر حاصل کر کے محبان اردو کا سر فخر سے بلند کردیا ہے۔ اردو کے لحاظ سے 2 مشہور و معروف ادارے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول جعفر آباد، زینت محل اسکول جعفر آباد کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اسکول میں 248 میں 245 طلبا و طالبات کامیاب ہوئے ہیں، جس میں محمد ثاقب شادمہ پروین، ثمینہ اور محمد شعیب نے 96 فیصد نمبر حاصل کر کے اول مقام حاصل کیا ہے۔ شیرامی فہیم اور عائشہ نے 82 فیصد نمبر کر کے دوسرا مقام حاصل کیا، جب کہ زیبا انجم نے 80 فیصد نمبر حاصل کر کے تیسرا مقام حاصل کیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ کامیاب طلبہ وطالبات نے اردو میں صد فی صد نمبر حاصل کیے ہیں۔ زینت محل اسکول کی 793 طالبات امتحانات میں شریک ہوئیں اور سبھی نے کامیابی حاصل کی۔ اس ادارے میں ادیبہ بنت محمد شاہد نے 93 فیصد نمبر حاصل کر کے اول پوزیشن حاصل کی اور ثنا خاں بنت محمد یوسف خاں نے 87.4 فیصد نمبر حاصل کر کے دوسرا مقام حاصل کیا، جب کہ عائلہ محسن بنت محمد محسن مرحوم اور صدف بنت محمد یاسین نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ اس لحاظ سے زینت محل اسکول کی کامیابی صد فی صد رہی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 مئی 2012

نمایاں کامیابی پر ایوارڈ

نئی دہلی: میرا ماننا ہے کہ صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد ہر شعبہ میں مقام بنایا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار چیف الیکشن کمشنر ڈاکٹر شہاب الدین ایس وائی قریشی نے اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام تقسیم انعامات پروگرام میں کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے کہا کہ موجودہ تعلیمی نظام میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آٹھویں درجات کے بعد میتھ میٹکس کو اختیاری مضمون کے طور پر داخلہ نصاب کرنا چاہیے۔ انھوں نے اردو زبان کے تعلق سے کہا کہ اردو اور دہلی کا اخلاقی معیار ایک جیسا ہے۔ ان دونوں نے ہر ایک کا خیر مقدم کیا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ دہلی حکومت کی عنایت اردو اکادمی پر ہمیشہ سے رہی ہے۔ صوبائی حکومت نے اکادمی کا گرانٹ بڑھا کر 8 کروڑ روپیہ کردیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 مئی 2012

20 دنوں میں اردو سیکھیں!

نئی دہلی: اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کام کرر ہے اداروں نے بھی اتنی ہمت نہیں کی ہے کہ وہ اردو کو ایک ماہ سے کم مدت میں سیکھنے سکھانے کا دعویٰ کرسکیں لیکن عمر کی سات دہائیاں عبور کرچکے ماہر و تجربہ کار مسٹر محمد نفیس کا دعویٰ ہے کہ وہ اردو کو صرف اور صرف 20 دنوں میں لکھنے اور پڑھنے کی حد تک سکھا سکتے ہیں۔ اس دعویٰ کے لیے ان کی 2 شرطیں ہیں۔ سیکھنے کا خواہش مند ہندی یا انگریزی میں پورا عبور رکھتا ہو اور دوسرے اس میں اردو سیکھنے کی لگن بھی ہو۔ نئی دہلی کے تغلق آباد میں رہائش پذیر محمد نفیس کہتے ہیں کہ کوئی بھی زبان مشکل نہیں ہوتی بشرطیکہ آپ اس کو سیکھنے کے لیے کسی دوسری زبان کا تعاون لیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کی چاشنی کے لیے لوگوں میں ترغیب پیدا ہو۔ حالانکہ میں خود سائنس کا طالب علم رہا ہوں۔ فزکس اور کیمسٹری سے بی ایس سی کیا اور 1980 میں یوپی کے ضلع اناؤ سے دہلی آگیا۔ کاروبار سنبھالا اور بچوں کی تربیت و تعلیم پر توجہ مرکوز کی۔ آج میرے بچے خوش حال ہیں۔ میں عمر کے آخری پڑاؤ پر چاہتا ہوں کہ اردو کی مٹھاس سے لوگوں کو روشناس کراؤں۔ تو کیا 20 دنوں میں سکھانے کے دعویٰ کے ساتھ کسی کو آپ نے پڑھایا؟ محمد نفیس نے کہا کہ ہاں کئی لوگوں کو پڑھایا لیکن کئی لوگوں میں لگن نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت اچھی طرح سے نہیں سیکھ سکے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اپنے گھر پر کلاس لگاتا ہوں اور جس کی مرضی ہوتی ہے وہ یہاں آتا ہے۔ میں کوئی پیسہ نہیں لیتا لیکن اگر کوئی میری اجرت دینا چاہتا ہے تو میں اس کہاوت پر عمل کرتا ہوں کہ "گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کرلے گا تو کھائے گا کیا۔" میں 200 روپے 20 دن کے لیتا ہوں لیکن اگر وہ 20 دن میں نہیں سیکھ سکا تو اس کو مزید مشق کراتا۔ ایک سال سے اردو سکھانے اور پڑھانے کا اہتمام کر رہا ہوں جس سے لوگ مستفیض ہو رہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جون 2012

آسام :

اردو کو سرکاری درجہ دلانے کی کوشش

کولکاتا: مغربی بنگال کی طرح آسام میں بھی اردو زبان کو ثانوی حیثیت دینے کی پیش رفت ہوگی اور وہاں کے تمام مدارس کے اقلیتی طلبہ ہر طرح کی مراعات سے فیضیاب ہوں گے۔ پریس کلب میں آل انڈیا یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ اور پی پلو ڈیموکریٹک کانفرنس آف انڈیا کی جانب سے مشترکہ طور پر بلائی گئی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آسام جمعیۃ علما اور AIUDF کے صدر ممبر پارلیمنٹ مولانا بدرالدین اجمل نے مذکورہ باتیں کہیں۔ انھوں نے نامہ نگاروں کی موجودگی میں اے آئی یو ڈی ایف اور پی ڈی سی آئی کے شمولیت کا اعلان کرتے ہوئے دستخط کیے اور ایک ہی پلیٹ فارم سے حقوق انسانی کی قیادت کرنے کا بھی کھلے لفظوں میں اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ بنگال کے طرز پر آسام میں بھی اردو زبان کو سرکاری حیثیت دلانے کے سمت پیش رفت ہوگی۔ حکومت سے ہمارا یہ مطالبہ ہے آسام کے مدارس میں 25 فیصد اردو ٹیچروں کو ریزرویشن دیے جائیں اور اردو ٹیچروں کو بحال کیا جائے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 31 مئی 2012

اتر پردیش :

دیوبند میں اردو کے مستقبل پر سیمینار

دیوبند: فیض یو ٹی سی سینٹر کے زیر اہتمام 'اردو کا مستقبل اور ہماری ذمے داری' کے عنوان پر ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت مولانا قمر عثمانی نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کی۔ میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اردو پورے ہندوستانیوں کی زبان ہے یہ صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کی ذمہ داری ہم پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اردو کا گھروں میں استعمال، اسکول، کالج، یونیورسٹیوں میں استعمال سے اس زبان کو تقویت ملے گی۔ نئی نسل کو اردو کی جانب راغب کرنے کے لیے مختلف پروگراموں کا انعقاد کرنا چاہیے۔ پرائمری سطح پر اسکولوں میں اردو اکادمی اور دیگر سرکاری اداروں میں اردو کے خدمت گاروں کو متعین کیے جانے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ مولانا قمر عثمانی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہمیں

3/21/2018 P94.jpg (1619×2242)

اردو کے تئیں اپنی ذمہ داری کا پورا خیال رکھنا چاہیے اور یہ تبھی ممکن ہوگا کہ اردو کو سرکاری امداد سماج کی ہر جانب سے ملے، تبھی اس کی خدمت ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت ہے جب تک اردو کو روزی روٹی سے نہیں جوڑا جائے گا تب تک اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئیں گے۔ سید وجاہت شاہ نے کہا کہ اردو کا روشن مستقبل اردو والوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہے، وہ جتنی اس کی نشر و اشاعت میں حصہ داری کریں گے اتنی ہی یہ زبان عام ہوگی۔ ماسٹر شمیم کرت پوری نے کہا کہ اردو سے متعلق تکنیکی کورسز پاس کرکے اپنا اور اردو کا مستقبل روشن کریں یہ ہماری اور سماج کی اردو زبان کی خاطر پوری ذمہ داری ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو اردو ادب کی خدمات کے لیے سینٹر کی جانب سے ڈاکٹر شمیم دیوبندی، مولانا قمر عثمانی اور شمیم کرت پوری کے دست مبارک سے سپاس نامہ اور ٹرافی دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جون 2012

اردو کے نشو و نما میں اسلامی مدرسوں کا کردار

دیوبند: گزشتہ شب دارالعلوم میں مایۂ ناز ادبی انجمن تہذیب الافکار طلبہ ضلع دربھنگہ مدھوبنی و سمستی پور کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان اجلاس کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت مفتی کلیم الدین ننگی استاذ دارالعلوم دیوبند اور نظامت مولوی منہاج العابدین سمستی پوری نے کی، پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن قاسمی استاذ مرکز المعارف دہلی نے فرمایا کہ مذہب اسلام کو عام کرنے کے لیے اپنی بساط کے مطابق ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ مفتی اعجاز ارشد قاسمی رکن وقف بورڈ دلی نے اپنے خطاب میں طلبہ کی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا کہ آپ حضرات کو اس طرح کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ درالعلوم دیوبند نے طلبہ کو عزم و حوصلہ پیدا کرنے اور اردو ادب کے پروگراموں میں دلچسپی لینے کی تلقین کی۔ اردو ادب اس دور میں مدارس ہی کی وجہ سے محفوظ ہے اردو کی نشو و نما میں مدارس کا نمایاں کردار ہے اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 مئی 2012

حسرت موہانی کی یاد میں جلسہ

گورکھپور: مولانا حسرت موہانی ملک کی جنگ آزادی کے صف اول کے ایسے سورما رہے ہیں جن پر قوم و ملک جتنا بھی ناز کرے کم ہے، حسرت موہانی کی قربانیوں نے پوری قوم کو سربلندی عطا کی ہے اور حب الوطنی کا لافانی درس دیا ہے۔ یہ باتیں اترپردیش سرکار کے سابق جوائنٹ ڈیولپمنٹ کمشنر الحیاج محمد احسن انصاری نے کہی، مولانا حسرت موہانی کے یوم وفات کے موقعے پر ساجد علی میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے انصاری نے کہا کہ قوم وطن کے ایاسے رہنماؤں کو یاد کرنا اور ان کے کارناموں سے سبق لینا نئی نسل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کمیٹی کے سرپرست محمد حامد علی نے کہا کہ حسرت موہانی نے وطن کی آزادی کے لیے جہاں عملی طور پر جدوجہد کی وہیں اپنے نوک قلم سے انگریزی سامراج کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ حسرت موہانی کے اردوئے معلّٰی نے بڑی بہادری اور ہمت کے ساتھ آزادی کی جنگ کا بگل بجایا۔ انگریز ان سے خائف ہوگئے اور نتیجے میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور رسالے پر بھی پابندی لگادی۔ ضمیر احمد پیام نے کہا کہ حسرت موہانی ایک ایسے مسلم رہنما تھے جنھوں نے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا، سکریٹری محبوب سعید حارث نے کہا کہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے حسرت موہانی کی دبی خدمات اردو ادب کا سرمایہ ہیں جس میں جنگ آزادی کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن نے اپنے خطاب میں کہا کہ حسرت موہانی پورے ہندوستان کے رہنما تھے۔ قاضی توسل حسین نے کہا کہ حسرت موہانی کی پوری زندگی مصیبتوں میں گزری لیکن ان کے قدم کبھی لڑکھڑائے نہیں، لیکن پبلک اسکول کی پرنسپل ڈاکٹر شبانہ سرور نے کہا کہ حسرت موہانی نے ہم سب کو یہی سکھایا کہ وطن کے لیے کوئی بھی قربانی دی جائے وہ کم ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مئی 2012

فلم ساز علی رضا کی یاد میں مشاعرہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج میں ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر سہیل احمد اعظمی نے کہا کہ ہندوستانی فلم صنعت ساری دنیا میں اپنا ممتاز مقام رکھتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہندوستانی فلم صنعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اے ایم یو نے ہندوستانی فلمی صنعت کو بیش قیمت گوہر دیے ہیں وہ آج اپنی رہائش گاہ واقع میڈیکل کالونی اے ایم یو پر انڈین فلم انڈسٹری کے ایک سو سال مکمل کی ہونے کی تقریبات کے تحت ممتاز فلم اداکارہ نمی کے شوہر اور ممتاز فلم رائٹر، مکالمہ نویس، ہدایت کار و فلم ساز سید علی رضا کی یاد میں منعقدہ محفل مشاعرہ سے خطاب کررہے تھے۔ مشاعرے کی صدارت ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر سید رضی حسین امروہوی نے کی۔ سید علی رضا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے پروگرام کے مہمانِ خصوصی اے ایم یو کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایچ ایس محسن نے کہا کہ سید علی رضا نے فلمی دنیا میں بھی ادب کے معیار کے نام پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ نظامت کے فرائض انجام اویس جمال شمسی نے دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 مئی 2012

محکمہ صحت میں اردو کا استعمال

لکھنؤ: وزیر صحت احمد حسن کے مطابق صوبہ کے سبھی صحت مراکز پر اور خاص طور پر وہ پرائمری اور کمیونٹی صحت مراکز اور ضلع مرکزی اسپتال جو مسلم آبادی والے علاقوں میں ہیں وہاں عوام کے لیے لازمی معلومات جیسے کہ سرکاری صحت خدمات، ڈاکٹروں کے نام اور فون نمبر، صحت اور بیماریوں سے بچاؤ کی تدابیر اور مرکزی و ریاستی حکومتوں کے صحت منصوبوں کی تشہیر وغیرہ اردو زبان میں کی جائے گی۔ اسپتال کی دیواروں، ہورڈنگس اور نوٹس بورڈس پر اردو میں معلومات لکھی جائیں گی۔ اس کے علاوہ صحت سے متعلق مختلف کتابچے بھی اردو میں تیار کرائے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں ریاست کے سبھی چیف میڈیکل افسران کو ہدایت جاری کی جارہی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 19 مئی 2012

اڑیسہ :

بالاسپور میں 'ایک شام اردو ادب کے نام'

بالاسور: اردو کسی مذہب کی زبان نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی زبان ہے کیونکہ غیر مسلموں نے بھی اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ بات بالاسور ہر کے معروف وکیل اور اردو دوست ابوالکمال ظفر احمد نے بالاسور شہر کی ادبی تنظیم 'ایوان اردو ادب' کے زیر اہتمام بدھ کی شام صدر انجمن محمد عنایت علی خان کے دولت کدہ خواجہ باغ میں منعقدہ 'ایک شام اردو ادب کے نام' پروگرام میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ انھوں نے مغربی بنگال حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بنگال کی وزیر اعلیٰ قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے کم مدت میں اردو کو اس کا حق دیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، یکم جون 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P94.jpg 1/1

3/21/2018 P95.jpg (1601×2248)

بہار :

نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کو انعامات

مدھوبنی: بسفی بلاک کے تحت بانکا میں قائم حق فاؤنڈیشن (ٹرسٹ) کا سترہواں یوم تاسیس منایا گیا۔ اس موقعے سے زیرِ صدارت لوام باشندہ آئی ایس افسر محمد اویس احمد (ڈپٹی مینیجر آف ریلوے، حاجی پورزون) ایک عظیم الشان تقریب کا انعقاد ہوا جہاں اسکول میں زیرِ تعلیم طلبا و طالبات نے کلچرل پروگرام پیش کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالباری صدیقی، عبدالوارث، ٹرسٹ کے صدر اظہار الحق، نائب صدر، ڈاکٹر ارشد کامران، سکریٹری محمد فیروز عالم، خزانچی مرتضیٰ حسن، اور شمس الزماں وغیرہ کے علاوہ درسینکڑوں کی تعداد میں اہلیان بانکا اور قرب جوار کے دانشوران موجود تھے۔ نظامت رضاء اللہ اورونے کمارنے کی۔ تقریباً تین گھنٹے تک چلنے والے اس پروگرام میں امسال بہار بورڈ کے دسویں امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے 23 لڑکے لڑکیوں کو انعامات سے بھی نوازا گیا جس میں محمد جاوید، محمد فیصل، محمد نسیم احمد، محمد کیفی، محمد افضل، رومانہ پروین اور شگفتہ پروین وغیرہم کے نام شامل ہیں۔ اس تقریب کے اختتام سے قبل اپنے صدارتی خطاب میں جناب اویس احمد نے کہا کہ میں اس اسکول کے نظام اور تعلیمی معیار سے بہت خوش ہوں کیونکہ ایک دیہی حلقہ میں قائم اس اسکول کے نظام اور تعلیمی معیار سے بہت خوش ہوں۔ اگر گزشتہ کچھ برسوں کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ حق ٹرسٹ نے کسی حد تک تعلیم کی خوشبو بکھیرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی گراف کو بڑھانے میں جو اہم کردار ٹرسٹ کے صدر اظہار الحق نے ادا کیا ہے وہ قابل مبارک باد ہے اور تمام طلبا و طالبات سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم پر بھی زور دیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' پٹنہ، 11 جون 2012

پنجاب :

پنجاب اردو اکادمی کی تقریب

مالیر کوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی کی اہم تقریب 26 مئی کو مقامی مالیر کوٹلہ کلب میں چیف پارلیمانی سکریٹری حکومت پنجاب اور نائب صدر پنجاب اردو اکادمی محترمہ فرزانہ عالم کی زیرِ صدارت بحسن و خوبی انجام پائی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ساتھ ملاقات کے عنوان کے تحت یہ تقریب منعقد ہوئی۔ پدم شری پروفیسر محمد اظہار عالم چیئرمین پنجاب وقف بورڈ مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نیوز پروڈیوسر ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے خواجہ اکرام الدین کا تعارف پیش کیا۔ اس تقریب میں بھاشا وبھاگ پنجاب کی ڈائرکٹر محترمہ دلبیر

کور نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔

پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال نے اکادمی کی حصولیابیوں کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کے جمود کو کچھ حد تک توڑنے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ مالیر کوٹلہ تخلیقی زمین ہے اور اس سلسلے کو دورِ حاضر میں آگے بڑھانے والوں میں جناب ایم انوار انجم کا نام کافی اہم ہے۔ خواجہ اکرام الدین ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو زبان کی انسانی اور تہذیبی اہمیت کو منفرد اور مؤثر طریقے سے بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا فروغ تہذیب و تمدن کا فروغ ہے۔ انھوں نے اردو کو روزگار کے ساتھ جوڑنے پر بھی زور دیا اور قومی کونسل برائے یفروغ اردو زبان کی مختلف اسکیموں کا بھی تعارف کرایا۔ پنجاب اردو اکادمی کو آگے بڑھانے کے لیے پورا تعاون دیا جائے گا اور قومی کونسل اپنے پیمانے پر جو کچھ بھی ہوسکے گا اس کے لیے کرے گی۔ خواجہ صاحب نے مزید فرمایا کہ ہم اردو کی ترقی کے لیے ہر طرح کا تعاون دینے کے لیے تیار ہیں۔

مہمان خصوصی پدم شری اظہار عالم نے اردو زبان کے ساتھ اپنے والہانہ تعلق کو بیان کیا اور کہا کہ اردو کی حقیقی ترقی چند لوگوں کو روزگار دینے سے نہیں بلکہ اس کے حقیقی فروغ سے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔

صدارتی خطبہ دیتے ہوئے محترمہ فرزانہ عالم نے کہا کہ اردو کا تعلق ہماری تاریخ، تہذیب اور روایت سے ہے۔

تقریب میں خواجہ محمد اکرام الدین کی خدمت میں ڈاکٹر اقبال کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا جن طلبا نے قومی اردو کونسل کے مقامی ادارے کی جانب سے اردو میں ڈپلومہ کورس پاس کیے انھیں سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔

اس موقعے پر مہمان خصوصی جناب اظہار عالم، محترمہ فرزانہ عالم، خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر شکیل اختر، شاعر ناز بھارتی اور افسانہ نگار ایم انوار انجم کو بھی اعزاز دیے گئے۔ اردو رابطہ کمیٹی پنجاب کے چیئرمین جناب ظہور احمد ظہور نے سبھی مہمانوں اور دیگر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر اقبال کو اس کامیاب تقریب کے لیے مبارکباد دی۔ اس تقریب میں خصوصی طور پر تشریف لائے شرومنی ساہتیہ کار جناب سردار پنچھی نے اپنا خوبصورت کلام پیش کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔

روزنامہ 'ہند سماچار' چنڈی گڑھ، 27 مئی 2012

جموں و کشمیر :

بہترین ترجمہ کے لیے جموں و کشمیر کلچر اکادمی کا ایوارڈ

سرینگر: تمدن اور سیاحت کے درمیان رشتوں کو اجاگر کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ عمر عبداللہ نے ریاست کی شناخت، تمدن، فن، زبان اور تاریخ کو تحفظ فراہم کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لیے مشترکہ کوششیں کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ محکمہ سیاحت اور جموں اینڈ کشمیر اکادمی آف آرٹ اینڈ کلچرل اینڈ لینگویجز کو ریاست کی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنا ہوگا۔ انھوں نے ان دو اداروں سے کہا کہ وہ 15 روزہ تمدنی میلے کا انعقاد کریں اور سرینگر و وادی میں دیگر مقامات پر دستیاب اچھی تھیٹرز کو بروئے کار لاکر جموں و کشمیر کے رنگارنگ تمدن اور میراث کو اجاگر کریں۔ یہاں جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر، لینگویجز کی طرف سے منعقدہ ادبی ترجموں کو ایوارڈ دینے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ ہماری ریاست رنگارنگ تمدن، مختلف زبانوں، فنون اور روایات کا قابلِ قدر گہوارہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کی سرزمین نے مشہور ادبی شخصیات کو جنم دیا ہے جنھوں نے جموں، کشمیر اور لداخ خطوں میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کو عروج عطا کیا۔

روزنامہ 'اڑان' جموں، 2 جون 2012

راجستھان :

راجستھان اردو اکادمی کا سالانہ جلسہ اور تقریب انعامات

جے پور: وزیرِ اعلیٰ جناب اشوک گہلوت نے کہا کہ تعلیم سے ہی کوئی خاندان، قوم یا معاشرہ ترقی کرسکتا ہے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P95.jpg 1/1

3/21/2018 P96.jpg (1609×2259)

ایسے میں مسلم معاشرہ کو بھی اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے بچوں کو تعلیم دلانی ہوگی۔ جناب گہلوت رویندر منچ پر راجستھان اردو اکادمی کی جانب سے منعقد سالانہ جلسہ اور تقریبِ اعزازات و انعامات میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اظہارِ خیال کررہے تھے۔ وزیرِ اعلیٰ نے اردو کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان میں ادب اور محبت کی جھلک ملتی ہے اور یہ زبان ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیتی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ نے اردو کی ترقی کے لیے بھی کوششیں کرنے کا یقین دلایا۔ اکادمی کے چیئرمین جناب حبیب الرحمٰن نیازی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں

کہا کہ اردو ہندوستان کی بہترین زبانوں کی شمولیت سے بنی ایک خوبصورت زبان ہے اور یہ محبت اور اتفاق کا پیغام دیتی ہے۔ جناب مولانا محمد فضلِ حق صدر مدرسہ بورڈ راجستھان نے اس موقع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ترقی و ترویج تبھی ممکن ہے جب اسے روزگار سے جوڑا جائے۔ اس کے لیے حکومت راجستھان نے قدم اٹھایا ہے۔ صدر جلسہ محترمہ بینا کاک وزیر سیاحت فن، ثقافت اور آثارِ قدیمہ نے کہا کہ اردو میری مادری زبان ہے اور اب یہ عام رابطہ کی زبان بن چکی ہے اس کے بغیر بات چیت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جے پور سے لوک سبھا کے نمائندے جناب مہیش جوشی نے کہا کہ زبانِ اردو زندگی میں محبت و پیار سکھاتی ہے یہ مسکان ہے تو آنسو بھی ہے آج ہماری زندگی اردو کے بنا ادھوری ہے بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اردو کے بغیر ہندی بھی بول نہیں سکتے۔ ممبر پارلیمنٹ جناب اشک علی ٹاک نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔ اردو ادب تو سب سے زیادہ وسعت لیے ہوئے ہے۔ تقریب میں وزیرِ اعلیٰ نے جناب سید محبوب الرحمٰن نیازی صاحب (جے پور) کو اردو کی مجموعی خدمات کے لئے محمود شیرانی ایوارڈ، ڈاکٹر ثروت النساء خاں (اودے پور) کو اردو کی نثری خدمات کے لیے احترام الدین شاغل ایوارڈ، جناب محمد حنیف شمیم بیکانیری (بیکانیر) کو اردو کی شعری خدمات کے لیے بسمل سعیدی ایوارڈ، ڈاکٹر شاہد الحق چشتی (اجمیر) کو اردو ادب کی تدریسی خدمات کے لیے بیدل بیکانیری ایوارڈ، جناب محمد محمود خان (جے پور) کو اکادمی ایوارڈ برائے اردو صحافت، جناب خورشید احمد ربانی صاحب (جے پور) کو اکادمی ایوارڈ برائے الیکٹرانک میڈیا ایوارڈ سے نوازا۔ اس تقریب میں اکادمی کی جانب سے مطبوعہ کتب جناب خداداد خاں مونس کی سعادت کبریٰ، ڈاکٹر عابدہ آفریدی کی اُردو قطعات نگاری، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی راجستھان میں اُردو تراجم، ڈاکٹر سید صادق علی کی اقبال کے فن کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پر نقد انعام دیا۔ اس موقع پر اکادمی کی جانب سے شائع کی گئیں دو کتابوں خداداد خاں مونس کی 'مشکوٰۃ التاریخ' فرید العصر نظر ایوبی کی 'گلدستہ و بستانِ قمر' اور اکادمی کی جانب سے شائع اقلیت کے لیے حکومت راجستھان کے نئے پروگراموں کی تفصیل اردو فولڈر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ تقریب میں راجستھان وقف بورڈ کے چیئرمین لیاقت علی خاں، راجستھان اقلیتی کمیشن کے چیئرمین، جناب ماہر آزاد موجود تھے اور نظامت خداداد خاں مونس نے کی۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی راجستھان، 19 مئی 2012

کرناٹک:

بنگلور میں اردو صحافت پر سیمینار

بنگلور: کرناٹک اردو اکادمی نے اردو رپورٹرس فورم کرناٹک کے اشتراک سے 'اردو صحافت، نئے محاذ، نئے مراحل' کے عنوان پر دو روزہ سیمینار کا اہتمام کیا۔ شہر بنسن ٹاؤن میں واقع آئی ایس آئی ہال میں سیمینار کا افتتاح کرنے کے بعد محکمہ اقلیتی بہبود کے سکریٹری سید ضمیر پاشاہ آئی اے ایس نے کہا کہ یہ درست ہے کہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے، جس کے پاس میڈیا کی طاقت ہے دراصل وہی حاکم ہے۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ صداقت پسند میڈیا ہمیشہ حاکم اور حکومت کو توازن فراہم کرتا ہے۔ ہمیں اس بات پر یقیناً فخر ہے کہ ہندوستان کی صحافت کی بنیاد اردو زبان نے رکھی اور اس کی اخلاقیات بھی مرتب کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین حافظ کرناٹکی نے کہا کہ اگر یہ کہا جائے کہ آج کا عہد ذرائع ابلاغ اور ترسیل کا عہد ہے تو قطعی غلط نہ ہوگا۔ اس موقعے پر وائس آف امریکہ نئی دہلی کے نمائندے سہیل انجم نے کلیدی خطبہ میں اردو زبان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا تذکرہ کیا اور کہا جنوبی ہند نے اردو کو سینے سے لگایا۔ سیمینار کے دوسرے سیشن میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے سربراہ اسد رضا نے کہا کہ اردو صحافیوں کا مستقبل تابناک ہے۔ انھیں اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ حکومت اور عوام سے رابطے رکھ کر آئین کی پاسداری اور جمہوری حقوق کے ادائیگی پر زور دینا چاہیے۔ سیمینار سے ای ٹی وی اردو کے ہیڈ راجیش رینا، روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی کے ایڈیٹوریل انچارج قاسم سید، مولانا آزاد یونیورسٹی میں شعبہ صحافت کے پروفیسر سروری نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 مئی 2012

مہاراشٹر:

ممبئی میں 'خالد کی خالہ'

ممبئی: اردو ڈراموں کے لیے موسم بڑا خوشگوار ہوگیا ہے۔ پرتھوی تھیٹر میں 'آخری شمع' کے دو ہاؤس فل شوز کے بعد ممبئی یونیورسٹی میں اکادمی آف تھیٹر آرٹس کے سالِ دوم کے طلبہ کے ساتھ اردو کا کلاسک کامیڈی ڈراما 'خالد کی خالہ' تیار کرنے کی ذمے داری سونپی صدر شعبہ اور ہدایت کار شری وامن کیندرے نے مشہور فلم اور اسٹیج ڈائریکٹر رمیش تلوار کو، اور انھوں نے 24 نوجوان فنکاروں کے ساتھ اردو ڈراما 'خالد کی خالہ' کی دو ٹیمیں تیار کیں۔ چونکہ طلبہ کی اکثریت مراٹھی داں ہے یا پھر وہ گجرات، یوپی، بہار، راجستھان اور دیگر غیر اردو علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے اردو تلفظ کی صحیح ادائیگی کے لیے، اردو ڈکشن سدھارنے کے لیے اردو کے ڈراما نگار، ہدایت کار اور ٹیچر اقبال نیازی کا تقرر کیا گیا جنھوں نے دو ماہ تک ان طلبہ کو نہ صرف اردو سکھائی بلکہ ڈراما، خالد کی خالہ' کے مسلم پس منظر، لباس، سیٹ اور اداکاری میں خصوصی تعاون بھی کیا گزشتہ دنوں ممبئی میں اس ڈراما کے اولین چار شو میں غیر اردو داں فنکاروں کو صاف اور شستہ زبان بولتے دیکھ کر ناظرین دم بخود رہ گئے اور صدر شعبہ شری وامن کیندرے اور فلم اور ٹیلی ویژن کی مشہور شخصیات نے بطور خاص اقبال نیازی کی کوششوں کی ستائش کی اور انھیں خصوصی اعزاز سے نوازا۔ 'خالد کی خالہ' کے ڈائیلاگ ڈائرکٹر اور ڈکشن ٹیچر معروف ڈراما نگار ہدایت کار اقبال نیازی نے آخری دن کے شو میں اسٹیج سے تمام غیر اردو داں فنکاروں کی ستائش کی اور اردو سیکھنے کے ان کے جذبہ کو سراہا نیز وامن کیندرے اور رمیش تلوار کی اردو ڈراما کرنے کی کوشش کی تعریف کی۔ تالیوں کی گونج میں انھوں نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ جلد ہی یہ ڈراما اپٹا کے بینر سے مختلف شہروں میں بھی پیش کیا جائے گا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 19 مئی 2012

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P96.jpg 1/1

3/21/2018
P97.jpg (1615×2259)

اعزاز و اکرام:

پروفیسر گوپی چند نارنگ

بھوپال: گزشتہ دنوں مدھیہ پردیش حکومت نے اردو کے عالمی شہرت یافتہ دانشور، نقاد، ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس گوپی چند نارنگ کو رویندرالیہ بھوپال میں ایک پُر وقار تقریب میں ریاست

کا سب سے اعلیٰ ادبی ایوارڈ 'اقبال سمان 09-2008' سے سرفراز کیا۔ ریاستی وزیر برائے ثقافت شری لکشمی کانت شرما نے انھیں دو لاکھ روپے کا چیک، سند اور مومینٹو پیش کیا۔ یاد رہے کہ صدر پاکستان کے ہاتھوں پروفیسر نارنگ کو اقبال صدی تمغۂ امتیاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ 'اقبال سمان' کا آغاز 1986 میں ہوا تھا۔ یہ ایوارڈ ہر سال ادبی خدمات کے اعتراف میں مدھیہ پردیش حکومت کی جانب سے کسی ایک ممتاز ادبی شخصیت کو دیا جاتا ہے۔ اس سے قبل علی سردار جعفری، اخترالایمان، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، آنند نرائن ملا، جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی، حیات اللہ انصاری، اُپندر ناتھ اشک، شہریار، قاضی عبدالستار وغیرہ جیسی مقتدر ادبی شخصیات کو اس ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

پریس ریلیز، بھوپال

نسیم انصاری

بھوپال: ادبی انجمن کہکشاں ادب کے ذریعے گزشتہ شب سرائے سکندری میں ماہانہ محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر بھوپال کے مشہور و معروف شاعر و ادیب نسیم انصاری کو ایم ایل اے عارف عقیل نے اعزاز سے نوازا۔ توصیف نامہ ضیا فاروقی نے پڑھا جس میں موصوف کی ادبی و سماجی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس ادبی محفل کی صدارت ممتاز ادیبہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کہکشاں ادب کے ذریعے یہاں اتنی اچھی شعری محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یقینی ایک اچھی کوشش ہے۔ استقبال کے جواب میں نسیم انصاری نے کہا کہ ادب کی کہکشاں میں بہت سے ستارے چمک رہے ہیں اور ایک چاند کی روشنی بھوپال اور آس پاس چمک رہی ہے۔ اس روشن چاند کو ہم عارف عقیل کے نام سے جانتے ہیں۔ اس موقعے پر نسیم انصاری نے اپنی منتخبہ نظمیں و غزلیں بھی سنائیں۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 7 مئی 2012

امجد اسلام امجد

نئی دھلی: شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لاہور کے شاعر اور ڈراما نگار امجد اسلام امجد کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت شعبے کے صدر پروفیسر خالد محمود نے کی۔ امجد اسلام امجد کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ امجد اسلام امجد کا شمار اس عہد کے اہم اور ممتاز شاعروں اور ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے رات سمندر میں، برزخ، ساحلوں کی ہوا، ساتواں در، فشار، بارش کی آواز، محبت ایسا دریا ہے، میرے بھی ہیں کچھ خواب کے علاوہ متعدد شعری مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی امجد اسلام امجد کی خاص شناخت ہے۔ ان کے ڈراموں میں وارث اور سمندر کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ بنیادی طور پر امجد اسلام امجد اردو کے استاد ہیں۔ امجد صاحب پاکستان میں مختلف اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ ان کا شعری ذوق بے حد بالیدہ ہے۔ گزشتہ دنوں انھیں آگرے میں فراق ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ہم سب انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر امجد اسلام امجد نے اپنی غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ اس نشست میں شعبے کے بیشتر اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔

پریس ریلیز، نئی دہلی 15 مئی 2012

جشن مناظر عاشق ہرگانوی

علی گڑھ: آذر اکادمی ادبی دنیا پبلی کیشنز، بزم شعور ادب، جے پور اور اسلم حنیف فاؤنڈیشن کے مشترکہ تعاون سے پچھلے دنوں ممتاز نقاد اور شاعر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا جشن منایا گیا جس کے تحت سیمینار، اعزازات اور کل ہند مشاعرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں منعقد ہوا۔ سیمینار کی صدارت پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن اور نظامت شکیل جے پوری و مشرف محضر نے کی۔ مناظر عاشق ہرگانوی کو آذر اکادمی کی جانب سے سپاس نامہ، منارۂ علم و ادب کا خطاب، ردائے ادب اور پگڑی پہنا کر خیر مقدم کیا گیا۔ اسلم حنیف فاؤنڈیشن کی جانب سے انھیں شہریارِ قلم کا خطاب، ادبی دنیا پبلی کیشنز کی جانب سے سرسید ایوارڈ پیش کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی علی گڑھ ظفر عالم ممبر اسمبلی، شاہد جمیل پروفیسر خالد حسین خاں تھے۔ آذر اکادمی کی جانب سے شاہد جمیل سہسرام کو امینِ ادب، ڈاکٹر ایم اے حق رانچی کو سفیرِ اردو، مجتبیٰ فہیم حیدر کو آفتاب سخن، ظہیر انور ممبئی کو شہریارِ سخن، حفیظ انجم کریم نگری کو شناورِ علم و ادب، ساغر وارثی شاہ جہانپور کو امینِ علم و ادب، عثمان انجم حیدر آباد کو آفتاب ادب، جاوید عرشی اندور کو افتخارِ قلم، شان بھارتی دھنباد کو عین الادب، بلیغ ہاپوڑی کو امینِ سخن، رؤف خیر حیدر آباد کو امینِ قلم، ایم زیڈ خان بہار کو نیر اردو، طارق قمر لکھنوی کو شہزادۂ قلم اور وسیم احمد فدا کو شہزادۂ اردو کے خطابات پیش کیے گئے۔ مرزا شعیب راشدہ باقی حیا، سعید احسن اڑیسہ، عثمان انجم وشاکھا پٹنم، ڈاکٹر فراز حامدی جے پور، ڈاکٹر اسلم حنیف، ڈاکٹر محمد طاہر رزاقی، شارق عدیل، کامل جنیٹوی، شہزاد چندوسی، منسوب ادب پپھاسوی، بصیر الحسن وفا نقوی، ڈاکٹر رضی امروہوی، ریحانہ شاہین، صبیحہ سنبل، محمد الیاس، وقار اشہر وغیرہ کو ردائے ادب اور یادگاری نشانات پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے کہا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں اور انگلینڈ تک میرے جشن منائے جا چکے ہیں، لیکن آج کے جیسا جشن میں نے کہیں نہیں دیکھا اور یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ انھوں نے کہا کہ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ 151 کتابوں کا اجرا آج تک ایک ڈائس پر کہیں نہیں ہوا، جو اپنے آپ میں ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔ اس کے بعد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت میرٹھ کے بزرگ شاعر بی ایس جین جوہر نے فرمائی۔

پریس ریلیز، علی گڑھ، جون 2012

ڈاکٹر عزیز برنی

آگرہ: ادبی انجمن 'بزم میکش' کے زیر اہتمام 8 اپریل کو ایک پروقار تقریب میں ڈاکٹر عزیز برنی کو میکش ایوارڈ سال 2011 سے سرفراز کیا گیا۔ ایوارڈ، میں چاندی کا میڈل، مومنٹو، شال، سپاس نامہ شامل تھے، مہمان خصوصی سید محمد علی کاظمی سابق ایڈووکیٹ جنرل و چیئرمین اقلیتی کمیشن اتر پردیش تھے۔ سید محمد علی کاظمی کو شال و اعزازی ٹرافی دی گئی۔ جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے بزم کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ علامہ میکش اکبر آبادی فن اور شخصیت پر سیمینار منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر محمد علی جوہر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنا مقالہ 'علامہ میکش اکبر آبادی اور آگرہ والے نقد اقبال کی روشنی میں' پیش کیا۔ ڈاکٹر عزیز برنی کی غیر موجودگی میں جناب فیروز بخت احمد

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P97.jpg 1/1

3/21/2018 P98.jpg (1597×2247)

دہلی اور پروفیسر اقبال علی علی گڑھ نے ایوارڈ حاصل کیے۔ فیروز بخت احمد نے عزیز برنی کو بے باک اور نڈر صحافی قرار دیا اور کہا کہ میں ان کا ایوارڈ لیتے ہوئے فخر محسوس کررہا ہوں۔ پروفیسر اقبال علی نے کہا کہ اردو تعلیم کے لیے معقول انتظام ہو، اس کے لیے ہمیں مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ سید محمد علی کاظمی نے کہا کہ انگریزی ہمیں ایڈووکیٹ بناسکتی ہے اور اردو ہمیں ایڈوکیٹ جنرل۔ اس کے بعد اردو مضمون کے ساتھ اول، دوئم اور سوئم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا وطالبات کو بزم میکش کی طرف سے سند اور میڈل دیے گئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی کتاب شجر سایہ دار کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کا تعارف بزم کے نائب صدر ششی ٹنڈن نے پیش کیا۔ اس کے بعد سید علی کاظمی کے تہنیتی قطعات شاہد ندیم نے پڑھ کر سنائے۔ اسرار اکبرآبادی کا لکھا ہوا سپاس نامہ کلام احمد نے پڑھا۔ پروگرام کی نظامت جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے کی جب کہ صدارت نائب صدر سید معراج الدین نے کیا۔

پریس ریلیز، آگرہ، جون 2012

زہرہ سہگل

نئی دہلی: عمر کی سنچری مکمل کرنے والی ممتاز اداکارہ زہرہ سہگل اور ممتاز فلم ساز رمیش سپی کو اس سال سنگاپور میں 13 ویں انڈیا انٹرنیشنل فلم اکادمی ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ یہ اطلاع یہاں حکام نے دی۔ آئی آئی ایف اے کے ترجمان نے بتایا کہ رمیش سپی کو جوافسانوی شہرت کے حامل فلم 'شعلے' کے ہدایت کار اور فلم ساز تھے، ہندوستانی سنیما کی گراں قدر خدمات کے لیے یہ ایوارڈ ملے گا جب کہ زہرہ سہگل کو ہندستانی سنیما کے 100 سال کے دوران ان کی شاندار خدمات کے لیے یہ انعام دیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 مئی 2012

رسم اجرا:

'شہر شہر آوارگی'

نئی دہلی: غالب اکیڈمی کے زیراہتمام 'شہر شہر آوارگی' مرتبہ عبدالسمیع کی رسم اجرا اور گفتگو کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت نامور نقاد اور دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے کی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے انجام دیے۔ غالب اکادمی کے سکریٹری عقیل احمد نے مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کیا۔ واضح رہے کہ آزادی کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب اردو میں ستیارتھی کی کہانیاں دو جلدوں میں کتابی شکل میں سامنے آئی ہیں اس اعتبار سے عبدالسمیع کا یہ کام تاریخی نوعیت کا ہے، اس موقعے پر ستیارتھی کی دو بیٹیاں موجود تھیں۔ 'شہر شہر آوارگی' کی دو جلدوں میں 57 کہانیاں ہیں جنھیں مختلف رسالوں سے تلاش کیا گیا ہے جو ان کے دو اولین مجموعے 'نئے دیوتا' اور 'بانسری بجتی رہی' میں شامل نہیں ہیں۔ پروفیسر صادق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر معین الدین جینابڑے، ڈاکٹر مولا بخش نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دیوندر ستیارتھی کی بیٹی پارل نے ستیارتھی کی شخصیت پہ منظوم خاکہ پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 مئی 2012

'سنگریزے'

مالیر کوٹلہ: افسانہ نگار جناب ایم انوار انجم کے افسانچوں کا مجموعہ 'سنگریزے' کی رسم اجرا جناب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو

زبان نئی دہلی کے دست مبارک سے ہوئی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر محمد شکیل اختر، پدم شری اظہار عالم، چیف پارلیمانی سکریٹری حکومت پنجاب محترمہ فرزانہ عالم، ڈائرکٹر بھاشا وبھاگ پنجاب محترمہ دلبیر کور، پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر محمد اقبال بھی موجود تھے۔ جناب انوار انجم نے 1983 میں ہند سماچار' کے ذریعے افسانہ نویسی کا آغاز کیا۔ سنگریزے انجم صاحب کی یہ پہلی کاوش ہے۔ انھیں شاعری کا بھی شوق ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو کے اکثر ادبی پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔

روزنامہ 'ہند سماچار'، چنڈی گڑھ، 27 مئی 2012

'تاریخ ادب ضلع بجنور'

نئی دہلی: حمد و نعت اکادمی کے زیراہتمام بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں واقع غالب اکادمی میں منعقد محفل مقابلہ نعت خوانی اور جلسہ تقسیم ایوار کے موقعے پر اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اخترالواسع کے ذریعے معروف شاعر و ادیب شکیل احمد خان (شکیل بجنوری) کی، بجنور کی شعری و ادبی سرگرمیوں اور شعری و ادبی شخصیات و ان کی ادبی خدمات پر مبنی تصنیف کردہ کتاب 'تاریخ ادب ضلع بجنور' کی جلد دوئم کا اجرا کیا گیا۔ 522 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 1701 سے تا حال، تحصیل نجیب آباد کے 162 شعرا و ادبا اور قصبہ دھام پور ضلع بجنور کے تقریباً 36 شعرا و ادبا کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی شعری و ادبی خدمات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بجنور کی مختصراً ادبی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ اس کتاب میں ضلع بجنور کی صحافتی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہرا' دہلی، 21 مئی 2012

موزائک آف فیتھ

نئی دہلی: ہندوستانی کونسل برائے ثقافتی تعلقات کے صدر ڈاکٹر کرن سنگھ نے راجدھانی میں گزشتہ روز جے پور کے ڈاکٹر دھرمیندر بھنڈاری کی کتاب 'موزائک آف فیتھ پلیسز آف ورشپ ان انڈیا' کی رسم اجرا ادا کی۔ ہندوستان کی عبادت گاہوں سے متعلق یہ کتاب روحانی ورثے سے متعلق ہے، جس میں مختلف مذاہب اور عقائد کے نظام کی یکجائی پیش کی گئی ہے۔ ہر عقیدہ کے لوگوں کی ان گنت عبادت گاہیں ہیں، قدیم ترین بھی اور بالکل نئی بھی جو طرزِ تعمیر، روایت اور رسم ورواج کے ذریعے اس مذہب کے اصول اور ضابطوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ کتاب کے بارے میں ڈاکٹر بھنڈاری نے کہا کہ انھوں نے اس کتاب میں ہندو مذہب، اسلام، عیسائیت، بودھ ازم، سکھ مت، جین دھرم، یہودیت اور زرتشتی سمیت ہندوستان میں تمام مذاہب کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے تاریخی حقائق بھی ہیں۔ ہر عبادت گاہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 7 جون 2012

اردو ہے جس کا نام

علی گڑھ: مزمل کمپلیکس میں واقع میڈیا سینٹر پر علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ کے زیراہتمام علامہ شبلی نعمانی کی 155 ویں یوم پیدائش تقریب میں ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی کی کتاب 'اردو ہے جس کا نام ...' کا اجرا کرتے ہوئے علیشا پبلی کیشنز کے فاؤنڈر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی نے سرسید تحریک کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی کی یہ کتاب مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے اہم ثابت ہوگی۔ علیشا پبلی کیشنز کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی نے اردو نثر کو ایک نیا اور اہم موڑ دینے میں اہم رول ادا کیا اور وہ خشک موضوعات کو بھی اپنے زور قلم سے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P98.jpg 1/1

3/21/2018 P99.jpg (1615×2247)

پرلطف بنا دیتے تھے۔ اترپردیش سکریٹریٹ کے انفارمیشن آفیسر قائد حسین کوثر نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کے یوم پیدائش پر ڈاکٹر آفتاب کی کتاب کا اجرا شبلی کو سچا خراج عقیدت ہے۔ اویس جمال شمسی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے کہا کہ اپنی اس تخلیق کی اشاعت کے لیے وہ علیشا پبلی کیشنز کا شکرگزار ہوں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 جون 2012

تحریک آزادی میں مسلم کردار

نئی دہلی: نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری نے کہا ہے کہ تحریک آزادی میں مسلم کردار کو تقسیم ہند کے بہانے کم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ تقسیم کے ہرگز ذمے دار نہیں تھے۔ کل یہاں اپنی رہائش گاہ پر معروف تھنگ ٹینک انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے زیر اہتمام متعدد مورخین و دانشوران کے ذریعے تیار کرائی

ہوئی کتاب 'تحریک آزادی میں مسلم کردار (1857-1947)'، کی چھ جلدوں میں سے تین جلدوں کی رسم اجرا کے موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ مسلمانوں کی اکثریت تقسیم ہند کے آئیڈیا کے حق میں نہیں تھی۔ حامد انصاری نے اکھلیش متھل کی اس بات سے اتفاق کیا کہ تقسیم ہند کے ذمے دار مسلمان ہندو نہیں بلکہ برطانوی سامراج تھا۔ اس موقعے پر اکھلیش متھل نے کہا کہ آج ملک میں جو فرقہ واریت پائی جاتی ہے اس کا بیج انگریزوں نے بویا تھا۔ تحریک خلافت کے تعلق سے کہا کہ اسے غلط انداز میں تاریخ میں پیش کیا گیا ہے جب کہ اس تحریک نے علی برادران اور گاندھی جی کی قیادت میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بہترین پیغام دیا تھا۔ کتاب کے جنرل ایڈیٹر پروفیسر رفاقت علی خاں نے اپنے گہرے دوست حامد انصاری سے مخاطب ہوکر خاص طور پر کہا کہ تحریک آزادی میں جو مسلمان شامل تھے وہ محض کانگریس کے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق مختلف مکاتب فکر اور پارٹیوں سے بھی تھا۔ آئی او ایس سکریٹری جنرل پروفیسر ظہو محمد خاں اور ڈاکٹر افضل وانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، یکم جون 2012

شمع فروزاں

مرادآباد: مرادآباد کا قدیمی اقلیتی تعلیمی ادارہ ہیوٹ مسلم انٹر کالج مرادآباد اپنی صد سالہ تقریبات منا رہا ہے، جس کی بنیاد 1905 میں ابتدائی عصری تعلیم کے طور پر رکھی گئی تھی۔ مولوی ابرار حسین کے قائم کردہ اس ادارے عمر 107 سال ہوگئی ہے۔ کالج کی سالانہ میگزین شمع فروزاں کی رسم اجرا عمل میں آئی، جس میں ضلع کلکٹر ڈاکٹر ہری اوم، ڈی آئی او ایس ایس پی دویدی مہمان خصوصی کے طور پر شامل ہوئے۔ ضلع کلکٹر کالج کی منتظمہ کمیٹی کے صدر فاروق احمد نظامی، منیجر عثمان احمد، ڈپٹی منیجر محفوظ علی و پرنسپل چاند خاں نے اپنے ہاتھوں سے اس صد سالہ میگزین کا اجرا کیا۔ ضلع کلکٹر نے کہا کہ اس قدیمی تعلیمی ادارے کی اس تقریب میں شامل ہوکر مجھے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے۔ تعلیم انسان کی ایسی دولت ہے جسے کوئی لوٹ نہیں سکتا۔ ضلع کلکٹر نے اس سال امتحان میں اول آئے طلبہ کو اسناد بھی تقسیم کیں۔ اس موقعے پر میسٹر ایس ٹی حسن نے کہا کہ مرحوم اسرار حسین کے ذریعے روشن اس تعلیمی چراغ کی روشنی آج دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے اس صد سالہ میگزین کے شائع کرنے کو اہم کارنامہ قرار دیا۔ ڈی آئی او ایس نے بھی ہیوٹ مسلم انٹر کالج کی اس سالانہ تقریب کے موقع پر کہا کہ اس کالج کا معیاری تعلیم کا اندازہ اس کے سو فیصد نتائج سے لگایا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2012

'عباسی دنیا'

نئی دہلی: آئی ٹی او واقع راجندر بھون میں سہ ماہی میگزین 'عباسی دنیا' کا اجرا وزیر مالیات وصحت ڈاکٹر اے کے والیہ کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر والیہ نے کہا کہ پڑھو اور پڑھاؤ کی حکمت عملی اختیار کرنی ضروری ہے۔ آج مل جل کر کام کرنے کی بہت ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ 'میگزین عباسی دنیا' سے سماج کو بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ اس میگزین کا اجرا خوش آئند قدم ہے۔ اس سے بہتر اور تعلیم یافتہ سماج کی تعمیر میں مدد ملے گی۔ عباسی دنیا کے ایڈیٹر عزیز محمد خاں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میگزین کو کسی بھی طرح کی سیاست سے پاک صاف رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موقعے پر لکشمی نگر کے کونسلر بی بی تیاگی، مدھیہ پردیش کے سابق وزیر ابراہیم قریشی، اترپردیش کانگریس کمیٹی کے سابق جنرل سکریٹری اور میگزین کے پیٹرن شبیر عباسی، اکھل بھارتیہ عباسی ویلفیئر ایسوسی ایشن کے چیئرمین چاند وغیرہ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 مئی 2012

مہک

دیوبند: معروف شاعر شمیم کرت پوری کے مجموعہ کلام 'مہک' کی رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ دیوبند کے ادبی کام کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مدارس اسلامیہ میں صحافت کا کورس شروع کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ دیوبند کی مٹی ادب کے معاملے میں بڑی زرخیز ہے، اسی سلسلے کو

آگے بڑھاتے ہوئے شمیم کرت پوری نے دیوبند کی آب و ہوا کا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعے کے ذریعے ادب کے باب پر جو دستک دی ہے وہ یقینی طور پر دیرپا ثابت ہوگی۔ مہمان خصوصی مہندر پال کا مبوج نے کہا کہ دیوبند کی سرزمین علم کا خزانہ ہے اور اس خزانے سے پوری دنیا کو سیراب کیا جاسکتا ہے۔ پروگرام کی صدارت کررہے مولانا قمر عثمانی نے کہا کہ شاعری ایک الہامی چیز ہے، شاعر کتابوں سے نہیں بنتا۔ البتہ کتابوں کا مطالعہ شاعری کو وسعت بخشتا ہے۔ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، کلیم حامد تحسین، شمیم مرتضیٰ فاروقی وغیرہ نے بھی شمیم کرت پوری کی شاعری پر تبادلۂ خیال کیا۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مئی 2012

'قلندر بولتا ہے'

نئی دہلی: معروف صحافی و شاعر سلیم صدیقی کے اولین شعری مجموعہ 'قلندر بولتا ہے' کی رسم اجرا مہمان خصوصی محترمہ کرن والیہ وزیر اطفال وخواتین بہبود حکومت دہلی کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس تقریب کا اہتمام تاج ہائٹس ٹرسٹ گھر اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے دہلی کی معروف ادبی و ثقافتی تنظیم خدمت نے کیا تھا۔ تقریب میں شعیب اقبال، م افضل، سراج الدین قریشی، روزنامہ سہارا کی اردو اشاعتوں کے سربراہ اسد رضا، وقار مانوی، اے رحمن ایڈوکیٹ، قیس رامپوری، معروف صحافی ماجد رمن، مولانا انصار رضا وغیرہ موجود تھے۔ تقریب کے

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P99.jpg 1/1

3/21/2018 P100.jpg (1654×2254)

صدر سراج الدین قریشی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ یہاں ان کے بارے میں جتنا کہا گیا وہ بہت کم ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بے پناہ اوصاف کے مالک ہیں ان کی شاعری انسان کے دلوں کو چھولیتی ہے۔ مہمان خصوصی محترمہ کرن والیہ نے کہا کہ سلیم صدیقی کی شاعری میں ان کی قلندرانہ شخصیت کی عکاسی ہے وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ قیس رام پوری، مولانا انصار رضا، اسد رضا اور شعیب اقبال نے بھی سلیم صدیقی کی شاعری اور فن پر اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مئی 2102

وفیات:

مہدی حسن

کراچی: دنیائے غزل کے شہرۂ آفاق گلوکار مہدی حسن 14 جون 2012 یہاں طویل علالت کے بعد دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ شہنشاہِ غزل کے نام سے دنیا بھر میں مشہور 84 سالہ مہدی حسن کافی عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ مہدی حسن ہندوستانی صوبہ راجستھان کے ایک گاؤں لونا میں 18 جولائی 1927 میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی گائیکی ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں غزل کے چاہنے والوں میں یکساں طور پر مقبول تھی۔ ہندوستان کی مشہور گلوکارہ لتا منگیشکر نے انھیں 'خدا کی آواز' قرار دیا تھا۔ شہنشاہِ غزل مہدی حسن کی رحلت پر صدر جمہوریہ پرتبھا پاٹل، نائب صدر حامد انصاری اور وزیر اعظم منموہن سنگھ نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ وزیر اعظم نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مہدی حسن نے برصغیر کی صوفی حسیت کو اپنے نغمات سے زندگی بخشی تھی۔ وزیر اعظم نے مہدی حسن کے غمزدہ خاندان سے تعزیت بھی کی۔ دوسری جانب راجستھان کے وزیر اعلیٰ اشوک گہلوت، بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار، فلمی نغمہ نگار جاوید اختر، گلوکار طلعت عزیز، عدنان سمیع، انوپم کھیر، مدھر بھانڈاکر، شریا گھوشال سے لے کر لتا منگیشکر تک نے مہدی حسن کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ادھر مہدی حسن کی موت پر فن موسیقی کی دنیا میں غم کا ماحول ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 جون 2012

خراج عقیدت:

مہدی حسن لفظوں میں معنی کی طرح سما جاتے تھے: وسیم بریلوی

بریلی: شہنشاہِ غزل مہدی حسن کی وفات پر قومی اردو اردو کونسل کے نائب صدر اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر وسیم بریلوی کا کہنا ہے کہ ان کی کمی ہمہ وقت محسوس کی جاتی رہے گی۔

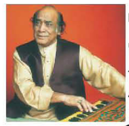

کہتے ہیں کہ بیگم اختر نے غزل کو جس مقام پر لا کھڑا کیا اس کے بعد مہدی حسن نے کلاسیکل بیس کے ساتھ جو غزل کو عزت بخشی وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ وسیم بریلوی نے کہا کہ جب لتا جی نے ان کی غزلوں سے متاثر ہوکر کہا کہ میری صبح مہدی حسن کے ساتھ اور میری شام مہدی حسن کے ساتھ ہے تو اس سے زیادہ ان کی مقبولیت کا عالم اور کیا ہوسکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مہدی حسن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ لفظوں میں معنی کی طرح سما جاتے تھے۔ غزلوں کے شہنشاہ مہدی حسن سے ملاقات کے سوال پر مزید گفتگو کرتے ہوئے وسیم بریلوی نے کہا کہ مہدی حسن سے ان کی ملاقات امریکہ کے لاس اینجلس شہر میں ہوئی تھی جس کے بعد آج تک نہیں ہوسکی۔ مہدی حسن کی گائی ہوئی غزلوں میں فیض احمد فیض اور میر کی غزلوں کا زیادہ اثر دیکھا جاتا ہے جنھیں خوبصورتی کے ساتھ گا کر انھوں نے اسے ہر خاص و عام میں مقبول کردیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 15 جون 2012

مہدی حسن نے موسیقی کو نئی اونچائیوں سے روشناس کرایا تھا: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

نئی دہلی: شہنشاہِ غزل مہدی حسن کے انتقال پر پاکستان کے ساتھ ساتھ پوری دنیا اور خاص طور سے ہندوستان میں رنج و غم کا ماحول ہے۔ اُن کی وفات سے محفل موسیقی پر اداسی طاری ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ میر، غالب، حسرت، فیض، جوش، احمد فراز اور فرحت شہزاد جیسے شعرا کی غزلوں کو آواز دے کر انھیں دنیا کے مختلف حصوں تک پہنچایا ہے۔ ان کے چلے جانے سے بزم موسیقی اپنے ایک اہم اور مضبوط ستون سے محروم ہوگئی ہے۔ مہدی حسن نے موسیقی کو نئی اونچائیوں سے روشناس کرایا تھا۔ وہ اپنے مداحوں کے دلوں اور موسیقی کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

عتیق احمد عتیق

جلگاؤں: اردو کے معروف کہنہ مشق شاعر و ادیب اور سہ ماہی رسالے 'توازن' مالیگاؤں کے مدیر عتیق احمد عتیق کے انتقال پر بزم اردو ادب (ایم اے آر اینگلو اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج، جلگاؤں) کی جانب سے تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ کالج کے پرنسپل صغیر احمد شیخ کی صدارت میں منعقدہ نشست میں اساتذہ کرام نے اردو زبان و ادب کے اِس مخلص سپاہی کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ شکیل موسیٰ نے مرحوم کی شاعری کو قدیم و جدید قدروں کا حسین امتزاج قرار دیا۔ مقیم احمد نے مرحوم کو خلوص وانکسار کا پیکر قرار دیا۔ پرنسپل صغیر احمد شیخ نے کہا کہ مرحوم 1980 سے توازن کے سلسلے میں اکثر جلگاؤں آتے تھے۔ توازن کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس موقعے پر اسمٰعیل یوسف کالج ممبئی میں سابق صدر شعبہ عربی عبدالعلیم نخشارے کی رحلت پر بھی دعائیہ کلمات ادا کرتے ہوئے اہل خاندان سے تعزیت کی گئی۔ نظامت ذاکر حسین نے کی۔ اقبال عثمان کے شکریہ پر تعزیتی نشست اختتام پذیر ہوئی۔

بذریعہ ڈاک، جلگاؤں، مئی 2012

داغ دہلوی

نئی دہلی: دہلی دبستان شاعری کے سب سے اہم اور نمائندہ فنکار داغ دہلوی کے یوم پیدائش پر داغ اکادمی دہلی نے ایک خصوصی جلسے کا انعقاد کیا جس میں داغ کی شاعری اور ان کے معاصر شعری اور فکری رویے پر تفصیل سے اظہار کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس پروفیسر عبدالحق نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ داغ کا نام اس لیے بھی زندہ رہے گا کہ وہ علامہ اقبال کے استاد تھے اور شعری روایت میں اقبال نے ان سے لاہور میں رہ کر استفادہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری شعری تاریخ کی بڑی مہتم بالشان علامت ہے کہ داغ دہلوی نے حیدرآباد اور دہلی کے درمیان ایک فنی امتزاج کی صورت پیدا کی۔ دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر توقیر احمد خان نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ داغ کی زبان اور بیان کا اسلوب ناقابل نقل ہے اور وہ آج تک ہمارے زبان و بیان پر چھایا ہوا ہے۔ داغ اکادمی دہلی کے جنرل سکریٹری صحافی معصوم مرادآبادی نے اس موقعے پر کہا کہ داغ اپنے عہد کے ترجمان تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف جہاں وہ شاہی دربار سے وابستہ رہے وہیں دوسری طرف عوامی طرز زندگی سے بھی اتنے ہی زیادہ منسلک رہے اور یہ اعزاز کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں ہوسکا۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 26 مئی 2012

■

http://urducouncil.nic.in/Urdu-Duniya/Urdu-Duniya-July-2012/P100.jpg 1/1